میرا کالم

مجتبیٰ حسین

حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد

میرا کالم

مجتبیٰ حسین

حسامی بک ڈپو ۔ مچھلی کمان ۔ حیدرآباد

اشاعت	=	جون ۱۹۹۹ء
تعداد اشاعت	=	پانچ سو
سرورق	=	عزیز آرٹسٹ
کمپوزنگ	=	اسپیڈ پرنٹس
طباعت وکتابت	=	اسپیڈ پرنٹس ، سعید آباد ، حیدرآباد فون : 4063538
قیمت	=	۱۰۰ روپیے
ملنے کا پتہ	=	حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

عزیز از جان

عزیز آرٹسٹ

کے نام

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

فہرست

تماشائے اہلِ کرم

تماشائے اہل ستم

تماشائے اہل قلم

پیش لفظ

مجتبیٰ حسین عصری طنز و مزاح کا ایک معتبر نام ہے ۔ مجتبیٰ حسین کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۲ء میں ہوا ۔ کالم نگاری اس سفر کی پہلی منزل تھی ۔ ایک ایسے دور میں جب کہ کالم نگاری کی روایت خاص طور سے ہندوستان میں کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی تھی ، ذہین و فطین نوجوان مجتبیٰ حسین نے اپنی جولانئ طبع ، ندرت فکر ، برجستگی اور لطیفہ سنجی کے ذریعہ ادبی و صحافتی حلقوں کو چونکا دیا ۔ مجتبیٰ حسین کی تربیت ایک خاص تہذیبی و ادبی ماحول میں ہوئی تھی ۔ ان کی طالب علمی کا دور ہوسٹلوں میں گزرا ۔ اس زمانہ کے ہوسٹل شائستہ شرارتوں ، مہذب فقرہ بازی اور مودب ہوٹنگ کے مرکز تھے ۔ ہوسٹل کی زندگی ، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں سے دلچسپی ، دوست داری اور محفل آرائی نے مجتبیٰ حسین کی فطری بذلہ سنجی کو جلا بخشی ۔ ان کا علمی و ادبی گھرانہ ترقی پسند خیالات کا حامل تھا ۔ اپنے بھائیوں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس سے مجتبیٰ حسین نے محنت و ریاضت اور فکری توازن کے سبق حاصل کیے اور فن کے دائرہ میں رہ کر شائستہ طریقہ پر احتجاج کرنا سیکھا ۔ چنانچہ ابتدائی دور میں روزنامہ " سیاست " کے . کالم " شیشہ و تیشہ " کے لیے لکھی گئیں ظریفانہ تحریریں کینہ کپٹ ، طعن و تشنیع اور زہرناکی سے عاری ، لطف و انبساط کا خزانہ تھیں ۔ ان کالموں میں آمد ہی آمد تھی ۔ مجتبیٰ حسین کے اسلوب کی شیرینی تلخیٔ دوراں کے شکار اردو کے قاری کو نیا مزہ دے گئی ۔ مجتبیٰ کے تخلیقی سوتوں سے ابلنے والے پر جوش دریا کے بہاؤ نے تنگنائے کالم کے حدود کو توڑ کر ادب کی نئی وسعتوں اور میدانوں میں پناہ ڈھونڈ لی ۔ ان کے اصل نام کے ساتھ پہلا مزاحیہ مضمون " ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں " ۱۹۶۴ء میں شایع ہوا ۔ غالب کی طرفداری کے مدعی مجتبیٰ حسین نے حیوان ظریف سے ایسا

ناطہ جوڑا کہ غالب کی شوخی پر لکھے گئے حالی کے شعر اور فقرے مجتبیٰ حسین کے حال کی تفسیر بن گئے ۔
ادبی محفلوں میں مجتبیٰ حسین کے لطیفوں اور ٹھٹول کے چرچے تھے ۔ اولین مضمون کی اشاعت کے ساتھ ہی مجتبیٰ کے دلچسپ اور پرلطف مزاحیہ مضامین تابڑ توڑ یکے بعد دیگرے شایع ہونے لگے ۔ مزاح مجتبیٰ حسین کا اوڑھنا بچھونا بن گیا ۔ گھر، دفتر، دفتر سیاست اور محفل احباب ہر جگہ شوخ و شنگ مجتبیٰ گل افشانیٔ گفتار کے ذریعہ مزاح کی دولت بے دریغ لٹاتے رہے ۔ پھر ان کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال کلبلایا کہ جب سازندوں سے لے کر دندان سازوں تک سب کی کانفرنسیں ہوسکتی ہیں تو طنز و مزاح نگاروں کی کانفرنس کیوں نہ منعقد ہو ؟ ۔ چنانچہ مئی ۱۹۶۶ء میں ایک منفرد و یادگار کانفرنس کی نیو ڈالی گئی ۔ یہ کانفرنس طنز و مزاح کے فروغ کی تحریک کا نقطہ آغاز تھی ۔ خود مجتبیٰ اب مرکز نگاہ تھے ۔ مزاح نگار ادیبوں و شاعروں اور نقادانِ ادب نے مجتبیٰ حسین کی تخلیقی صلاحیتوں کو بے حد سراہا ۔ تحسین و ستائش کی صحت مند فضا میں مجتبیٰ حسین اپنے تخلیق کردہ کالموں پر نئی منزلیں تعمیر کرتے گئے ۔ ان کی کتابیں شایع ہوتی رہیں اور دنیائے اردو نے ان کتابوں کو ادبی دلبستگی کے سامان کے طور پر لائبریریوں کی زینت بنایا ۔ انشائیے خاکے ، سفر نامے ، تعارف نامے ، دیباچے ، استقبالیہ و صدارتی خطبے ، کتابوں پر رائے ، تقاریظ ، تذکرے ، رپور تاژ ، محفلوں کی روداد ، ملاقاتوں کا حال ، ادبی و سیاسی تجزیے و تبصرے ، رزم و بزم کی داستانیں ، یہاں تک کہ تعزیت نامے اور بجز فکشن (ویسے مجتبیٰ حسین کے فن مزاح کی ترکیب و تہذیب میں مبالغہ کی ہلکی آنچ کے ساتھ فکشن کے بنیادی اور ترکیبی عناصر کار فرما نظر آتے ہیں) نثری اظہار کے جتنے پیرائے ہوسکتے ہیں ان سب میں مجتبیٰ نے مزاح کی چاشنی گھول دی ۔ بات سے بات پیدا کرنے کی بات غالب سے چلی لیکن آج مجتبیٰ حسین کی تحریریں اس کی بہترین مثال ہیں بلکہ وہ اکثر کوئی بات نہ ہو بھی تو ایک بات پیدا کردیتے ہیں ۔ ان کی یہ خوبی کالم نگاری کے رواں تسلسل کی ضامن ہے ۔
مجتبیٰ حسین آج اردو کے مقبول ترین مزاح نگار ہیں ۔ ان کے مضامین

نثری محفلوں میں مکرر اور دوبارہ ارشاد کی صداؤں اور فرمائشوں کے درمیان شعر کی طرح سنے جاتے ہیں ۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مزاح کے وقار کو بلند کیا ۔ ادبی رجحان سے زیادہ مزاح کو ایک الگ صنف یا شعبہ کی حیثیت سے منوانے کے لیے بھی وہ ہمیشہ کوشاں رہے ہیں ۔ مجتبیٰ حسین نے خاکہ نگاری کے فن میں بھی اپنے لیے ایک منفرد جگہ بنالی ہے ۔ ان کے خاکوں میں ممدوح کے ساتھ خاکہ نگار کا کردار بھی سایہ کی طرح لگا رہتا ہے ۔

بڑا مزاح نگار خالص مزاح کے سہارے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ ادھر چند سال سے مجتبیٰ حسین کی تحریروں پر طنز حاوی ہوتا جارہا ہے ۔ ان کا ہر پیکرِ تحریر طنز کے ہلکے رنگوں میں ملبوس نظر آتا ہے ۔ طنز کی یہ زیریں لہر مزاح کی ادبی شان میں اضافہ کا باعث ہے ۔ خاص طور سے وہ اپنے مضامین کے آخری پیراگراف میں (جسے کلائمکس بھی کہا جاسکتا ہے) طنز کے کاری وار کے ذریعہ مزاح میں ایک ڈرامائی موڑ پیدا کر دیتے ہیں ۔ قاری مجتبیٰ کے ایک ایک لفظ سے اتفاق کرتا ہے اور اگر وہ مضمون سن رہا ہو تو آخر میں تالیاں بجا بجا کر مزاح نگار کے خیالات میں خود کو شریک کرتا ہے۔قاری کا یہ ردِ عمل ایک تخلیق کار کی سب سے بڑی کامیابی ہے ۔

مجتبیٰ حسین کی کالم نگاری کے دو دور ہیں ۔ ۱۲ اگسٹ ۱۹۶۲ ء کو ان کا پہلا کالم شائع ہوا تھا جس کے بعد وہ تقریباً پندرہ سال تک یہ کالم روزانہ پابندی سے لکھتے رہے ۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ سولہ سترہ برس کے وقفہ کے بعد اگسٹ ۱۹۹۳ ء کی انھی تاریخوں میں وہ دوبارہ کالم نگاری کی طرف متوجہ ہوئے ۔ اس مرتبہ قلمی نام کے بجائے وہ اپنے ہی نام سے " میرا کالم " کے زیرِ عنوان روزنامہ " سیاست " کے لیے ۱۵ اگسٹ ۱۹۹۳ ء سے ہر ہفتہ اور مسلسل لکھ رہے ہیں ۔ اس طرح پابندی کے ساتھ لکھنا کوہ بے ستوں کی تیشہ زنی سے کیا کم ہے ؟ ۔ لہو رونے کے بعد کرب و الم کو پوشیدہ رکھ کے اپنے اور دوسروں کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے سے جی تو خوش ہوجائے گا لیکن آنسو بھی نکل پڑیں گے ۔ دراصل مجتبیٰ حسین کے ہاں مزاح رنج و غم پر قابو پانے کا نام ہے ۔ وہ

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

مزاح کی یہ کوند اندھیرے میں روشنی کی ایک لکیر ہے ۔ اس طرح مجتبیٰ حسین عصری و آفاقی تناؤ کے تناظر میں مختلف النوع مسائل و مصائب سے دوچار انسان کو چند خوش گوار لمحے فراہم کرتے ہیں ۔ پھر اس خوش گوار ماحول سے فائدہ اٹھا کر چند ثانیوں میں اپنے دل کی بات کہہ جاتے ہیں ۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے کالم کے لیے عنوان " میرا کالم " شاید اس لیے منتخب کیا تھا کہ کبھی سنجیدہ باتیں بھی کرلیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین اپنے شگفتہ انداز تحریر سے کبھی خود کو جدا نہیں کرسکتے ۔ موضوع کتنا ہی فکر انگیز کیوں نہ ہو مجتبیٰ کی تحریروں کے رگ و پے میں مزاح کا خون اچھلتا کودتا نظر آتا ہے ۔ قدرت نے انھیں خلاقانہ ذہن اور بے مثل تخلیقی توانائی کے ساتھ طنز و مزاح نگاری کی بنیادی صفات ، بصیرت و بصارت ذہنی برتری ، نکتہ رسی اور قلم کی روانی عطا کی ہے ۔ ان کے کالموں کا جائزہ لیجیے تو یہ احساس ہوگا کہ مجتبیٰ حسین نے کالم کی روایتی ہیئت اور کردار کو بدل دیا ہے ۔ " میرا کالم " مجتبیٰ حسین کے موڈ کے تابع ہے ۔ اس کے موضوعات میں بلا کا تنوع ہے ۔ ان کو برتنے کا انداز بھی جداگانہ ہے ۔ اظہار میں تازگی و طرفگی ، اور اسلوب میں شگفتگی ہے ۔ ان صفات کے ساتھ حیات انسانی کے ان گنت مضحک پہلو ، خلوت و جلوت کی کارستانیاں ، ادب و سماج کی بوالعجبیاں ، سیاست دانوں کی ریاکاری ، جبر و استحصال اور عام شہری مسائل مجتبیٰ کے مخصوص انداز نگارش کا ہدف بنتے ہیں ۔

مجتبیٰ کا قاری ان کے پر مزاح انداز تحریر کا قتیل ہے اور مجتبیٰ کی تحریریں اس کے مطالعہ کا لوازمہ ہیں ۔ مجتبیٰ حسین کے چند منتخب کالموں پر مشتمل یہ کتاب یقیناً کالم نگاری کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے اور طنز و مزاح کے چاہنے والوں کے لیے ایک لذیذ و نادر تحفہ ۔

۱۰ / مئی ۱۹۹۹ ء
حیدرآباد

سید مصطفٰے کمال
مدیر " شگوفہ "

تماشائے اہلِ کرم

آم اب عام نہیں رہے

قدرت کے کھیل بھی بڑے نرالے ہیں۔ اس نے آم کو ہندوستان میں پیدا کیا بہت اچھا کیا لیکن اس کو کھانے کا طریقہ امریکہ اور یورپ کے باسیوں کو سکھادیا۔ آم کو ہم بچپن سے کھارہے ہیں لیکن جب تک ہم نے ہالی وڈ کی فلمیں نہیں دیکھی تھیں جن میں ہیروئنیں اور ہیرو بات بات پر ایک دوسرے کو آم سمجھ لیتے ہیں اور سلوک بھی ایسا ہی کرتے ہیں تب تک ہمیں بھی معلوم نہیں تھا کہ آم کو کھانے کا اصل طریقہ کیا ہے۔ بعد میں جب ہم یورپ اور امریکہ گئے تو ہم نے وہاں آم کھانے کی باضابطہ ٹریننگ بھی حاصل کی۔ کیا کریں ہم ہندوستانیوں کی مجبوری یہ ہے کہ آم کھانے سے لے کر انجینیرنگ اور میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے تک ہر کام کو سیکھنے کے لئے ہمیں امریکہ اور یورپ جانے کی عادت سی پڑگئی ہے۔ بہرحال ہم نے وہاں آم کھانے میں وہ مہارت حاصل کی کہ آج ہم کبھی آم کھاتے ہیں تو ہمارے ایک دوست جو ہماری ہی عمر کے ہیں اکثر کہتے ہیں کہ "میاں جب تم دسہری اور چوسہ کھاتے ہو تو نہ جانے کیوں مجھے جینا لولو بریجیدا اور صوفیہ لارین کی بے ساختہ یاد آجاتی ہے"۔ اپنی عمر کے حساب سے وہ ہمیشہ پچھلے موسموں کے پھلوں کو ہی یاد کرتے ہیں۔ ہم نے ایک امریکی دوست سے کہا بھی تھا کہ "بھیا! یہ جو تمہاری فلموں میں بات بات پر ندیدہ پن نظر آجاتا ہے تو اس کی جگہ تم لوگ سیدھے سیدھے آم کیوں نہیں کھالیتے؟"۔

بولے "میاں! پہلی بات تو یہ ہے کہ آم ہمارے ملک میں نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی ہے تو بہت مہنگا ملتا ہے۔ ہم ٹھہرے کاروباری لوگ۔ ہم تو سستی چیز کے پیچھے ہی بھاگتے ہیں"۔ ہم نے کہا "مگر ذائقہ بھی تو ایک چیز ہے"

بولے ۔ جن ملکوں میں آم نہیں ہوتا وہاں کے لوگ اپنا ذائقہ آپ بنالیتے ہیں ۔ آپ بھی کس چکر میں پڑگئے ۔ آپ آم کھانے سے مطلب رکھیے ۔ پیڑوں کو کیوں گنتے ہیں ۔"

حضرات ! معاف کیجیے ۔ ہم خواہ مخواہ ہی پیڑوں کو گننے میں لگ گئے ۔ ہمیں تو آموں کے بارے میں کچھ کہنا تھا اور ہم بلا وجہ ہی اس کے کھانے کے طریقوں میں الجھ گئے ۔ جب ہالی وڈ میں فلمیں نہیں بنتی تھیں تو تب بھی اس ملک میں لوگ جیسے تیسے آم کھالیا کرتے تھے ۔ یہ اور بات ہے کہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے آموں کا رس پوری طرح چوسا نہیں جاسکتا تھا ۔ لیکن اس کی کس کو پرواہ تھی کیونکہ اس زمانہ میں آم بھی تو بہت ہوتے تھے اور میٹھے بھی ہوتے تھے ۔

دوستو ! آم ہمارا قومی پھل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کیا بچہ اور کیا بوڑھا ہر کوئی اسے پیڑ سے گرانے کے لئے پتھر مارتا رہتا ہے ۔ ہم ہندوستانیوں کی عادت ہے کہ جس چیز کو بھی قومی بنادیتے ہیں اسے مارنے کو دوڑتے ہیں ۔ آم تو خیر "راشٹریہ پھل" ہے ۔ ہم نے تو اپنے "راشٹرپتا" کو بھی نہیں چھوڑا ۔ آپ نے ہمیں آموں کے سلسلہ میں ہونے والی اس محفل میں بلا کر سچ مچ ہمارے سینہ پر ایک تیر مارا ہے ۔ کیوں کہ ہم اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے آموں کے باغ کسی زمانہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے ۔ پھر زندگی نے ہمیں کچھ ایسے سبز باغ دکھائے کہ ان باغوں کو چھوڑ کر شہروں میں رہنے لگے ۔ آموں کا موسم آتا تھا تو آم کے پیڑوں پر آم کم لٹکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور ہم ہی ان کی ٹہنیوں پر زیادہ لٹکتے ہوئے پائے جاتے تھے ۔ غرض جب سے ہمارے آموں کے باغ چھن گئے ہیں تب سے ہمارا شمار بھی عوام میں ہونے لگا ہے ۔ یوں بھی آم میں اور عوام میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا کیونکہ دونوں ہی چوسنے کے کام آتے ہیں ۔ سرکار، افسر، بیوپاری، پونجی پتی کون ہے جو عوام کو نہیں چوستا ۔ آم کو چوسنے کے بعد کم ازکم اس کی گٹھلی تو چھوڑدی جاتی ہے مگر عوام کو ایسی بیدردی سے چوسا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو ان کی استھیاں بھی نہیں مل پاتیں ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام کا ذائقہ بھی آم کی طرح لذیز ہوتا ہے ۔ جو لوگ عوام کو چوستے ہیں وہ جانتے ہیں کہ

عوام کا ذائقہ پانچ سال میں ایک مرتبہ اس وقت بہت تلخ ہوجاتا ہے جب عوام ووٹ دینے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن جب سے ووٹوں اور نوٹوں میں ایک تال میل پیدا ہوگیا ہے تب سے عوام کے ذائقہ کی تلخی بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ اسی لئے تو کہاوت مشہور ہے کہ "عوام کے عوام ووٹوں کے دام"

چاہے کچھ بھی ہو ہر کوئی آم کا رسیا ہے۔ آدمی تو پھر آدمی ہے۔ مرزا غالب بھی آموں کے دیوانے تھے۔ ایک ریسرچ اسکالر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ غالب آم کے موسم میں شعر نہیں کہتے تھے صرف آم ہی کھاتے رہتے تھے۔ ایسے میں کوئی انھیں ڈسٹرب کرتا تو اس پر اپنے شعروں سے حملہ نہیں کرتے تھے۔ گٹھلی پھینک کر مارتے تھے۔ آم ہی ایک ایسا پھل ہے جس میں ایک ہتھیار چھپا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں غالب کے ایک دوست کو آموں سے چڑ تھی۔ ایک دن دونوں بازار سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ گلی میں پڑے ہوئے ایک آم کو ایک گدھے نے پہلے تو سونگھا۔ کچھ سوچا۔ پھر اسے کھائے بغیر آگے کو نکل گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر مرزا غالب کے دوست نے کہا "دیکھئے غالب صاحب! گدھا بھی آم نہیں کھاتا۔" اس پر غالب نے کہا "حضور! میں جانتا ہوں کہ گدھا ہی آم نہیں کھاتا۔"

مگر یہ پرانی بات تھی جب گدھے کسی وجہ سے آم نہیں کھاتے تھے۔ مگر آج حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ ہم جس آدمی کو بھی آم کھاتا ہوا دیکھ لیتے ہیں تو اسے گدھا سمجھنے لگتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست نے ہماری آنکھوں کے سامنے پورے سو روپیوں میں ایک بڑا الفانسو آم خرید لیا تو ہمیں اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ گدھا بڑا ہوشیار جانور ہے۔ اس نے ایک صدی پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ ایک دن آم پینتالیس پچاس روپے فی کیلو کے حساب سے بکے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی ہی سب سے بڑا گدھا ہے اور گدھا ہی سب سے بڑا انسان ہے۔ آموں کی مہنگائی کی وجہ سے ہی ہم آم تو نہیں خریدتے لیکن ان کے دام ضرور پوچھ لیتے ہیں۔ ایک فروٹ مرچنٹ سے ہم لگاتار چھ دنوں تک آم کے دام پوچھتے رہے۔ ساتویں دن ہم اس کی دکان پر گئے تو اس سے دام تو نہیں پوچھا البتہ بڑی دیر تک للچائی نظروں سے صرف آموں کو دیکھتے رہ گئے۔ اس پر دکاندار نے پہلے تو اپنے آموں کو

کپڑے سے اچھی طرح ڈھک لیا۔ پھر بولا " آپ دام پوچھیں گے یا میں ہی آپ کو بتادوں ۔ ؟"

ہم نے کہا " میاں ! ہمیں تو ایک ایسے پھل کی تلاش ہے جس کے بارے میں سنا ہے کہ بہت میٹھا ہوتا ہے ، لوگ اسے صبر کا پھل کہتے ہیں ۔ مل جائے گا تمہارے پاس ؟"

دکاندار بولا " اب تمھیں زیادہ دن صبر نہیں کرنا پڑے گا ۔ ساٹھ پینسٹھ کے تو لگتے ہی ہو ۔ دو چار برس اور صبر کرلو تو صبر کا یہ پھل تمھیں دوسری دنیا میں جلد ہی ملے گا ۔ اس دنیا میں تو یہ نہیں ملتا ۔ اس وقت تو لنگڑے سے کام چلالو ورنہ اپنا راستہ ناپو "

اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں آم صرف دو قسم کے ہوتے تھے ۔ کاٹنے کے اور چوسنے کے ۔ اب دیکھنے کے آم بھی ہونے لگے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ ذایقہ اور صورت شکل کے اعتبار سے آموں کی بھی اتنی ہی قسمیں ہوتی ہیں جتنی کہ عورتوں کی ہیں ۔ پھر لطف کی بات یہ کہ دونوں میں بہت سی باتیں ایک جیسی بھی پائی جاتی ہیں ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض بہت خوبصورت اور حسین عورتیں اندر سے بہت تلخ ، ترش اور کڑوی کسیلی ہوتی ہیں ۔ صورت اور سیرت میں جو فرق ہوتا ہے اس کا اندازہ ہمیں آم کھانے کے بعد ہی ہوتا ہے ۔ جو لوگ آم اور عورت کی خوبی کا اندازہ اس کی صورت سے لگاتے ہیں وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں ۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی آم کی صورت تو ہمیں بہت خراب لگی لیکن جب کھایا تو طبیعت باغ باغ ہوگئی ۔ یہ بات ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہے ہیں ۔ کیونکہ پچھلے چالیس برسوں سے ہم ایک ایسے ہی آم کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں ۔

یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہم چوسنے کے آم ہی کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ کاٹنے والے آم اس لئے نہیں کھاتے کہ تین آم کھانے ہوں تو ڈیٹول کی پوری ایک شیشی خرچ کرنی پڑتی ہے ۔ آموں کے سینکڑوں نام بھی ہوتے ہیں ۔ بڑے کیوٹ (Cute) اور مزیدار ۔ بعض نام تو ان آموں کے قلمی نام (Pen Name) ہوتے ہیں ۔ لیکن ہمیں تو لنگڑا بہت پسند ہے ۔ کسی نے اسکی شکل و صورت کو دیکھ کر مذاق میں اس کا نام لنگڑا رکھ دیا تھا ۔

لیکن اس آم نے الٹا نام رکھنے والے کا مذاق اڑانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اب یہ آم جتنا چلتا ہے کوئی اور آم نہیں چلتا بلکہ اسے تو آموں کا ملکھا سنگھ بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض قصبے صرف آموں کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ملیح آباد کو ہی لیجئے۔ اگر یہاں آم نہ ہوتے تو بھلا بتایئے ملیح آباد کو کون جانتا۔ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ میں جوش ملیح آبادی نے یہ چاہا تھا کہ ملیح آباد کی شہرت ان کے نام کی وجہ سے بھی ہو۔ لیکن زمانہ کی دوڑ میں ملیح آباد کے آم پھر آگے کو نکل گئے اور حضرت جوش ملیح آبادی پیچھے رہ گئے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی جب پاکستان گئے اور وہاں ان کا تعارف پاکستان کے اس وقت کے صدر اسکندر مرزا سے کرایا گیا کہ ان سے ملئے یہ جوش ملیح آبادی ہیں تو اسکندر مرزا نے چھوٹتے ہی کہا "اچھا تو آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں جہاں کے آم بڑے مشہور ہیں۔" اس کے بعد اسکندر مرزا نے جوش ملیح آبادی سے ملیح آباد کے آموں کے بارے میں تو بہت کچھ پوچھا لیکن ان کی شاعری کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا۔

آخر میں ہم الہ آباد کے حوالہ سے ہی اپنی بات کو ختم کرنا چاہیں گے۔ پچپن چھپن برس پرانی بات ہوگی جب جواہر لال نہرو الہ آباد کے آنند بھون میں رہا کرتے تھے۔ یہی گرمیوں کے دن تھے۔ بلکہ مہینہ بھی شاید یہی تھا۔ ہوسکتا ہے تاریخ بھی یہی رہی ہو۔ اندرا گاندھی فیروز گاندھی سے شادی کرنے کے بعد ہنی مون منانے کے لئے کشمیر گئیں تو وہاں کی ٹھنڈی ہواؤں نے انھیں مسحور کردیا۔ ایسے میں انھیں اچانک نہرو جی کا خیال آیا کہ وہ تو الہ آباد کی سخت گرمی میں پریشان ہونگے۔ لہٰذا انھوں نے ہمدردی کے طور پر نہرو جی کو لکھا کہ کاش میں آپ کے لئے کشمیر کی کچھ ٹھنڈی ہوائیں الہ آباد بھیج سکتی۔ اس پر جواہر لال نہرو نے اندرا جی کو لکھا "بیٹی! مجھے تو تم پر ترس آرہا ہے۔ کشمیر میں بھلے ہی ٹھنڈی ہوائیں تمھارے ساتھ ہوں گی لیکن تمھارے پاس دسہری اور ثمر بہشت تو نہیں ہیں۔"

اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد آج نہ تو کشمیر میں ٹھنڈی ہوائیں ہیں اور نہ ہی الہ آباد میں دسہری اور ثمر بہشت نظر آتے ہیں۔

(۹/ جون ۱۹۹۷)

کتو! انسانوں سے خبردار رہو

پچھلے ہفتہ ہم جیسے ہی حیدرآباد سے واپس ہوئے وہاں سے فرقہ وارانہ فسادات کی اطلاعات آنے لگیں۔ ہم نے سوچا تھا ان فسادات کے بارے میں بھی کچھ لکھیں گے لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ ہم نے تیس برس پہلے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں پورا ایک مضمون "ہند باد جہازی کا سفر نامہ" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جب لوگوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا بلکہ بہتوں نے تو اسے پڑھا بھی نہیں تو اب کیا لیں گے۔ یوں بھی پچھلے تیس برسوں میں اس ملک میں فسادات نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ اب تو یہ ہماری روز مرہ زندگی کا معمول سا بن گئے ہیں۔ بعض لوگ تو ان فسادات کو "گھریلو صنعت" کا درجہ بھی دینے لگے ہیں۔ کوئی کام روز مرہ میں شامل ہو جائے تو اس میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ لیکن ان فسادات کے فوری بعد ہمیں حیدرآباد سے ایک ایسی دلخراش اور ہیبتناک اطلاع ملی ہے کہ یقین مانئے ہم سے کھانا تک کھایا نہیں جا رہا ہے۔ ہم یہاں دوپہر کے کھانے کی بات کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس اطلاع کے ملنے سے پہلے ہی ہم خدا کے فضل سے صبح کا ناشتہ کر چکے تھے۔ اب رات کے کھانے کا کیا ہوگا اس کے بارے میں ہم ابھی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پتہ چلا ہے کہ پچھلے دنوں حیدرآباد میں بیس پچیس آوارہ کتوں نے مل کر ایک معصوم بچی کو ہلاک کیا۔ پھر اسکا سارا گوشت نوچ نوچ کر کھا گئے۔ جب سے ہم نے یہ خبر پڑھی ہے تب سے "انسانیت" پر سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کتے یوں انسانیت کی سطح سے نیچے گر جائیں گے۔ ہمیں کتوں سے بالکل یہ امید نہیں تھی کہ وہ ایسی غیر انسانی حرکت کے مرتکب ہوں گے۔ سچ پوچھئے تو جب سے انسان

انسانیت سے دستبردار ہوا ہے تب سے ہم کتوں میں بچی کھچی انسانیت کو دیکھ دیکھ کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے کہ۔

ع۔ ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

مانا کہ زمانہ ماقبل تاریخ میں انسان جب جنگلوں میں رہتا تھا تو کتا بھی وہیں رہتا تھا لیکن بعد میں یہ انسان کے نقش قدم پر چل کر جنگل سے نکل آیا اور انسانی بستیوں میں رہنے لگا۔ انسانی عادات و اطوار سیکھے اور بعض معاملات میں تو انسان سے بھی آگے نکل گیا۔ بھلے ہی وفاداری اور سمجھ داری کے معاملہ میں انسان کبھی کتوں سے آگے رہا ہو لیکن کیا مجال جو آج کا انسان اس معاملہ میں کتوں سے آگے نکل جائے۔ اب تو وفاداری پر صرف کتوں کی اجارہ داری بن گئی ہے۔ ہم نے زندگی میں صرف ایک بار ہی کتا پالا تھا اور وہ بھی اس وقت پالا تھا جب ہمیں کتے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ ان دنوں ہمارے گھر میں کچھ تھا ہی نہیں جس کی یہ کتا حفاظت کرسکتا۔ ایک دن ہم کہیں چلے جارہے تھے کہ راستے میں کتے کا ایک لاوارث پلّہ نظر آیا جس کی آنکھیں بھی ابھی پوری طرح کھلنے نہیں پائی تھیں اور وہ سڑک پر دیوانہ وار دوڑ رہا تھا۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ کہیں کسی بیل گاڑی یا تانگے کے نیچے نہ آجائے اسے اٹھا کر گلی میں ایک محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد دیکھا کہ یہ تو ہمارے ہی پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ چار و ناچار ہم اس بے یار و مددگار کتے کے پلے کو اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور ہوگئے۔ جو روکھی سوکھی ہم کھاتے تھے وہی اسے بھی کھلاتے تھے۔ مگر چند دن بعد جب یہ بڑا ہوا تو احساس ہوا کہ یہ تو آلسیشن کتا ہے۔ پھر کچھ ہی دنوں میں اس کی شخصیت ہماری شخصیت سے کہیں زیادہ نکھر آئی۔ مگر چونکہ ہماری صحبت میں رہتا تھا اس لیے عادات و اطوار کے معاملہ میں بالکل ہم پر گیا تھا۔ بھونکتا بالکل نہیں تھا۔ بات بات پر دم ہلا دیتا تھا۔ گھر کے کسی بھی کونہ میں ایک بے نیاز مرد قلندر کی طرح پڑا رہتا تھا۔ ایک دن ہم گھر واپس ہوئے تو ہماری بیوی نے ہنستے ہوئے کہا "اجی! یہ کتا تو بالکل آپ کی ٹرو کاپی ہے (True Copy) ہے"۔ ہم نے پوچھا "وہ کس طرح؟" بولیں "آپ تو جانتے ہیں کہ اسے بھونکنا نہیں آتا۔ بالکل گونگا سا کتا ہے لیکن سمجھدار اتنا ہے کہ

سامنے جب بھی کوئی چور اُچکا یا اوباش قسم کا آدمی گزرتا ہے تو فوراً اس کی اطلاع دے دیتا ہے "
ہم نے پوچھا "وہ کیسے ؟" بولیں "فوراً دیوانہ وار بھاگ کر میرے پاس آجاتا ہے اور ڈر کے مارے میرے پیچھے چھپ جاتا ہے ۔ اس کے خوف سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ باہر کوئی مشکوک قسم کا کردار سڑک سے گزر رہا ہے " ۔
اس انکشاف کے بعد ہمیں اس کتّے پر پیار سا آگیا ۔ اس کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے آئینہ میں ہم اپنے آپکو دیکھ رہے ہوں ۔ اب ہم اپنے منہ سے اپنی ہی کتنی تعریف کریں ۔ ایسا شریف النفس ، حلیم الطبع ، منہ مرا ، کم گو اور بااخلاق کتا کم از کم آلسیشن نسل کے کتوں میں تو کوئی پیدا نہ ہوا ہوگا ۔ یہ سب ہماری صحبت کا فیض جاریہ تھا ۔ اگرچہ ہمارے بعض دوست اس کتّے پر فقرے بھی کستے تھے کہ " میاں! تمہارا کتا تو بالکل گدھا ہے ۔ " اور ہماری اعلیٰ ظرفی دیکھئے کہ ہم ان فقروں کو چپ چاپ برداشت کرلیتے تھے ۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ یہ فقرے کتّے کے لئے نہیں بلکہ ہمارے لئے استعمال کئے جارہے ہیں ۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کتا انسان سے ہی سب کچھ سیکھتا ہے ۔ عمر کے آخری حصّہ میں اسے غالباً یہ احساس ہوگیا تھا کہ اس نے ہم سے تو بہت کچھ سیکھ لیا ہے لیکن ہماری بیوی سے کچھ نہیں سیکھا ۔ لہٰذا اس نے ہماری بیوی کی ایک عادت ضرور سیکھ لی تھی ۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ایک رات ہم دیر سے گھر واپس ہوئے اور ہماری بیوی نے ہم پر برسنا شروع کردیا تو کتا بھی ہماری بیوی کے برابر بیٹھا لگاتار غرّاتا رہا ۔ بعد میں غرّانے کے معاملہ میں وہ خود مکتفی ہو گیا تھا ۔ بعض اوقات تو یونہی ہمیں دیکھ کر غرّاتا رہتا تھا ۔ ہم نے بیوی سے تنہائی میں کہا کہ خدا کے لئے وہ ہم پر کتّے کے سامنے برسنا بند کردیں کیونکہ اس سے کتّے کے اخلاق پر بُرا اثر پڑ رہا ہے ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کتا جو کچھ بھی سیکھتا ہے وہ انسان سے ہی سیکھتا ہے ۔ اگرچہ بعد میں انسان پہلے سے سیکھی ہوئی باتیں اکثر بھول جاتا ہے لیکن کتا نہیں بھولتا ۔
صدیوں پہلے کتّے نے انسان سے وفاداری سیکھی تھی ۔ انسان تو وفاداری سے کب کا کنارہ کش ہوگیا لیکن کتّے نے وفاداری کے جذبہ کو اب تک اپنے سینہ سے

لگائے رکھا ہے۔ ہمیں اس وقت ٹوکیو کا وہ ریلوے اسٹیشن یاد آگیا جس کے سامنے کتّے کا ایک مجسمہ نصب ہے۔ اس اسٹیشن کا نام بھی اس کتّے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کتّے کی کہانی یہ ہے کہ اس کا مالک جب بھی کام پر جانے کے لئے اسٹیشن آتا تو تو کتا بھی اس کے ساتھ آتا تھا۔ مالک تو ٹرین میں بیٹھ کر چلا جاتا تھا لیکن شام میں یہ کتاّ اپنے مالک کی واپسی کے وقت پھر اسٹیشن آکر اس کا انتظار کرنے لگ جاتا تھا۔ مالک واپس آتا تو اسی کے ساتھ گھر واپس ہوتا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ایک بار اس کا مالک ٹرین میں گیا تو یوں گیا کہ پھر کبھی واپس نہ ہوا۔ کسی ٹریفک حادثہ میں اس کی موت ہوگئی۔ مگر اس کے مرنے کے دو سال بعد تک یہ کتاّ لگاتار اسٹیشن کے سامنے اپنے مالک کی واپسی کا انتظار کرتا رہا اور اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ بعد میں یہ خود بھی وہاں چلا گیا جہاں اس کا مالک گیا تھا۔

ہم تو ایسے ہی شریف کتوں کے بارے میں جانتے ہیں جن کا وجود انسانیت سے لبریز ہوتا ہے۔ اب یہ جو حیدرآباد سے چند آوارہ کتّوں کی غیر انسانی حرکت کی اطلاع آئی ہے تو ہم انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہوتے جارہے ہیں۔ مانا کہ بعض کتّے شریر بھی ہوتے ہیں، بھونکتے بھی ہیں بلکہ پطرس بخاری کے لفظوں میں "مشاعرے" بھی منعقد کرتے ہیں۔ لیکن ایسی انسانیت سوز حرکت نہیں کرتے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ہم ایک دوست سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے تو ان کے کتّے نے صحن سے بے تحاشہ بھونکنا شروع کردیا۔ ہم نے اپنے دوست کو پکارا تو انہوں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھول کر ہم سے کہا اندر آجائیے۔ یہ کچھ بھی نہیں کرے گا۔ ہم نے کہا ذرا دیکھئے تو سہی کہ کیسی خطرناک آواز میں بھونک رہا ہے۔ بولے "آپ کو تو وہ کہاوت معلوم ہے کہ بھونکنے والے کتّے کاٹتے نہیں۔ پھر اس میں ڈر کیسا؟" ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا "بھیاّ۔ مجھے تو یہ کہاوت معلوم ہے لیکن یہ کہاوت اگر آپ کے کتّے کو معلوم نہ ہو تو میرا کیا ہوگا"۔ ہمارے دوست نے کھرے کھرے جواب دیا۔ "میاں اطمینان رکھو۔ میرا کتا تم سے زیادہ پڑھا لکھا اور سمجھدار ہے۔ صرف ڈگری رکھنے سے کوئی تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتا۔"

اور اس دن ہم کتّے کے لگاتار بھونکنے کے باوجود ہمت کر کے اپنے دوست کے

ڈرائینگ روم میں چلے گئے تھے اور ہمیں پہلی بار پتہ چلا کہ کتے بھی اس کہاوت سے بخوبی واقف ہیں۔

آج ہمیں مندرجہ بالا کتّوں کی یاد اس لئے آگئی کہ یہ سب کے سب شرافت، وفاداری، انسانیت، خودداری اور علم کے زیور سے آراستہ تھے، حیدرآباد کے کتّوں کو نہ جانے کیا ہوگیا کہ انہوں نے اچانک انسانیت کا لبادہ اتار پھینکا۔ یہ سب آج کے انسانوں کی صحبت میں رہنے کا نتیجہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر حیدرآباد میں فسادات نہ ہوتے تو کتّوں کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ ایک معصوم بچی کو بلاوجہ اس طرح چیرا اور پھاڑا جاسکتا ہے۔ انسانوں کو تو ہم اب کچھ کہنے سے رہے۔ ہماری سنتا بھی کون ہے؟ لہٰذا کتّوں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ انسانیت کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ ہماری صدیوں پرانی تہذیب کے اب وہ اکیلے امین رہ گئے ہیں۔ اگرچہ انسان اب شہروں میں رہ کر صدیوں پہلے جنگل میں رہنے والے قدیم وحشی انسان کی سی حرکتیں کرنے لگا ہے۔ لیکن کتّوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شہروں میں رہ کر وحشی انسان کی سی حرکت کریں۔ کتّوں کو ہم صدق دل سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انسانوں سے خبردار رہیں۔ اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو فراموش نہ کریں۔ (۲۸/ جون ۱۹۹۸ء)

ملکہ ایلزبتھ اور ہمارا باورچی خانہ

برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ سے ہمیں یہ شکایت ہے کہ وہ ہندوستان آئیں ۔ دہلی بھی آئیں اور دہلی میں ہمارے گھر کے بالکل پاس سے گزریں لیکن ہمارے غریب خانہ پر قدم رنجہ نہیں فرمایا ۔ مانا کہ ہمارے گھر آنے کی بات ان کے پہلے سے طے شدہ پروگرام میں شامل نہیں تھی لیکن ان دنوں ملکہ برطانیہ کا کونسا کام پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق انجام پارہا ہے ۔ شہزادی ڈائینا کے انتقال پر سرکاری طور پر اظہار افسوس کرنا ان کے سرکاری پروگرام میں شامل نہیں تھا لیکن انہیں بالآخر اظہار افسوس کرنا پڑا ۔ ضرورت ایجاد کی والدہ محترمہ ہوتی ہے ۔ جس دن وہ ہمارے گھر کے پاس سے گزریں اس دن اتفاق سے ہم گھر پر ہی تھے بلکہ عین اسی وقت ہم دہلی شہر کے خلاف کالم لکھ رہے تھے کہ بالکل واہیات شہر ہے ۔ یہاں آدمی رہتا کم ہے اور لٹکتا ہوا زیادہ پایا جاتا ہے ۔ بہر حال ہماری دلی خواہش یہ تھی کہ ملکہ ایلزبتھ ہمارے غریب خانہ پر تشریف لے آئیں اور ایک نظر ہمارے باورچی خانہ پر بھی ڈال لیں ۔ ہم انہیں یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ ہمارے باورچی خانہ میں جس ڈبہ پر مرچ کا لیبل لگا ہوتا ہے اس میں زیرہ پایا جاتا ہے اور زیرہ ، چینی کے ڈبہ میں اور خود چینی ، دار چینی کے ڈبہ میں پائی جاتی ہے ۔ اسی طرح اور بھی بہت سی مختلف چیزیں مختلف لیبلوں کے ڈبوں میں پائی جاتی ہیں ۔ بلامبالغہ ایک بار ہمیں سونف کی ضرورت پیش آئی تو پندرہ ڈبوں کے ڈھکن کھولنے کے بعد ہمیں یہ گوہر مقصود (بشرطیکہ آپ بھی ہماری طرح سونف کو گوہر مقصود مانیں) اس ڈبہ میں ملا جس پر نہایت ہی جلی حروف میں "کھوپرے" کا لیبل لگا ہوا تھا ۔ ڈبوں کے اس الٹ پھیر کی وجہ سے ہم کبھی اپنے گھر کے باورچی خانہ میں نہیں جاتے کیونکہ ہماری یادداشت اتنی اچھی نہیں ہے

کہ ہم غلط لیبلوں اور صحیح اشیاء کے تعلق کو سمجھنے میں اپنا وقت برباد کریں۔ ملکہ ایلزبتھ ہمارے گھر آکر ذرا ہماری اہلیہ محترمہ کو سمجھائیں کہ "بہن جی! یہ جو آپ نے چیزوں کے ڈبوں پر غلط لیبل لگا رکھے ہیں تو یہ غلط بات ہے۔ اس سے شوہروں اور چوروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اور ہاں اپنا باورچی خانہ ذرا صاف بھی رکھا کیجئے" آپ پوچھیں گے "بھئیا ملکہ ایلزبتھ تمہارے گھر آکر تمہاری بیوی سے بھلا یہ بات کیوں کرتیں۔ انہیں کیا پڑی ہے تمہارے گھر آنے اور ایسی باتیں کرنے کی؟"

اس کے جواب میں ہماری عرض یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو ایک زمانہ میں ہم سرکار انگلیشیہ کے شہری رہ چکے ہیں۔ جب سے انگریز ہمیں اس ملک میں چھوڑ گئے ہیں تب سے کسی نے ہماری خیریت نہیں پوچھی۔ سچ پوچھیے تو انگریزی تہذیب سے متاثر ہو کر ہی ہم نے باورچی خانہ کے ڈبوں پر لیبل لگانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ لیبل پہلے انگریزی میں تھے۔ آزادی کے دس سال بعد جب ہم پھر غلام ہوئے یعنی ہماری شادی ہو گئی تو ہماری نصف بہتر نے جو انگریزی نہ جاننے کے باعث انگریزوں کی شدید مخالف رہی ہیں، یہ مطالبہ کیا کہ کم از کم اس گھر کے باورچی خانہ میں اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہیے۔ ہم نے بھی ان کے جذبۂ حب الوطنی اور اردو دوستی کی تعریف کی اور ڈبوں پر لیبل اردو میں چسپاں کر دئے۔ چند دن بعد ہمارے گھر میں ایک خادمہ کو ملازم رکھا گیا تو یہ لیبل تلگو زبان میں بھی پائے جانے لگے۔ پھر جب ہمارے بچے بڑے ہو گئے تو انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ڈبوں کے لیبل انگریزی میں ہونے چاہئیں۔ ہم نے حتی الامکان کوشش کی کہ لیبل انگریزی میں ہوں لیکن دار چینی، شاہ زیرہ، سونٹھ، کالا مصالحہ، دھنیہ، جیرونجی، وغیرہ کی انگریزی جاننے کی کوشش میں ہمارے کئی دن ضائع ہو گئے۔ یوں بھی ہم کوئی شکسپیئر یا ملٹن تھوڑا ہی ہیں کہ ان اشیاء کے انگریزی نام بھی جاننے کا دعویٰ کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے گھر کے باورچی خانہ میں اب کم از کم چار زبانوں میں ڈبوں کے لیبل پائے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات ان ڈبوں میں وہ چیز نہیں پائی جاتی جس کی ہمیں تلاش ہوتی ہے۔ گویا ہم اب تک اپنے باورچی خانہ میں زبانوں کا مسئلہ ہی حل نہیں کر سکے ہیں تو اس کی صفائی اور دیگر لوازمات کے بارے میں دھیان دینے کا کہاں

سوال پیدا ہوتا ہے ۔ ملکہ ایلزبتھ اگر تھوڑی دیر کے لیے آجاتیں اور ہمارے گھر والوں کو سمجھا جاتیں تو شاید ہمارے باورچی خانہ کے حالات کچھ بہتر ہوتے ۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ہمارے گھر میں ہماری بات تو کوئی سنتا نہیں ۔ وہ سفارش کر جاتیں تو شاید ان کی بات مان بھی لی جاتی ۔ اب یہی دیکھئے کہ ملکہ ایلزبتھ نے چلتے چلتے یہ کہہ دیا کہ دہلی بڑا گندہ شہر ہے ۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے اور برسوں سے معلوم ہے ۔ لیکن ملکہ ایلزبتھ نے دہلی کی گندگی کے بارے میں ایک بات کیا کہہ دی کہ وزیر اعظم سے لے کر دہلی کے چیف منسٹر تک اور چیف منسٹر سے لے کر دہلی کے ایک گداگر تک سب کو پتہ چل گیا کہ دہلی ایک گندہ شہر ہے ۔ اور یہ سب کچھ اتنی معصومیت کے ساتھ ہو رہا ہے جیسے ملکہ ایلزبتھ کے آنے سے پہلے کسی کو پتہ ہی نہیں تھا کہ دہلی واقعی ایک گندہ شہر ہے ۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جو افراد اب دہلی کی گندگی کی شکایت کر رہے ہیں وہ سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت میں دامے ، درمے ، سخنے دہلی کی گندگی میں اضافہ کا سبب بنتے رہے ہیں ۔ ہمارے وزیر اعظم خود دہلی کے رہنے والے ہیں اور کسی زمانہ میں دہلی میٹروپالیٹن کونسل کے سربراہ رہے ہیں ۔ دہلی کے کناٹ پلیس والے کافی ہاوس میں تو وہ خود بھی برسوں آیا کرتے تھے ۔ نہ صرف وزیر اعظم کو بلکہ دہلی کے چیف منسٹر کو بھی پتہ ہے کہ اگر صبح کے وقت کوئی سیاح بذریعہ ٹرین دہلی آئے تو اسے دہلی کا سب سے اہم منظر جو نظر آتا ہے اس میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو ٹرین کی پٹریوں کے ساتھ ساتھ رفع حاجت میں مصروف دکھائی دیتے ہیں ۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ سہولت بھی سیاحوں کے فائدہ کے لئے ہی فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ ٹرین کی کھڑکی کے باہر نظر نہ ڈالیں اور ڈبہ میں اپنے سامان پر ہی نظر رکھیں ۔ دہلی میں چور اچکے بھی تو بہت ہوتے ہیں ۔ اگر آپ خدا نخواستہ باہر کے منظر کی دلفریبی میں کھو گئے تو آپ کا سامان بھی چوری ہو سکتا ہے ۔ آمورِ مملکت تو سرکار ہی جانے ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اس آزادیٔ رفع حاجت کی وجہ سے کم از کم آج تک ہمارا کوئی سامان ٹرین کے سفر میں چوری نہیں ہوا ۔

سو باتوں کی ایک بات ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب تو ہم دہلی کی گندگی میں رہنے کے عادی ہو گئے ہیں ۔ اگر خدا نخواستہ ملکہ الزبتھ کے کہنے سے ہی سہی دہلی کو صاف

ستھرا شہر بنادیا گیا تو ہمارا حشر بھی ہمارے اس بیچلر دوست کا سا ہو جائے گا جو گھر میں اکیلے رہتے تھے ۔ قلندر آدمی تھے ۔ نہ کبھی گھر کی صفائی کرتے تھے اور نہ ہی اس طرف دھیان دیتے تھے ۔ ایک دن ہم ان کے گھر گئے تو دیکھا کہ گھر کی ہر چیز گرد میں اٹی پڑی ہے ۔ جس ٹیبل پر وہ کھانا کھاتے تھے اس پر بھی گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی جیسے ہی ہم ان کے پاس پہنچے تو ہمارے دوست غسل کرنے کے ارادہ سے چلے گئے ۔ ہمیں ان کے ٹیبل پر جمی ہوئی گرد اچھی نہیں لگی تو ہم نے کپڑے سے اسے صاف کردیا ۔ غسل سے فارغ ہو کر ہمارے دوست جب باہر آئے اور ٹیبل کی صفائی دیکھی تو اپنا سر پیٹنے لگے ۔ کہنے لگے " میں تو برباد ہوگیا ۔ تباہ و تاراج ہوگیا ۔ اس گرد آلود ٹیبل پر میں نے کئی دوستوں کے ٹیلی فون نمبر ، پتے ، دھوبی کا حساب وغیرہ لکھ دیا تھا بلکہ آج ہم دونوں کو جن صاحب کے پاس ٹیلی فون کر کے ملنے کیلئے جانا تھا خود ان کا ٹیلی فون نمبر بھی گرد کی اسی تہہ میں لکھ رکھا تھا ۔ تم نے اسے صاف کر کے میری تو لٹیا ہی ڈبو دی ۔" وہ چیختے رہے اور ہم اپنی صفائی پسند طبیعت کو کوستے رہے ۔ بعد میں ہم نے بھی گندگی کو اپنا شعار بنالیا بلکہ اب تو گندگی ہمارے لئے شناختی کارڈ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اب آپ سے کیا چھپائیں کہ ملکہ عالیہ کے عالیہ ارشادات عالیہ کے بعد دہلی میں صفائی کی جو مہم شروع ہوئی تو ہمارے گھر کے سامنے سے کوڑے کرکٹ کا وہ ڈھیر بھی ہٹادیا گیا جسے ہم اجنبیوں کو اپنے گھر کا پتہ بتانے کیلئے بطور نشانی استعمال کرتے تھے ۔ اب جو کوڑے کا یہ ڈھیر ہٹ گیا ہے تو نہ صرف ہمارے دوستوں کو بلکہ خود ہمیں بھی اپنے گھر کا راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے ۔ جس شہر میں گندگی کو آدمی کے شناختی کارڈ کی حیثیت حاصل ہوجائے تو وہاں صفائی سے حتی الامکان پرہیز کرنا ضروری ہوجاتا ہے ۔ ملکہ ایلزبتھ کا کیا ہے ۔ پچاس برس بعد ایک بار آکر وہ تو چلی گئیں لیکن ہمیں تو اس شہر میں رہنا ہے ۔ اور اپنے آداب کے ساتھ رہنا ہے ۔ (بشرطیکہ انہیں آداب کہا جاسکے) مانا کہ ملکہ ایلزبتھ کو دہلی کی گندگی سے تکلیف پہنچی ہوگی ۔ کیونکہ پچاس برس پہلے تک اس شہر کو صاف رکھنے کی ذمہ داری ان کی سرکار کی تھی ۔ فطری طور پر انہیں تکلیف تو ہوئی ہوگی کہ وہ دہلی کو کس حالت میں چھوڑ گئی تھیں اور اب اس کی کیا حالت ہوگئی ہے ۔

ہم تو کہتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ شاہ جہاں دوبارہ پیدا ہو کر دلی آئے اور دلی کی سیر کرے تو اسے بھی تکلیف ہوگی کہ اس کے شاہ جہان آباد کا کیا حشر ہوگیا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے کیونکہ دلی میں تو ان دنوں جمہوریت کا دَور دَورہ ہے اور دلی میں وہ ساری گندگی شامل ہوگئی ہے جو ہماری جمہوریت کے راستے سے دلی شہر میں شامل ہوتی ہے۔

یوں بھی دلی بڑا پرانا شہر ہے۔ کتنے ہی حکمران یہاں آئے اور چلے گئے اور اپنی نشانیاں یہاں چھوڑ گئے۔ سنا ہے کہ دلی سات بار بسی اور سات بار اُجڑی۔ اس شہر کو اجاڑنے والوں سے تو ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ البتہ ان لوگوں سے ضرور شکایت ہے جنہوں نے اسے پھر سے بسایا۔ جب یہ شہر اجڑ گیا تھا تو اسے پھر سے بسانے کی کیا ضرورت تھی۔ ساتویں بار جو دلی بسی ہے تو ایسی بسی ہے کہ اس کے بسنے میں خود اجڑنے کا عمل جاری ہے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی

یہ جس قدر بستی چلی جارہی ہے اتنی ہی اجڑتی بھی چلی جارہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شہر بس رہا ہے یا اجڑ رہا ہے۔ ہمیں تو اب اس شہر کے حدود اربعہ بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ میلوں چلے جاؤ پھر بھی اس شہر سے نجات نہیں ملتی کیونکہ دلی کے جنوب میں بھی دلی ہی واقع ہے اور اس کے شمال میں بھی اتفاق سے یہی شہر آباد ہے۔ یہی حال مشرق و مغرب کا بھی ہے۔ ایسا شہر جو کسی کے قابو میں نہ ہو اسے کون صاف کرے گا اور کہاں تک صاف کرے گا۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ ملکہ ایلزبتھ ذرا سی دیر کو ہمارے باورچی خانہ میں قدم رنجہ فرماتیں اور اس بارے میں کچھ ضروری مشورے دے جاتیں تو ہمارا بھلا ہو سکتا تھا اور ہم ان کے حق میں دعائیں دیتے۔

(۲۶ / اکتوبر / ۱۹۹۷)

پکوان میں کتابت کی غلطی

بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ شادی تو ہماری بہت پہلے ہو گئی تھی لیکن شادی شدہ ہم بہت بعد میں بنے۔ پچھلے زمانہ میں بچوں سے ان کا بچپن چھیننے کے لئے چونکہ " نصابی کتابیں " اور " ہوم ورک " وغیرہ جیسی چیزیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں اسی لئے اس زمانے میں بچوں سے ان کے بچپن کو چھیننے کا آسان طریقہ یہ تھا کہ ان کی بچپن میں ہی شادی کردی جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا یعنی ایک رات کپڑے کی گڑیا کو حسب معمول بستر میں اپنے ساتھ رکھ کر سو گئے لیکن دوسرے دن صبح اٹھ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ گڑیا سانس لے رہی ہے اور خود بخود کروٹ بھی بدل رہی ہے۔ نتیجہ میں ہمیں اپنے بچپن کو جیوں کا تیوں چھوڑ کر جوانی کی طرف اچانک بھاگنا پڑا۔ اس " افراتفریح " میں ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ شادی کے بہت سے لوازمات جیسے " ہنی مون " وغیرہ کیا ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اب جب کہ ہمارے بچے زندگی میں سیٹل ہو چکے ہیں تو ہم ذرا اطمینان سے " ہنی مون " منانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہماری نئی نویلی اہلیہ بھی اس کی بالکل اہل نہیں تھیں کہ امور خانہ داری کے فرائض کو بخوبی انجام دے پاتیں۔ لہذا ایک دن ان کی سہولت کیلئے ہم بازار سے " رہنمائے پکوان " نامی ایک کتاب لے آئے تاکہ وہ آرام سے کتاب بھی پڑھ سکیں اور ساتھ میں پکوان بھی ہوتا رہے۔ تعلیم کی تعلیم اور پکوان کا پکوان۔ انہوں نے اس کتاب کی مدد سے جو پہلا سالن بنایا وہ " اروی کا خلیہ " تھا۔ ہم میں آج تک اروی کے اس خلیہ کے ذائقہ کو بیان کرنے کی ہمت پیدا نہیں ہوئی۔ ہم نے جیسے ہی اسے منہ میں رکھا سارے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ بے اختیار فائر بریگیڈ کے عملہ کو

بلانے کو جی چاہا کیونکہ اس سالن میں مرچ اتنی زیادہ تھی کہ ہماری آنکھیں تو باہر نکل آئیں ۔ دوسری طرف ہماری اہلیہ کا بھی یہی حال تھا ۔ گویا دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی ۔ یاد پڑتا ہے کہ ہماری اہلیہ سے ہمارا پہلا جھگڑا بھی اسی بات پر ہوا تھا ۔ سالن کے اس حملہ سے جب ہم دونوں ذرا سنبھلے تو ہماری اہلیہ نے " رہنمائے پکوان " والی کتاب نکالی ۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ جہاں سالن میں ایک چمچہ مرچ ڈالنے کی ہدایت درج تھی وہاں کاتب نے 1 کے ہندسے سے پہلے فل اسٹاپ، کچھ اس طرح لگایا تھا کہ یہ ہندسہ " 10- پڑھا جاتا تھا ۔ سو انہوں نے مرچ کے دس چمچے سالن میں ڈال دیئے ۔کتابی علم ایسا ہی ہوتا ہے ۔ اس پر ہماری بیوی نے کہا " جب تمہارے مضامین میں جگہ جگہ کتابت کی غلطیاں ہوجاتی ہیں بلکہ تم مصنف کی غلطی کو بھی کاتب کی غلطی ہی بتاتے ہو تو ایسے میں اگر مجھ سے پکوان میں کتابت کی غلطی ہوگئی تو اس میں اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے " ۔
چونکہ ہماری اہلیہ کی بات معقول تھی اس لئے ہم نے پاؤ کیلو شکر کھا کر کتابت کی اس غلطی کو جیسے تیسے برداشت کرلیا ۔ بعد میں ہم نے پھر کبھی اپنی بیوی سے نہ تو ذائقہ دار پکوان کی توقع رکھی اور نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی گلہ کیا کیونکہ سمجھدار شوہر وہی ہوتا ہے جو پکوان کی خوبیاں اپنی بیوی میں نہیں بلکہ دوسروں کی بیویوں میں تلاش کرتا ہے ۔ ہمارے ایک عزیز ترین دوست تھے جو ملک پیٹ میں رہتے تھے (اب امریکہ میں مقیم ہیں) ۔ ایک دن ہم نے ان کے ہاں کھانا کھایا تو احساس ہوا کہ ایسا لذیذ کھانا ہم نے زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا ۔ ہم نے لگاتار اپنی انگلیوں کو چاٹتے ہوئے ذائقہ کی تعریف کی تو ہمارے دوست کی اہلیہ یعنی ہماری بھابی نے باورچی خانہ میں سے پکار کر کہا " بھائی جان ! آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس گھر میں میرے پکوان کی تعریف کی ہے ورنہ آپ کے دوست کو تو اسکی توفیق ہی عطا نہیں ہوتی ۔ ہمیشہ کام میں مصروف رہتے ہیں " (افسوس کہ ہماری یہ بھابی اب اس دنیا میں نہیں ہیں ۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔ ان کے امریکہ جانے سے پہلے جب تک ہم حیدرآباد میں رہے کھانا اکثر ان کے گھر ہی کھاتے تھے ۔ خدا اچھے لوگوں کو لمبی عمریں بھی تو نہیں دیتا) ۔ ان کا پکوان یقیناً

قابل تعریف ہوتا تھا لیکن ہمیں چونکہ مشاعروں وغیرہ میں شعرا کے کلام پر داد دینے کی مہارت حاصل ہوگئی تھی اس لئے یہ حربہ ہم ان کے پکوان کی تعریف کے سلسلہ میں بھی اختیار کرتے تھے ۔ ہم جب بھی ان کے پکوان کی داد دیتے تو ایک اچھی شاعرہ کی طرح بڑی شائستگی کے ساتھ سلام کر کے کہتیں "آپ کی ذائقہ شناسی، پکوان فہمی اور مطبخ پروری کا شکریہ" بعض اوقات تو ہمارے منہ سے "مرحبا" "سبحان اللہ" "ماشاء اللہ" جیسے الفاظ بھی ادا ہو جاتے تھے ۔ بسا اوقات تو مکرّر ارشاد کہہ کر یہ کھانا دوبارہ بھی کھاجاتے تھے ۔ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی کلیجی کی ڈش کھا کر ایک دن تو ہم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "آپ نے تو کلیجی کے اس سالن میں کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے" ۔ ایسی باتیں سن کر بہت خوش ہوتیں ۔ ایک بار تو حد ہوگئی کہ ہمارے دوست ملک پیٹ والے مکان سے حمایت نگر کے ایک گھر میں منتقل ہوگئے ۔ منتقلی سے پہلے ہمارے دوست نے جب اپنے نئے مکان کا پتہ ہمیں سمجھانے کی کوشش کی تو ہم نے انہیں منع کیا کہ "بھیا! ہم خود پکوان کی خوشبو سونگھتے ہوئے تمہارے گھر آجائیں گے پتہ سمجھانے کی ضرورت نہیں" آپ یقین کریں یا نہ کریں دوسرے دن ہم سچ مچ ان کے گھر پہنچ گئے ۔ جب کہ ہمارے دوست کی بیوی نے ہم سے کہا بھی کہ انہوں نے تو نئے گھر میں آنے کے بعد کوئی چیز نہیں پکائی ہے ۔ پھر بھی ہم نے ان کے نئے مکان کا پتہ ڈھونڈ لیا ۔ اس پر ہم نے کہا تھا کہ "پچھلے مکان میں جو کھانا پکا کر آپ اپنے ساتھ لے آئی ہیں اس کی خوشبو سے تو سالم حمایت نگر ، بریانی کی دیگ اور بگھارے بینگن کی پتیلی میں تبدیل ہوچکا ہے" ۔ اس داد کے بعد تو پکوان فہمی اور ذائقہ شناسی کے معاملہ میں ہماری حیثیت مسلّمہ ہوگئی ۔

ہمیں آج پکوان اور پکوان کی خوشبو کی یاد یوں آگئی کہ پچھلے دنوں ہم مختصر قیام کے لیے حیدرآباد گئے اور حسبِ معمول "سیاست" کے دفتر پہنچے تو ہمیں بے ساختہ اپنی مرحومہ بھابی کی یاد آگئی کیونکہ پورا دفتر "سیاست" انواع و اقسام کے کھانوں سے مہک رہا تھا ۔ پتہ چلا کہ گرانڈ کاکتیہ ہوٹل کے تعاون سے حیدرآبادی خواتین کو نئے نئے پکوان سکھانے کیلئے ایک ورکشاپ منعقد کیا جارہا ہے ۔

ڈھائی سو سے زائد خواتین اور طالبات ، مشہور ماہرین پکوان سے نت نئے کھانے بنانا سیکھ رہی تھیں ، پنکھوں کے چلنے کے باوجود گرمی کا وہ عالم تھا کہ لگتا تھا خود ساری خواتین کسی بند برتن میں ہلکی ہلکی آنچ پر دم دیئے جانے کے لئے رکھی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے انہماک میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا ۔ لگتا تھا سب کی سب پکوان کے ذریعہ اپنے شوہروں یا اپنے والدین کو قابو میں رکھنے کے منصوبے بنا کر آئی ہیں ۔ ماہرین پکوان اپنے سروں پر قطب مینار کی وضع کی ٹوپیاں پہنے کھانا بنانے میں مصروف تھے ۔ گرانڈ کاکتیہ ہوٹل کے مشیر جاوید اکبر ہر کھانے کی تفصیل بتا رہے تھے ۔ ان ہی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ باورچی قطب مینار کی طرح کی ٹوپیاں کیوں پہنتے ہیں اور اپنے گلے کے اطراف اسکارف کیوں باندھتے ہیں ۔ انہوں نے بتایا کہ ٹوپیاں اس لئے پہنی جاتی ہیں کہ سر کے بال کھانے میں نہ گرنے پائیں اور اسکارف اس لئے باندھا جاتا ہے کہ سالن میں پسینہ کے قطرے نہ گریں ۔ اس وضاحت سے ہماری ایک پرانی غلط فہمی دور ہوگئی ورنہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ماہر باورچی گھر جاتے وقت ان ٹوپیوں میں چوری چھپے پیاز آلو ، بینگن ، گوبھی ، بھنڈی وغیرہ رکھ کر لیجاتے ہیں ۔ توبہ توبہ ہم کتنی سنگین غلط فہمی میں مبتلا تھے (باورچی حضرات ہمیں معاف کریں ، کیا کریں ہر آدمی اپنے ظرف کے حساب سے سوچتا ہے) ہم نے اب دہلی واپس آکر اپنی بیوی سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ کھانا پکاتے وقت ایسی ہی لمبی ٹوپی استعمال کریں ، اونچی ایڑی کی سینڈل پہننے سے قد اتنا نہیں بڑھ سکتا جتنا کہ ٹوپی پہننے سے بڑھ جاتا ہے ۔ ایسا مشورہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری اہلیہ کے جو بال کسی زمانے میں ہمارے کوٹ کے کالروں پر پائے جاتے تھے اب ٹماٹے کے کٹ ، بینگن کے بھرتے اور ماش کی دال وغیرہ میں ملا کرتے ہیں ۔ البتہ اسکارف باندھنے کے لیے وہ بالکل تیار نہیں ہیں کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ کھانے میں مناسب "نمکینی" پسینہ کے قطروں کی وجہ سے ہی پیدا ہوتی ہے ۔ پھر نمک کی بچت الگ ہوجاتی ہے ۔

بہرحال لگاتار چار دنوں تک ہم جب بھی "سیاست" گئے تو یوں لگا جیسے ہم

اپنے کپڑوں میں" بریانی کا عطر" "بج کباب کا سینٹ" اور "خوبانی کے میٹھے کی خوشبو" لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب نے تو ہمارے کان سے "شمامۃ العنبر" میں ڈبوئے ہوئے روئی کے پھائے کو نکال کر پوچھا "یہ تم نے بگھارے بینگن کا پھایا کہاں سے حاصل کیا ہے"۔ زاہد علی خان ایڈیٹر "سیاست" تو ہمیں کھانوں کے مقابلہ کا "جی لارڈ" یعنی فاضل جج بھی بنانا چاہتے تھے اور ہم اپنے آپ کو اس کا اہل بھی سمجھتے تھے لیکن ماہر امراض شکم ڈاکٹر حبیب اللہ مانع آگئے۔ پکوان کے سلسلہ میں ہم نے جو جوش و خروش حیدرآباد کی خواتین میں دیکھا وہ حیرت ناک تھا۔ صبح سے شام تک خواتین جوق در جوق دفتر "سیاست" پر چلی آرہی تھیں۔ دفتر "سیاست" کے سامنے ہمیں ایک پرانے دوست بھی مل گئے۔ ہم نے پوچھا "کیا آپ کی بیٹی بھی پکوان کے ورکشاپ میں حصہ لے رہی ہے؟" بولے "اصل میں میرا بیٹا امریکہ میں ہے اس کے لیے کسی سلیقہ مند اور سگھڑ لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ اگر کوئی ایسی لڑکی مل جائے جو خود بھی اچھی ہو اور پکوان میں بھی ماہر ہو تو رشتہ کی بات بڑھاوں۔ اسی آس میں یہاں کھڑا ہوں"

ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر شمیم جیراجپوری نے بڑے پتے کی بات کہی کہ حیدرآباد اردو کی شیرینی اور اپنے لذیذ کھانوں کے لئے ساری دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ گویا انھوں نے اردو میں پکوان اور پکوان میں اردو کو ملا کر ایک ایسی "ڈش" تیار کی ہے جس پر حیدرآبادیوں کو ناز کرنا چاہیے۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پکوان ایک عظیم فن ہے اور یہی وہ عظیم فن ہے جس کی خاطر ہمارے ماضی کے کئی حکمران اپنی "سلطنتوں" سے محروم ہوگئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب مغرب کے سائنس دان نئے نئے آلات حرب تیار کر رہے تھے اور نت نئے سائنسی تجربے کر رہے تھے تو سلاطین اودھ کے مطبخوں میں پچاس قسم کی بریانیاں بنانے کے تجربے زور و شور سے جاری تھے۔ آخری مغل حکمرانوں کے "مطبخوں" میں انواع و اقسام کے کباب، فیرنیاں، قورمے، پلاؤ وغیرہ تیار کئے جارہے تھے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ پکوان کے چونچلوں کی وجہ سے ہمارا ملک غلام ہوا تھا مگر اردو کی مدد سے پھر یہ

آزاد بھی ہوگیا تھا۔ اب اگر اردو اور پکوان کے درمیان ایک حسین امتزاج پیدا کیا جاتا ہے تو یقیناً ہمارے کردار کا ذائقہ پھر سے تبدیل ہو جائے گا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس "عظیم فن" کو نئے پس منظر میں ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ (۳۱ / مئی ۱۹۹۸ء)

قصہ ایک ہم شکل کا

بعض اوقات کچھ ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں کہ ان واقعات کے پیش آجانے کے باوجود آپ لوگوں کو یہ یقین نہیں دلا سکتے کہ یہ واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔

پچھلے دنوں میں بذریعہ ٹرین دلی سے حیدرآباد جارہا تھا۔ ایک حیدرآبادی دوست بھی میرے ہم سفر تھے۔ ناگپور کے اسٹیشن پر گاڑی کچھ دیر تک ٹھہرتی ہے۔ ہم دونوں سفر کی بوریت کو ختم کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر اترے تو اچانک ایک شخص بڑی گرم جوشی کے ساتھ میری طرف آیا اور مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا "یار دیپک سکسینہ کیسے ہو؟ کہاں جارہے ہو؟" ۔ میں نے کہا "حیدرآباد جارہا ہوں" پوچھا "تو کیا اب حیدرآباد میں بھی تم نے اپنا بزنس شروع کردیا ہے؟" میں نے کہا "شروع تو نہیں کیا ہے۔ شروع کرنے کی سوچ رہا ہوں۔" کہنے لگا "بہت اچھا خیال ہے۔ یہ بتاؤ گھر پر سب کیسے ہیں؟" میں نے کہا "سب اچھے ہیں۔ مہندر انجینئرنگ کرنے کے بعد باہر چلا گیا ہے۔ سریتا اپنی سسرال میں خوش ہے۔ ویریندر کے بارے میں تو تم جانتے ہوگے کہ اس نے اب پلاسٹک کی چیزیں بنانے کا اپنا ایک کارخانہ کھول لیا ہے۔" اس شخص نے کہا "اچھا مجھے پتہ نہیں تھا اتنا بڑا ہوگیا ہے۔ وہ ذہین پہلے ہی سے تھا۔ کاروبار میں تم سے یقیناً آگے جائے گا"۔

میں نے کہا "بس تمہارا آشیرواد چاہیے" ۔

پھر اس شخص نے پوچھا "اور بھابی کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا "بھگوان کی کرپا سے بالکل اچھی ہیں۔ وہ جو اپنے الٰہ آباد کے مشہور وید جی ہیں نا۔ ان کے علاج سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔ جوڑوں کا درد بالکل غائب ہے"۔

اس شخص نے حیرت سے کہا۔ اچھا تو وید جی اب تک زندہ ہیں۔ بہت بوڑھے ہوگئے ہوں گے۔ کیا اسی پرانے مکان میں رہتے ہیں؟"۔ میں نے کہا ہاں وہی گھاس منڈی والے مکان میں رہتے ہیں۔" بولا۔ اچھا کیا تم نے بتادیا۔ انھیں خط لکھتا ہوں۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا ہوں۔ حیدرآباد سے الہ آباد کب واپس جاؤ گے؟" میں نے کہا۔ ایک ہفتہ میں واپس ہو جاؤں گا۔"

بولا۔ یار تمہاری دکان کی مٹھائیاں اور نمکین چیزیں بہت یاد آتی ہیں۔ کئی برس ہوگئے الہ آباد آئے ہوئے۔ اب کے آؤں گا تو ضرور ملوں گا اور ہاں تمہیں یاد ہوگا کہ الہ آباد سے چلتے وقت میں نے تم سے سو روپے ادھار لئے تھے۔ پورے چھ سات برس بیت گئے۔ ہمیشہ خیال آیا تمھیں منی آرڈر کردوں لیکن فرصت ہی نہیں ملی۔ اب رکھ لو"۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیا۔ میں نے پوچھا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم ناگپور میں کیا کررہے ہو۔ اپنا پتہ تو دو"۔ اس اثنا میں ٹرین نے چلنے کی تیاری شروع کردی۔ اس شخص نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیا اور ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ الہ آباد کی صحبتیں بہت یاد آتی ہیں۔ سارے دوستوں کو میری طرف سے پوچھنا اور بھابی کو نمستے کہنا۔ بچوں کو پیار اور ہاں حیدرآباد سے واپس ہوتے وقت دو ایک دن ناگپور میں رک جاؤ۔ اب میرے حالات اچھے ہوگئے ہیں۔ پہلے کی سی بات نہیں رہی"۔

گاڑی آگے کو نکل گئی اور وہ بڑی دیر تک پلیٹ فارم پر ہاتھ ہلاتا رہ گیا۔ جب ہم ڈبہ میں واپس ہوئے تو میرے حیدرآبادی دوست نے کہا۔ "بھئی کمال ہے۔ تم تو عملی مذاق بھی خوب کرلیتے ہو۔ یہ تم بھی سے دیپک سکسینہ بن گئے۔ یہ الہ آباد۔ یہ گھاس منڈی اور پر بھاکر دویدی۔ یہ سب کیا ہے۔ اور یہ تمھارا بیٹا مہندر کہاں سے آگیا اور یہ دیویندر نے پلاسٹک کا کارخانہ کب کھول لیا۔ اور ہاں بھابی تو کبھی جوڑوں کے درد میں مبتلا نہیں ہوئیں"۔ میں نے ہنس کر کہا "اس شخص سے سو روپے لینے کے لئے یہ ضروری تھا"۔ میرے دوست نے کہا۔ "مگر تم نے تو اسے کبھی سو روپے نہیں دیئے تھے"۔ میں نے کہا۔ "مگر دیپک

سکسینہ نے تو دیئے تھے"۔ میرے دوست نے پوچھا "کیا مذاق کرتے ہو۔ کون ہے یہ دیپک سکسینہ؟"۔ میں نے کہا "وہی جو الہ آباد میں رہتا ہے۔ رانی منڈی میں اس کی کنفکشنری کی دکان ہے اور جس کی بیوی جوڑوں کے درد کی مریض ہے"۔ میرے دوست نے کہا "تب تو یہ سو روپے اس دیپک سکسینہ کے ہوئے تم نے کیوں وصول کرلیے"۔ میں نے کہا "اور وہ جو میرے مزاحیہ مضامین کی داد ہر ایک سے وصول کرتا رہتا ہے تو یہ داد کس کھاتے میں جائے گی۔"

میرے دوست نے جھنجھلا کر کہا "یار یہ معمہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کھل کر تو بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے!"

اور میں نے جو بات اپنے حیدرآبادی دوست کو بتائی وہ اب آپ سب کو بھی بتائے دیتا ہوں۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ آج سے سات آٹھ برس پہلے میں دلی کے کناٹ پلیس کی ریگل بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا کہ ایک شخص نے اچانک پیچھے سے میرے پیٹھ پر ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا "ابے دیپک سکسینہ تو یہاں کیا کررہا ہے؟ کب آیا الہ آباد سے؟" میں نے اپنی پیٹھ کو سہلاتے ہوئے کہا "معاف کیجئے۔ میں دیپک سکسینہ نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"۔ وہ شخص بولا "ابے لفنگے! مجھ سے مذاق کرتا ہے۔ بچپن کا دوست اور مجھے "آپ" کہہ کے شرمندہ کررہا ہے۔ اچھا یہ تو بتا کب آیا الہ آباد سے؟"

میں نے قدرے بلند آواز میں اس سے کہا "دیکھیئے جناب۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں دیپک سکسینہ نہیں ہوں اور نہ ہی الہ آباد سے میرا تعلق ہے۔ خواہ مخواہ میرا وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ۔ اس پر وہ شخص بپھر گیا اور غصہ سے بولا "اب میں سمجھا کہ تو کس بات پر خفا ہے۔ یہی نا کہ میں نے تیری دکان سے ڈھائی تین سو روپیوں کی مٹھائی ادھار لی تھی۔ یہ لے پانچ سو روپے اور رکھ اپنی جیب میں۔ تیری پائی پائی چکا دونگا۔ تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ بہت دنوں سے الہ آباد نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تیرے پیسے ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تو پیسے کے لئے اتنا گرجائے گا۔ آج سے تیری میری دوستی ختم"۔ اس شخص نے غصہ سے پانچ سو روپیوں کا نوٹ میرے

شرٹ میں ٹھونس دیا اور میرے منع کرنے کے باوجود آگے کو نکل گیا۔

اس واقعہ کے بعد بہت دنوں تک وہ پانچ سو روپے میری جیب میں پڑے رہے۔ چار برس پہلے کسی ادبی محفل کے سلسلہ میں مجھے لکھنو جانا پڑا۔ لکھنو ریڈیو اسٹیشن کے دو چار دوستوں کے ساتھ میں امین آباد پارک سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک صاحب نے پیچھے سے پکارا "بھئی دیپک سکسینہ! کیسے ہو یار؟۔ دیکھ کر بھی انجان بنے چلے جارہے ہو۔ مٹھائیاں اچھی بناتے ہو تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ پرانے دوستوں کو بھی بھول جاؤ"۔ دیپک سکسینہ کا نام سن کر مجھے اچانک کناٹ پلیس والا واقعہ یاد آگیا۔ قبل اس کے کہ میں اس کی غلط فہمی دور کرتا میرے ریڈیو کے دوستوں نے اس سے کہا "معاف کیجئے۔ یہ دیپک سکسینہ نہیں مجتبیٰ حسین ہیں۔ دلی سے آئے ہیں"۔ مگر میں نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے اس شخص سے کہا۔ "حضور ان کی باتوں میں نہ آیئے۔ میں ہی دیپک سکسینہ ہوں الہ آباد والا۔ آپ نے میری دوکان سے جو مٹھائی لی تھی اس کے پیسے اب تک نہیں دیئے۔ میں آپ کو کیسے نہیں پہچانوں گا"۔

اس پر اس شخص نے ندامت سے کہا۔ "ہاں بھئی دیپک ابھی پچھلے مہینے تو تم نے سو روپے کی مٹھائی ادھار دی تھی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اگلے ہفتے الہ آباد آرہا ہوں۔ پیسے دے دونگا"۔

تب میں نے اس شخص پر اپنی اصلیت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا "حضور! مجھے اس دیپک سکسینہ کا ذرا پتہ بتایئے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ کیسا آدمی ہے کہ ہر ایک کو ادھار مٹھائی دے دیتا ہے اور پھر بھی اس کا کاروبار چل رہا ہے"۔

بہر حال میں نے اس شخص سے دیپک سکسینہ کا پورا پتہ حاصل کیا۔ اتفاق سے اس واقعہ کے پورے ایک سال بعد ایک ادبی محفل کے سلسلہ میں الہ آباد جانا پڑگیا تو میں دیپک سکسینہ کی کنفکشنری کی دکان پر گیا۔ دیپک سکسینہ کو دور سے دیکھا تو یوں لگا جیسے میں خود دکان پر بیٹھا ہوا مٹھائیاں بیچ رہا ہوں۔ جیسے ہی میں اس کی دکان پر گیا دیپک سکسینہ نے مجھے ایک نظر دیکھا۔ پھر زور سے بولا "السلام علیکم مجتبیٰ صاحب! کب آئے آپ دلی سے الہ آباد؟ مجھے یقین تھا کہ آپ

ایک نہ ایک دن میری دکان پر ضرور آئیں گے " ۔ میں نے کہا " یار دیپک سکسینہ تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا ؟ "

بولا " کمال کرتے ہیں آپ بھی ۔ جیسے آپ کو میرا نام معلوم ہوگیا ویسے ہی مجھے بھی آپ کا نام معلوم ہوگیا ۔ دو ایک بار دلی گیا تو جگہ جگہ لوگوں نے مجھے ۔ مجتبیٰ حسین " سمجھ کر پکڑ لیا ۔ آپ کے ایک دوست نے تو مجھے بے پناہ گالیاں بھی دیں کہ رات کھانے کی دعوت پر آنے کا وعدہ کر کے میں ان کے ہاں نہیں پہنچا ۔ "

دیپک سکسینہ سچ مچ میرا ہم شکل تھا ۔ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش تھا ۔ مجھے خوش خوش اپنے گھر لے گیا ۔ بیوی بچوں سے ملایا ۔ شام کو مجھے الہٰ آباد کی ایک ادبی محفل میں شرکت کرنی تھی ۔ سو میں نے دیپک سکسینہ کو بھی ادبی محفل میں شرکت کی دعوت دے دی ۔ کسی وجہ سے میں ادبی محفل میں دیر سے پہنچا تو دیکھا کہ ادبی محفل کے منتظمین اسے زبردستی پکڑ کر ڈائس پر بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے بروقت بیچ بچاؤ کیا ورنہ اس دن دیپک سکسینہ کو پتہ چلتا کہ ہوٹنگ کس کو کہتے ہیں ۔

منتظمین بھی ہم دونوں کی مشابہت پر پریشان تھے ۔

بہر حال جب میں الہٰ آباد سے دلی واپس جانے لگا تو دیپک سکسینہ میرے لئے مٹھائی کے کئی ڈبے لے کر آگیا ۔ میں نے اس کے کناٹ پلیس والے دوست کے دیئے ہوئے پانچ سو روپے دینے کی کوشش کی تو دیپک نے کہا ۔ " مجتبیٰ صاحب ! آپ بھی کمال کرتے ہیں ۔ آپ کی تصویریں ہندی رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں ۔ ٹیلی ویژن پر بھی آپ اکثر آتے رہتے ہیں ۔ آپ کو کیا پتہ کہ میں نے آپ کے مزاحیہ مضامین کی جتنی داد وصول کی ہے اس کے آگے ان پانچ سو روپیوں کی کیا حیثیت ہے ۔ انھیں اپنے پاس ہی رکھئے " ۔

میں نے پوچھا ۔ " دیپک سکسینہ یہ سب تمھیں کیسا لگتا ہے " ۔

بولا " بہت اچھا لگتا ہے ۔ لیکن کبھی کبھی اس ملک میں جب فرقہ وارانہ دنگے ہونے لگتے ہیں تو میں آپ کے تعلق سے تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں ۔ "

میں نے کہا " دیپک ! تم میرے لئے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہو اس

بات کی مجھے خوشی اور اطمینان ہے ۔ مجھے اور کیا چاہیے ۔ مگر مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے ۔ حالانکہ تمہارا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے لیکن لوگوں کو ادھار میں مٹھائی تو نہ دیا کرو " ۔ بولا ۔ "مجتبیٰ صاحب ۔ آپ بھی تو لوگوں کو ادھار میں ہنساتے رہتے ہیں ۔ یہ سماج آپ کی باتوں پر ہنس تو لیتا ہے لیکن اس کی قیمت آپ کو کہاں ادا کرتا ہے ۔"

سکینہ کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے میں مٹھائی فروش ہوں اور وہ مزاح نگار ہے ۔

(مارچ ۱۹۹۵ء)

ذکر پھر ملّے بلّی کا

(قارئین کرام : آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال ہمیں اچانک فریضہ حج کی ادائیگی کے سلسلہ میں سعودی عرب جانے کی سعادت حاصل ہوئی تھی ۔ ہمارا جانا کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ایک عرصہ تک ہمیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ ہمارے جانے سے پہلے وطن عزیز میں ہمارے اطراف کیا ہورہا تھا ۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد جب ہمیں مدینہ جانے کا موقعہ ملا اور ایک رات یاد الٰہی سے ذرا سی فرصت جو ملی تو یاد آیا کہ ہمارے نکلنے سے ذرا پہلے روزنامہ " سیاست " میں جیلانی بانو کا مضمون " ملّے بلّی / ملّا بلّی " شائع ہوا تھا ۔ اور اس پر لوگوں کے تبصرے اور خطوط شائع ہورہے تھے ۔ اس ذرا سی فرصت سے فائدہ اٹھا کر ہم نے بھی مدینہ کے اوبرائے ہوٹل میں بیٹھ کر " ملّے بلّی " کے بارے میں اظہار خیال کرنے کی غرض سے ایک کالم لکھا تھا ۔ واپسی کے وقت ہم نے اپنا سامان سفر جو باندھا تو یہ کالم کھجوروں کے پیکٹوں ، تسبیحوں ، جانمازوں ، اور سونے کی دو ایک زنجیروں کے نیچے کچھ ایسا دب گیا کہ تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکا ۔ اتفاق سے پچھلے دنوں کھجور کے ایک آخری پیکٹ کے نیچے سے یہ کالم اچانک برآمد ہوگیا تو سوچا کہ کیوں نہ اس کالم کو اپنے قارئین کی خدمت میں تبرکاً پیش کردیا جائے ۔ یوں بھی یہ کالم ملّے بلّی کے بارے میں کم اور دبیرپورہ اور یاقوت پورہ کے بارے میں زیادہ ہے کیونکہ سعودی عرب میں ہم ایک ایسی صالح ، سچی اور پاکباز زندگی گزار رہے تھے کہ طبیعت خود بخود طاقتور کے خلاف کمزور کے حق میں ، ظالم کے خلاف مظلوم کے حق میں ، زبردست کے خلاف زیردست کے حق میں آواز بلند کرنے کی طرف مائل تھی ۔ اس کالم کا مطالعہ آپ ہماری اسی کیفیت کی روشنی میں

کریں ۔ اگرچہ یہ کالم دیر سے شائع ہورہا ہے لیکن ہوگی اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت) ۔

صاحبو! سفرحج پر روانہ ہونے سے ذرا پہلے ہم نے روزنامہ "سیاست" میں محترمہ جیلانی بانو کا مضمون "ملے پلّی / ملا پلّی" پڑھا تھا ۔ مضمون اچھا تھا جس کا واحد مقصد ہمیں تو یہ نظر آیا تھا کہ بعض شخصیتوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا جائے کہ ملے پلّی حیدرآباد کا سب سے مردم خیز محلّہ رہا ہے اور یہ کہ آج چہار دانگ عالم میں حیدرآباد کی جو کچھ بھی شہرت ہے وہ ملے پلّی کی وجہ سے ہی ہے ۔ بخدا ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ ملے پلّی میں مشہور و معروف ہستیاں آباد رہی ہیں ۔ (جیلانی بانو خود اپنے مشہور و معروف شوہر ڈاکٹر انور معظم کے ساتھ ابتدا ہی سے ملے پلّی میں رہتی آئی ہیں ۔ ملے پلّی کی مردم خیزی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے) لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ حیدرآباد کے دیگر محلوں میں جو لوگ رہتے ہیں یا رہتے آئے ہیں وہ نہایت غیر معروف قسم کے لوگ ہیں۔ خیر وہ دن ضرور آئے گا جب دبیر پورہ اور یاقوت پورہ کی تاریخ بھی از سر نو لکھی جائے گی جس میں اور شخصیتوں کے علاوہ خود ہمارا نام بھی سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ قدرت کے پاس دیر تو ہے لیکن اندھیر نہیں ہے ۔ پھر اس کی لاٹھی میں آواز بھی تو نہیں ہے ۔ اسی بے آواز لاٹھی سے جب یونان، مصر اور روم کا نام مٹ گیا تو ملے پلّی کس شمار میں ہے ۔ ہم جیسوں کا وقت بھی ایک دن ضرور آئے گا۔ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے ۔ مردم خیزی کے معاملہ میں دبیر پورہ اور یاقوت پورہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اپنے علاوہ اپنے محلّہ کی دیگر مشہور و معروف ہستیوں کے نام یاد کرنے کی کوشش کی تو دو چار مشہور و معروف پہلوانوں کے نام سب سے پہلے یاد آئے ۔ احتراماً ہم ان کے نام یہاں نہیں لکھیں گے کیونکہ ان کے ورثاء اب تک حیات ہیں اور فن پہلوانی سے ان کا تعلق ہنوز برقرار ہے ۔ پھر وہ ہمارے پڑوسی بھی ہیں اور ایسے پڑوسی ہیں کہ ہمارے معاملات میں ہم سے زیادہ دخیل نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں کسی نے ہماری مزاح نگاری پر یونہی اعتراض کیا تو ہمارے ایسے

ہی ایک پڑوسی نے اپنی جیب سے چاقو نکال لیا تھا اور معترض پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ چاقو کی طاقت قلم سے زیادہ ہوتی ہے ۔ خدا ہر ایک کو ایسے سخن فہم اور بے لوث مداح اور پڑوسی عطا کرے (آمین) اس قصہ کو جانے دیجئے۔ بہر حال جس طرح ان دنوں ٹلے پلی سے بڑی شخصیتوں کا تعلق اب کھینچ تان کر پیدا کیا جارہا ہے ایسا تعلق تو ہمارے محلہ سے بھی بعض معروف ہستیوں کا جوڑا جاسکتا ہے ۔ ہم نے سعودی عرب میں "سیاست" کے جتنے بھی شمارے دیکھے ان میں ٹلے پلی کا ذکر ضرور پڑھا ۔ لوگ جوق در جوق اظہار خیال کئے جارہے ہیں کہ بھیا ، ہمارا تعلق بھی ٹلے پلی سے ہے ۔ خدارا ہمیں نہ بھولئے ۔ ہر حال قدردان ہمیں بھی آواز دے کر طلب کرلیجئے ۔ ایک صاحب نے تو جدہ میں ہم سے یہاں تک کہا تھا کہ آج سے پچیس سال پہلے جب ان کے خسر صاحب نے گھر دامادی کے عہدہ سے برطرف کر کے انھیں اپنے گھر سے نکال دیا تھا تو وہ بھی ایک مہینہ کی مدت تک ٹلے پلی میں مقیم رہے تھے ۔ اب وہ بھی ٹلے پلی کے سلسلہ میں اپنا ذکر سننے کے خواہشمند ہیں ۔ حالانکہ اس معاملہ میں ہمیں ٹلے پلی کی خوبی کم اور ان کے خسر صاحب کی خوبی زیادہ نظر آتی ہے ۔ ہم شخصی طور پر علاقہ واریت کو اتنا بُرا بھی نہیں سمجھتے لیکن علاقہ واریت اگر تین چار کیلو میٹر کے رقبہ میں ہی محدود ہو کر رہ جائے تو یہ بھی اچھی بات نہیں ہے ۔ ہمیں تو ٹلے پلی کی علاقائی عصبیت دنیا کی سب سے سنگین علاقائی عصبیت نظر آنے لگی ہے ۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ جس طرح علٰحدہ تلنگانہ کی تحریک چل رہی ہے اسی طرح علاحدہ ٹلے پلی کی تحریک بھی چلنی چاہئے ۔ دنیا کا رقبہ لاکھوں مربع کیلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے لیکن آپ جان بوجھ کر تین چار کیلو میٹر کے رقبہ کے اندر ہی دنیا کی ساری اچھائیاں ڈھونڈنے پر اتر آئیں تو یہ بھی زیادتی ہے ۔

بہر حال ٹلے پلی کے بارے میں جیلانی بانو کے مضمون کا کچھ ایسا اثر ہوا ہے کہ اب ہر کس و ناکس بڑا آدمی بننے کی کوشش میں ٹلے پلی سے اپنا رشتہ قائم کرنے میں لگا ہوا ہے ۔ اس بات سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے کہ ٹلے پلی نے یقیناً بڑی نامی گرامی ہستیاں پیدا کی ہیں ۔ ہر پیشہ کے ماہر کا تعلق اس محلہ سے

رہا ہے۔ ثبوت اس بات کا یہ ہے کہ آج سے تیس پینتیس برس پہلے زندگی میں پہلی بار ہماری جو جیب کٹی تھی وہ اسی محلہ میں کٹی تھی۔ اگرچہ اس وقت بھی ہماری جیب میں کوئی خاص رقم نہیں تھی لیکن جیب تو بہرحال کٹی تھی۔ اگر خدانخواستہ جیب میں رقم ہوتی تو ہم اس سے ضرور ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ ہماری اوّلین نوجوانی کے زیادہ تر دن اسی محلہ میں گزرے تھے۔ جیلانی بانو نے اپنے مضمون میں ہمارے ایک دوست حفیظ قیصر کا بھی ذکر کیا ہے جو ٹلے پلی کے آرائش بارہ کے 100 نمبر والے مکان میں رہتے تھے۔ ہمارا وہاں آنا جانا بہت تھا اور پھر اتفاق یوں ہوا کہ حفیظ قیصر کے گھر سے نکلتے ہی۔ کچھ دور چلتے ہی۔ رستہ میں ہمیں ایک ایسا گھر نظر آگیا تھا کہ ٹلے پلی کی گلیوں میں ہمارا آنا جانا خاصا بڑھ گیا تھا۔ ہماری جوانی کی بعض اچھی شامیں ان ہی گلیوں میں کھو گئیں۔ خیر ہم یہاں ان باتوں کی تفصیل میں نہیں جائیں گے کیونکہ ہم اب ان ہی شاموں کی معافی مانگنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ غرض اس اعتبار سے بھی ٹلے پلی سے ہمارا ایک خوبصورت تعلق بن جاتا ہے۔ جیلانی بانو نے اپنے مضمون میں یہ ذکر بھی کیا ہے کہ شمالی ہند سے جو لوگ ہجرت کر کے حیدرآباد آتے تھے وہ زیادہ تر ٹلے پلی میں ہی آباد ہو جاتے تھے۔ دیکھا جائے تو اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے لوگ نہایت کاہل الوجود اور آرام طلب واقع ہوئے تھے یعنی یہ لوگ شمالی ہند سے ہجرت کر کے ناپلی اسٹیشن تک تو آجاتے تھے لیکن وہاں پہنچتے ہی ان کا ذوق سفر اچانک کمزور پڑجاتا تھا اور وہ ناپلی اسٹیشن سے دو ایک کیلومیٹر پیدل کر کے ٹلے پلی میں آجاتے تھے اور وہاں اپنا سامان رکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کو یہ توفیق عطا نہیں ہوتی تھی کہ ناپلی اسٹیشن سے نکل کر فلک نما ہی چلے جاتے یا سعید آباد یا مشیر آباد میں جاکر آباد ہو جاتے۔

مضمون میں جہاں ٹلے پلی کی دیگر اچھائیوں کا ذکر ہوا ہے وہاں اس بات کا کہیں ذکر نہیں ہوا کہ ٹلے پلی جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں ایک گندہ نالہ بھی بہتا ہے۔ (غالباً اب بھی بہتا ہوگا) ہمارے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں تو نہایت آن بان کے ساتھ بہتا تھا۔

میرا کام

ایک بار برسات کے دنوں میں اس گندہ نالے میں طغیانی آگئی تھی۔ نتیجہ میں دو دنوں تک ہمیں ملّے پلّی میں ہی رکنا پڑا تھا۔ یادش بخیر! اس گندہ نالہ کا پانی کئی گھروں میں آگیا تھا اور ہمارے ایک شاعر دوست نے رو رو کر ہمیں اپنی بپتا سنائی تھی کہ ان کا سارا غیر مطبوعہ کلام اس گندہ نالہ میں بہہ گیا تھا۔ اس پر ہم نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا تھا " اگر آپ پہلے ہی اپنے غیر مطبوعہ کلام کو گندہ نالے میں ڈال دیتے تو گندہ نالے کو کئی معصوم لوگوں کے گھروں کو برباد کر کے آپ کے غیر مطبوعہ کلام تک آنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑتی "۔ یہ گندہ نالہ بھی ملّے پلّی کا ایک حصہ رہا ہے اور اس کا ذکر بھی مضمون میں ہونا چاہئے تھا۔

خدارا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملّے پلّی سے ہمیں کوئی بیر ہے۔ ہم تو بس اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ حیدرآباد کے دوسرے محلّوں میں بھی نامی گرامی لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یاقوت پورہ اور دبیر پورہ نے بھلے ہی نامی گرامی پہلوان پیدا کئے ہوں لیکن ہم جیسے ادیب بھی تو پیدا کیئے ہیں۔ یوں بھی جہاد زندگانی میں یقین محکم عمل پیہم • محبت فاتح عالم والی شمشیریں ہی کام نہیں آتیں بلکہ کبھی اصلی شمشیروں کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک زمانہ میں دبیر پورہ میں ہمارے کالج کے زمانہ کے دوست اور افسانہ نگار اکرام جاوید بھی رہا کرتے تھے جن کی بسیار نویسی کا یہ عالم تھا کہ رات کو سونے سے پہلے وہ اپنے کسی نئے افسانے کی ابتدائی چند سطریں تو لکھ دیتے تھے لیکن صبح اٹھ کر مسودہ پر نظر ڈالتے تو پتہ چلتا تھا کہ افسانہ نے راتوں رات اپنے آپ کو مکمل کرلیا ہے۔ چنانچہ ہم نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ افسانہ لکھنے کے لئے قلم کار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف ایک قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ قلم جاندار رہے تو وہ افسانہ کو اپنے طور پر لکھ لیتا ہے۔ اکرام جاوید اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر افسانہ میں ان کی لکھی ہوئی صرف چند سطریں ہوتی ہیں۔ باقی کا افسانہ نہ جانے کون لکھ جاتا ہے۔ اصل میں پورے افسانے کو لکھتے تو وہی تھے لیکن ظاہر یہ کرنا چاہتے تھے کہ افسانہ لکھتے وقت ان پر کچھ ایسی عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ انہیں پتہ نہیں چلتا کہ وہ افسانہ لکھ رہے ہیں یا افسانہ انہیں لکھ رہا ہے۔ غرض وہ اتنا ڈوب کر لکھتے تھے کہ بعد

میں خود تو باہر آجاتے تھے لیکن افسانہ ضرور ڈوب جاتا تھا۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حیدرآباد کے دیگر محلوں نے بھی مشہور و معروف لوگ پیدا کئے ہیں۔ یہ اجارہ داری صرف تلے پلی کی نہیں ہے۔ ہمیں تو اس وقت اپنے قدیم محلہ سے دلچسپی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ کوئی صاحب دبیر پورہ اور یاقوت پورہ کے نامی گرامی لوگوں کے بارے میں بھی کچھ لکھیں تاکہ اب جو لوگ فیشن کے طور پر زبردستی تلے پلی میں پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس کا سدِ باب ہو سکے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دبیر پورہ اور یاقوت پورہ کا ذکر آئے گا تو ہمارا ذکر بھی ضرور ہوگا۔ کہا جاپان کا ڈر ہے۔ کہا جاپان تو ہوگا والا معاملہ ہے۔

(۱۰ اگست ۱۹۹۷ء)

ہمارے گھر پر چھاپہ

کل رات ہم نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ۔ اس خواب کی تفصیل آپ کو بھی سنائے دیتے ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

ہم رات کے پچھلے پہر اپنے کمرہ میں گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہماری بیوی نے ہمیں جگاتے ہوئے کہا " ذرا سنئے ۔ دیکھیے تو سہی ہمارے گھر چھاپہ مارنے والے آگئے ہیں ۔" ہم نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا " ان سے کہو معاف کریں اور آگے جائیں "

بیوی نے کہا " آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ۔ یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو معاف کر دیتے ہیں ۔ یہ تو چھاپہ مارنے والے ہیں ۔ ان کا معافی سے کیا تعلق ؟ "

ہم نے ایک اور کروٹ بدلتے ہوئے کہا " کونسے چھاپہ مارنے والے ؟ ان دنوں چھاپہ مارنے والے بھی کئی قسم کے ہوگئے ہیں ۔ انکم ٹیکس کے چھاپہ مار ۔ سی بی آئی کے چھاپہ مار ۔ انفورسمنٹ ڈائرکٹوریٹ ۔ کمرشیل ٹیکس اور نہ جانے کس کس کے چھاپہ مار ۔ پہلے پتہ تو کرو کہ کس ڈپارٹمنٹ سے آئے ہیں "

ہماری بیوی نے کہا " تم خود جاکر پوچھ لو ۔ میں پوچھونگی تو کہیں واپس نہ چلے جائیں ۔ مجھے تو صورت سے یہ چھاپہ مارنے والے کم اور ...... "

اس وقت تک ہم نیند کے خمار سے نکل آئے تھے ۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے گھر پیچ چھاپہ مارنے والے آئے ہیں تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا ہم نے بیگم سے کہا " میں نہ کہتا تھا ایک دن ہمارا شمار بھی بڑے آدمیوں میں ہوگا ۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ آج اس نے ہمیں یہ اعزاز بخشا ہے ۔ اگرچہ لکشمی کبھی ہمارے گھر نہیں آئی لیکن چھاپہ مارنے والے تو آگئے ہیں ۔ تم جلدی جلدی ان سارے احباب اور

رشتہ داروں کو اس خوش خبری کی اطلاع دیدو جو ہمیں دیکھ دیکھ کر بلا وجہ حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ انھیں مزید جلانے کا اس سے بہتر کوئی اور موقعہ نہیں ہو سکتا۔" بیگم نے کہا "کیسے اطلاع دوں۔ ٹیلی فون کا بل بروقت ادا نہ کرنے کی وجہ سے آج ہی تو ہمارا ٹیلی فون کٹا ہے۔ کتنی بار تم سے کہا کہ ہمارے ٹیلی فون کا یوں بار بار کٹ جانا اچھا نہیں۔ کوئی بھی ایمرجنسی آسکتی ہے۔"

ہم نے کہا "تم پڑوسی کے ہاں جا کر ٹیلی فون کرو۔ میں اتنی دیر میں چھاپہ مارنے والوں سے نمٹتا ہوں"

ہم دیوان خانہ میں آئے تو دیکھا کہ چار پانچ اصحاب دیوان خانہ کی ہر چیز کو نہایت غور سے دیکھ رہے ہیں اور دیکھنے سے زیادہ انھیں پرکھ رہے ہیں ان کے افسر اعلیٰ نے ہم سے کہا "معاف کیجیے ہم آپ کے گھر چھاپہ مارنے کے لئے آئے ہیں"

ہم نے کہا "زہے نصیب۔ ضرور چھاپہ ماریے۔ ہمیں تو آپ ہی کا انتظار تھا۔"
افسر نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو ہماری آمد کا پہلے ہی سے پتہ تھا"

ہم نے کہا "آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اگر آپ کی آمد کا پہلے سے پتہ ہوتا تو ہم آپ کو یوں سوتے ہوئے ملتے۔ ہم تو آپ کے خیر مقدم کے لئے گھر پر چراغاں کرتے اور گلی کے نکڑ پر ایک خیر مقدمی کمان تو کھڑی کر دیتے۔"

افسر اعلیٰ: "دیکھیے مذاق بند کیجیے۔ پہلے ہم آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں"

ہم: "ضرور لیجیے مگر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ پہلے چائے وغیرہ تو پیجیے۔ ہم نے اپنے کچھ صحافی دوستوں اور فوٹو گرافروں کو فون پر اطلاع دینے کے لئے کہا ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں آجائیں۔ وہ آجائیں تو تلاشی شروع کر دیجیے۔"

افسر اعلیٰ: "آپ نے صحافیوں اور فوٹو گرافروں کو کیوں بلایا۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ لوگ تو چھاپے کی اطلاع کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

ہم: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے گھر چھاپہ پڑے اور اس کی اطلاع اخباروں میں نہ آئے۔ پھر چھاپہ روز روز تو پڑنے سے رہا۔ اخبار والے آجائیں تو ذرا مزہ آجائے گا۔ ہمارے گھر سے اگر کوئی چیز نہ بھی ملے تو اخبار والے اپنی خبریں نکال لیں گے۔ اس طرح ہماری عزت اور احترام میں اضافہ ہوگا۔"

چھاپہ مار ٹیم کا افسر ہم سے یہ بات چیت کر ہی رہا تھا کہ اچانک کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹیم کے ایک کارندے نے ہماری وہ لاقیمت اور بے مثال دیواری گھڑی گرادی ہے۔ جو ہمیں اپنے والد سے اور ہمارے والد کو ان کے والد سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہ گھڑی فرانس کے ایک گھڑی ساز نے 1857ء میں اس وقت تیار کی تھی جب ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی لڑی جارہی تھی۔ ہمارے پاس یہ گھڑی پچھلے پچاس برسوں سے تھی۔ اس سے پہلے یہ ہمارے والد کے پاس تھی۔ ان کا بیان تھا کہ ان کے پاس یہ گھڑی کبھی نہیں چلی۔ لگ بھگ سو برس سے یہ گھڑی دس بج کر پینتیس منٹ بجارہی تھی۔ یہ پتہ نہیں تھا کہ دن کے دس بج کر پینتیس منٹ بجارہی تھی یا رات کے۔ البتہ مشہور یہ تھا کہ جس وقت ہمارے دادا کا انتقال ہوا تھا عین اس وقت ہمارے ایک تایا نے اس گھڑی کو چلنے سے روک دیا تھا۔ گویا پچھلے سو برس سے وہ ہمارے اہل خاندان کو ہمارے دادا کے مرنے کا وقت بتارہی تھی۔ ہمارے والد صاحب کہا کرتے تھے کہ بھلے ہی یہ گھڑی نہ چلے لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ دن میں دو دفعہ بالکل صحیح وقت بتاتی ہے۔ دیگر گھڑیوں کی طرح بالکل نہیں تھی جو دن کے کسی بھی وقت میں صحیح وقت نہیں بتاتیں۔ تاہم اس گھڑی میں ہم وقت نہیں دیکھتے تھے بلکہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو ڈھونڈتے تھے۔ جیسے ہی یہ دیواری گھڑی گری ہمارے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ہم نے کارندے کو جاکر پکڑا کہ میاں جب تک اس گھڑی کا معاوضہ ہمیں ادا نہیں کیا جاتا تب تک ہم تمہیں کسی اور چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیں گے اور مزید تلاشی کی اجازت نہیں دیں گے۔ افسر اعلی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "آپ اطمینان رکھیں آپ کو اس گھڑی کا معاوضہ مل جائے گا۔"

ہم نے کہا "مگر معاوضہ کیا ہوگا۔ پہلے یہ تو طے کیجئے۔"

افسر اعلی نے گھڑی کے ٹوٹے ہوئے پرزوں کا جائزہ لینے کے بعد کہا "آپ کو اس کے پچاس روپے مل جائیں گے۔"

ہم نے چیخ کر کہا "کیا کہا پچاس روپے۔ بھائی صاحب میں اس گھڑی کے پچاس لاکھ روپے سے کم نہیں لونگا۔ آپ نے اس گھڑی کو کیا سمجھا ہے۔ ہمارے باپ دادا

کی نشانی ہے ۔ جس فرانسیسی کاریگر نے یہ گھڑی بنائی تھی اگر اس کے اہل خاندان کو اس گھڑی کا پتہ چل جائے تو وہ کروڑوں روپیوں میں اسے ہم سے خرید لیں گے ۔" ہم یہ بحث کر ہی رہے تھے کہ کچھ صحافی حضرات اور فوٹو گرافر وہاں آگئے ۔ ہم نے انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا اور بتایا کہ اس قدیم گھڑی کے دام پر ہم میں اور چھاپہ مارنے والوں میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا ہے ۔ وہ ہمیں پچاس روپے دینا چاہتے ہیں اور ہم اس کے پچاس لاکھ سے کم نہیں لینا چاہتے ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک جہاندیدہ صحافی نے اس گھڑی کے ٹوٹے ہوئے کل پرزوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا کہ اس کا دام آسانی سے ایک کروڑ روپئے بھی تعین کیا جاسکتا ہے لیکن جب تم نے پچاس لاکھ روپئے طے، کردیا ہے تو چلو یہی سہی ۔ اس گھڑی کی قیمت اس کے کل پرزوں سے نہیں بلکہ اس کی عمر سے لگائی جانی چاہئے ۔ بھلے ہی وہ بیسویں صدی میں ایک منٹ کے لئے نہیں چلی لیکن اس نے پوری ایک پرآشوب صدی کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے ۔ اس گھڑی سے تمھارے ارکان خاندان کا جو جذباتی رشتہ ہے وہ ایسا بیش قیمت ہے کہ اس کا معاوضہ تو کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا ۔ پھر بھی تم نے کہہ دیا ہے تو پچاس لاکھ روپئے لے کر معاملہ کو رفع دفع کرو ۔

اس استدلال کے بعد افسر اعلیٰ نے اپنی ٹیم کے کارندوں سے کہا کہ وہ چھاپہ مارنے کی مہم روک دیں ۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں ۔ ہم نے چھاپہ مارنے والوں کے یہ تیور دیکھے تو کہا " حضور آپ کو اب چھاپہ تو مارنا ہی پڑے گا ۔ اب تو صحافی اور فوٹو گرافر بھی آچکے ہیں ۔ ہم آپ کو یوں جانے نہیں دیں گے ۔ پھر آپ کی ٹیم نے تو ابھی اس گراموفون کو نہیں دیکھا ہے جو ہمیں اپنے نانا کی طرف سے ورثہ میں ملا ہے ۔ بخدا ایسا تاریخی اور یادگار گراموفون ہے کہ آپ اسے دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے ۔ کچھ لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ یہ گراموفون اس وقت کا بنا ہوا ہے جب ابھی سائنسدانوں نے خود گراموفون ایجاد نہیں کیا تھا ۔ اگر خدا کرے یہ کسی طرح ٹوٹ جائے تو ہمارے خاندان کو کم سے کم ایک کروڑ روپئے ضرور دلا سکتا ہے ۔ ہماری بات کو سن کر افسر اعلیٰ نے پہلے تو ہم سے یہ پتہ کیا کہ گراموفون مذکور کہاں رکھا ہے ۔ اور جب اس کے محل وقوع کا پتہ چل گیا تو اس نے اپنے

کارندوں سے کہا کہ " خبردار، جو کوئی اس گراموفون کے قریب گیا تو ۔ یہ ایک عجیب وغریب گھر ہے کہ یہاں ٹوٹنے سے پہلے کسی چیز کا دام تو پچاس روپئے ہوتا ہے۔ لیکن یہی جب ٹوٹ جائے تو اس کا دام پچاس لاکھ ہو جاتا ہے ۔ لہذا چھاپہ مارنا بند کرو ۔ :"

ہمارے بچوں نے کہا " یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ چھاپہ نہ ماریں آپ کو چھاپہ تو مارنا ہی پڑے گا۔ ہم تو کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں " ایک بچہ نے کہا " میرا ایک بال پن پچھلے ایک ہفتہ سے غائب ہے ۔ آپ کو تلاشی میں ملے تو واپس کر دینا " ہماری بیوی نے کہا " اور ہاں ۔ ہماری پوتی کی ایک انگوٹھی کہیں گر گئی ہے ۔ بہت تلاش کیا لیکن پتہ نہیں چلا۔ آپ لوگ تو ماہر ہیں آپ کو یہ انگوٹھی ملے تو ضرور دیدیں " ہم نے کہا " ہماری بھی بعض ضروری چیزیں غائب ہیں ۔ یہ فہرست ہم آپ کو بعد میں دیں گے ۔ لیکن پہلے وہ دیواری گھڑی کا معاوضہ طے ہو جائے ۔"

ہماری بات معقول تھی اس لئے ہمارے صحافی دوستوں نے بھی اصرار کرنا شروع کر دیا کہ جب تک دیواری گھڑی کی قیمت طے نہیں ہو جاتی جب تک چھاپہ مار ٹیم کو یہاں سے جانے نہ دیا جائے ۔ اس کے ساتھ ہی چھاپہ مار ٹیم کے ارکان نے بھاگنا شروع کر دیا ۔ دوسرے دن اخباروں میں ہمارے گھر پر چھاپہ کی تفصیلی خبریں شائع ہوئیں ۔ جگہ جگہ ہمارے چرچے ہونے لگے اور لوگ ہمیں مبارکباد دینے لگے کہ اس چھاپہ کے عوض انکم ٹیکس والے تمہیں پچاس لاکھ روپئے ادا کر رہے ہیں ۔ ایسا تاریخی چھاپہ آج تک کہیں نہیں پڑا ہو گا۔ اس کے بعد اچانک ہماری آنکھ کھل گئی ۔ دیکھا تو دور دور تک کسی کا نام و نشان تک نہیں تھا ۔ ہم نے بیوی سے پوچھا " چھاپہ مارنے والے کہاں چلے گئے ؟ " بیوی نے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا " کوئی خواب دیکھا ہے کیا ؟ کیسا چھاپہ اور کہاں کا چھاپہ ؟ ۔ ابھی میں نے تمہارے پرس پر چھاپہ مارا تھا صرف دو روپئے نکلے ۔ یہ منہ اور مسور کی دال " اور یہ سن کر ہم اپنی آنکھیں ملنے میں مصروف ہو گئے ۔

(۱۹۹۶ء)

ملک کی پہلی مسلم گریجویٹ خاتون

اردو کے ممتاز شاعر اور نقاد راشد آذر (جو راشد علی خان کے نام سے کم پہچانے جاتے ہیں) ہمارے ان دوستوں میں سے ہیں جن کی عام معلومات نہایت اچھی اور خاص معلومات خاصی کمزور ہیں ۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ موصوف نہایت پڑھے لکھے آدمی ہیں اور ایک اچھے پڑھے لکھے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ ساری دنیا کے بارے میں تو سب کچھ جانتا ہے ، لیکن اپنے ہی گھر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ۔ راشد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ بھی میر تقی میر کی طرح کسی عام آدمی سے پہلے تو بات نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے ۔ علم برائے علم کے ایسے زبردست قایل ہیں کہ وکالت کا امتحان کامیاب کرنے کے باوجود کبھی پریکٹس نہیں کی ۔ کچھ حاسدوں کا کہنا ہے کہ چونکہ ان کی وکالت بالکل نہیں چلی اسی لئے اپنی قانون کی تعلیم کو " علم برائے علم " کے کھاتے میں ڈال کر مطمئن ہو گئے ہیں ۔

تین مہینے پہلے کی بات ہے ۔ ہم نے دہلی سے فون کر کے انہیں کہا " راشد ! ہم تم سے تین سوالات پوچھنا چاہتے ہیں ۔ ذرا جلدی سے ان کے جواب دے دو " ۔

بولے " پوچھو پوچھو " ۔

ہم نے پوچھا " یہ بتاؤ ملک کی پہلی مسلم گریجویٹ خاتون کون تھیں ؟ "

ہنس کر بولے " کیا میں کسی یونیورسٹی کا رجسٹرار ہوں جو ایسے سوال کا جواب جاننے لگوں ۔ دوسرا سوال پوچھو " ۔

ہم نے پوچھا " حیدرآباد کے محبوبیہ گرلز اسکول کی بانی کون تھیں ؟ "

پھر ہنس کر بولے " یہ سوال بھی کسی ماہر تعلیم سے پوچھ لینا ۔ اب تیسرا سوال

پوچھو"۔

ہم نے پوچھا "حیدرآباد کے لیڈی حیدری کلب کو کس نے قائم کیا تھا؟"۔
قدرے خفگی کے ساتھ بولے "میاں یہ تمہیں آج صبح صبح کیا ہوگیا ہے۔ ایسے غیر ضروری سوالات کے جوابات جاننے کے لئے دلی سے ٹرنک کال کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔

ہم نے کہا "میاں راشد! ان سوالات کے جوابات جاننا کم از کم تمہارے لئے تو نہایت ضروری ہے کیونکہ ان تینوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے طیبہ بیگم بلگرامی جو تمہاری اپنی نانی تھیں"۔

پوچھا "تمہیں کیسے معلوم؟"۔

ہم نے کہا "ویسے تو ہم بھی اپنی نانی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اصل قصّہ یہ ہے کہ دلی میں ہمارے ایک دوست ہیں منگل سنگھ آزاد۔ ٹیلی ویژن کے لئے ڈاکومنٹری فلمیں اور سیریلیس بناتے ہیں۔ کل رات پریس کلب میں ملے تھے تو یہی سوالات انہوں نے ہم سے پوچھے تھے۔ جب ہم نے لاعلمی ظاہر کی تو بولے "ان خاتون کا تعلق حیدرآباد سے رہا ہے۔ حیرت ہے کہ تم حیدرآبادی ہو اور تمہیں یہ بات نہیں معلوم ہے۔ علی یاور جنگ طیبہ بیگم کے بیٹے اور آندھرا پردیش کی پہلی خاتون وزیر معصومہ بیگم ان کی بیٹی تھیں"۔ ان کے کہنے پر ہمیں یاد آیا کہ تم علی یاور جنگ کے بھانجے اور معصومہ بیگم کے بیٹے ہو۔ اسی لئے ان کے بارے میں ہم تم سے یہ سوالات پوچھ رہے ہیں۔ ہمارے حیدرآبادی ہونے کے باوجود حیدرآباد کی ایک باکمال خاتون کے بارے میں کچھ نہ جاننے کا ہمیں افسوس تو ہے ہی لیکن یہ بھی کچھ کم افسوس کی بات نہیں ہے کہ تم طیبہ بلگرامی کے نواسے ہو، اوپر سے حیدرآبادی بھی ہو اور تم ان کے بارے میں یہ باتیں نہیں جانتے"۔

قدرے جھینپ کر بولے "پیارے بھتیجی! تم تو جانتے ہو کہ زمانہ، محنت کی تقسیم کا ہے۔ ہم بھائیوں نے زمانہ سے متعلق کاموں کو آپس میں بانٹ لیا ہے۔ میرے بڑے بھائی شاہد علی خان چونکہ دور اندیش آدمی ہیں اور مستقبل کے

بارے میں سوچتے رہتے ہیں اس لئے مستقبل کے کام انہیں سونپے گئے ہیں۔ میں چونکہ لمحہ موجود میں رہنے کا قائل ہوں اس لئے زمانہ حال کے معاملات میرے ذمہ ہیں۔ رہی زمانہ ماضی کی بات تو ہم نے اس سے متعلق سارے کام اپنے بھائی آصف علی خان کے سپرد کر رکھے ہیں جو میری نانی کا قائم کردہ ایک اسکول اب بھی چلاتے ہیں اور ان کے پاس اب بھی اس زمانہ کی بہت سی دستاویزات موجود ہیں"۔

ہم نے راشد کو دلاسہ دیا کہ میاں اس معاملہ میں کوئی لمبی چوڑی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آج کل سعادت مند اولاد کا یہی وتیرہ ہے۔

یہ کہہ کر ہم نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ سارا قصہ صرف اتنا ہے کہ ہمارے دوست ایم ایس آزاد دور درشن کے لئے "پہل" کے عنوان کے تحت ان خواتین کے بارے میں ایک ڈاکو مینٹری سیریل بنا رہے ہیں جنہوں نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں پہل کی تھی۔ چونکہ طیبہ بیگم بلگرامی غیر منقسم ہندوستان کی پہلی مسلم گریجویٹ خاتون تھیں اور ان کا تعلق حیدرآباد سے رہ چکا ہے اس لئے انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم اس معاملہ میں ان کی مدد کرنے میں پہل کریں۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ ہم اس سیریل کی تیاری کے سلسلہ میں حیدرآباد آئے تھے اور راشد کے بڑے بھائی آصف علی خان کی وجہ سے ہماری معلومات میں خاصہ اضافہ ہوا۔

طیبہ بیگم نواب عماد الملک کی صاحبزادی اور نواب خدیو جنگ کی اہلیہ تھیں۔ ویسے تو یہ اتر پردیش کے چھوٹے سے قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئیں۔ لوگوں نے تو یہاں تک مشہور کر رکھا ہے کہ بلگرام اصل میں سابق ریاست حیدرآباد کا ہی حصہ تھا جو اتر پردیش میں واقع تھا۔ یہ سچ بھی ہے کیونکہ ہم نے کسی بلگرامی کو خود بلگرام میں رہ کر ترقی کرتے نہیں دیکھا۔ اس کے لئے اس کا حیدرآباد آنا ضروری تھا۔ خود نواب عماد الملک بھی بلگرام سے حیدرآباد آئے تھے۔ طیبہ بیگم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شادی کے پورے سولہ سترہ برس بعد مدراس یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان کامیاب کیا تھا۔ وہ اردو اور انگریزی میں یکساں

قدرت رکھتی تھیں۔ اردو میں انہوں نے دو ناول بھی لکھے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بے شمار مضامین لکھے جن میں سے بعض کا انتخاب بعد میں ان کی بیٹی سکینہ بیگم نے "رسائل طیبہ" کے عنوان سے شائع کیا۔ طیبہ بیگم نے خواتین کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیم کے لئے بے پناہ کام کئے۔ انجمن خواتین کے علاوہ حیدرآباد لیڈیز اسوسی ایشن بھی قائم کی۔ محبوبیہ گرلز اسکول اور لیڈی حیدری کلب کے قیام کے علاوہ انہوں نے غریب لڑکیوں کی مفت تعلیم کے لئے پانچ مدرسے بھی حیدرآباد میں قائم کیے جن میں سے ایک اب بھی موجود ہے۔ 1908ء میں موسیٰ ندی میں جو طغیانی آئی تھی اس سے متاثر ہونے والوں کی بازآبادکاری کے لئے بھی وہ سرگرم عمل رہیں۔ آج سے لگ بھگ ایک سو برس پہلے کے معاشرہ میں اسطرح کی روشن خیال اور فعّال خاتون کا پیدا ہونا خود ایک غیر معمولی بات تھی۔

طیبہ بیگم کے سلسلہ میں معلومات اکٹھا کرتے ہوئے ہمیں احساس ہوا کہ حیدرآباد نے کیسی کیسی باکمال ہستیاں پیدا کی تھیں لیکن آج کی نسل ان کے کارناموں سے بڑی حد تک ناواقف ہے۔ چونکہ وہ محبوبیہ گرلز کالج کے بانیوں میں سے تھیں اس لئے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ محبوبیہ گرلز کالج کی پرنسپل سے اس سلسلہ میں بات کی جائے۔ ہم نے محبوبیہ گرلز کالج کو فون کرکے وہاں کی ایک عہدیدار سے کہا "۔ ہم طیبہ بیگم کے بارے میں آپ سے کچھ جاننا چاہتے ہیں "۔ ارے صاحب یہ سنتے ہی وہ تو خفا ہوگئیں۔ کہنے لگیں "طیبہ بیگم ان دنوں پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں کررہی ہیں۔ دو دنوں سے کالج بھی نہیں آئیں۔ ان کا نتیجہ خراب نکلے گا تو ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے "۔ انہوں نے سمجھا کہ ہم ان کے کالج کی کسی حالیہ طیبہ بیگم کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ جب ہم نے وضاحت کی کہ ہم اس کالج کی بانی طیبہ بیگم کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو انہوں نے اپنی پرنسپل سے فون ملادیا اور جب ہم نے پرنسپل سے بات کی تو موصوفہ نے کہا "مجھے تو پتہ نہیں ہے کہ طیبہ بیگم اس کالج کی بانیوں میں تھیں۔ اس کالج میں اتنے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں اور کام کا اتنا بوجھ ہوتا ہے کہ مجھے تو

اس بات کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ میں اس کے بانیوں کے بارے میں کچھ جان سکوں "۔ ان کے لہجے سے یوں لگا جیسے وہ اس کالج کی بانی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں ۔ بہر حال ہم اپنے دوست ایم ایس آزاد کے شکر گزار ہیں کہ ان کی معرفت ہمیں نہ صرف طیبہ بیگم کے کارناموں کو تفصیل سے جاننے کا موقعہ ملا بلکہ محبوبیہ گرلز کالج کی پرنسپل کو بھی یہ علم ہوسکا کہ طیبہ بیگم اس کالج کی بانی تھیں ۔ یوں تو طیبہ بیگم کے نواسے راشد آذر کی معلومات میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے ۔

(نومبر ۱۹۹۶ء)

ایک مختلف دن

کہتے ہیں ایک صاحب سیر کے ارادہ سے دہلی آئے اور ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ سیر پر نکلنے سے پہلے انھوں نے سوچا کہ ہوٹل میں ملنے والے کھانے کے اوقات کے بارے میں پہلے سے پوچھ لیا جائے تاکہ اسی حساب سے دہلی کی سیر کا پروگرام بنایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ہوٹل کے بیرے کو بلا کر پوچھا "میاں! یہ بتاؤ تمھارے پاس کھانے کے کیا اوقات ہیں؟" بیرے نے کہا "حضور ناشتہ کا وقت تو صبح میں سات بجے سے گیارہ بجے تک، لنچ بارہ بجے سے تین بجے تک، شام کا ناشتہ شام میں چار بجے سے سات بجے تک اور رات کے کھانے کا وقت آٹھ بجے سے بارہ بجے تک ہوتا ہے"۔ اس پر یہ صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے اور بولے "میاں! یہ تو نہایت ناموزوں اور نامعقول اوقات ہیں۔ اگر میرا سارا وقت کھانے میں ہی گزر جائے تو پھر میں دہلی کی سیر کب کروں گا؟"

اگرچہ یہ بڑا پرانا لطیفہ ہے لیکن پچھلے دنوں ہمارے دوست اوتار سنگھ جج نے کسی اور سلسلہ میں یہ لطیفہ پھر سنایا تو ہمیں اچانک محسوس ہوا کہ ہمارے دن کا بہت سا حصہ ایسے ہی فضول کاموں میں خرچ ہو جاتا ہے اور سیر کا پروگرام معلق رہ جاتا ہے۔ دہلی میں رہتے ہوئے ہمیں پچیس برس ہونے کو آئے ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا جسے ہم نے ایسے ہی فضول کاموں میں ضائع نہ کیا ہو۔ ہمارے معمولات پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ فلاں بجے سے فلاں بجے تک سیر کرو۔ پھر فلاں بجے سے فلاں بجے تک شیو، غسل اور ناشتہ سے فارغ ہو جاؤ۔ پھر اخبار لے کر بیٹھ جاؤ کہ دیکھیں ملک کے سیاستدان کیا کر رہے ہیں اور کونسا لیڈر کونسی پارٹی میں جا رہا ہے۔ کتنے لیڈروں نے آج پیشگی ضمانت لے لی۔ کتنے نے کھلے منظر عام پر

آئے ہیں اور کتنے لیڈر پرانے گھپلوں سے باعزت بری ہوگئے ہیں۔ یہی دیکھیے کہ جب حوالہ کیس شروع ہوا تھا تو ہم نہایت اشتیاق سے اخبار پڑھا کرتے تھے۔ حالات ایسے پیدا ہوتے جارہے تھے کہ لگتا تھا حوالہ اور حوالات میں بہت کم فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ لیکن اب پتہ چلاکہ حوالہ کیس کے سارے ملزمین بری ہوگئے۔ ہمیں افسوس ہو رہا ہے کہ ملک کے اخبارات نے منوں اور ٹنوں کاغذاس کیس کی خبروں کو چھاپنے میں ضائع کردیا۔ خود ہماری زندگی کی کئی قیمتی ساعتیں، جنھیں خوشگوار بھی بنایا جاسکتا تھا، اس کیس کی گتھیوں کو سمجھنے میں ضائع ہوگئیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان دنوں اخباروں میں پڑھنے کو ہوتا بھی کیا ہے۔ سیاسی لیڈروں کے گھپلوں کی خبروں سے جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو زنا بالجبر، اغوا، ڈکیتی، قتل و غارتگری کی خبریں آپ کی منتظر ہوتی ہیں۔ خدا بھلا کرے ہماری اہلیہ کا جن سے ہمارے ہزار ہا اختلافات سہی لیکن ان کی ایک بات کے ہم قائل ہیں۔ جب بھی ہم صبح کے وقت بے چینی سے اخبار کا انتظار کرتے ہیں تو ہمیں یہ کہہ کر ٹوکتی ہیں۔ "بری اور منحوس خبروں کو پڑھنے کے لئے تمھاری یہ بے چینی کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ لوگ جس طرح کسی خوشخبری کو سننے کے لئے بے چین رہتے ہیں تم اسی طرح بری خبریں جاننے کے لئے اتاولے ہو جاتے ہو۔ مجھے دیکھو کہ جب سے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے کس قدر مزے میں ہوں"۔ کبھی ہم غلطی سے ان کے ہاتھ سے تازہ اخبار منگواتے ہیں تو بلا مبالغہ اخبار کو چمٹے سے پکڑ کر یوں لے آتی ہیں جیسے اخبار نہ ہوا مرا ہوا چوہا ہو۔ کبھی کبھی تو ناک پر رومال بھی رکھ لیتی ہیں۔ غرض بری خبریں پڑھنا اور بری خبریں پڑھ کر اپنے آپ کو پھر سے بری خبریں پڑھنے کے لئے تیار کرنا یہ ہمارا روز کا معمول ہے۔ لیکن پچھلے ہفتہ ہم نے ایک دن ایسا بھی گزارا جب ہم نے سارے معمولات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ گویا لطیفہ کی روشنی میں کھانے میں اپنا وقت برباد نہیں کیا اور سیر کرتے رہے۔ ہم معمول کے مطابق "چہل قدمی" کرنے کو نکلے تو دیکھا کہ بوندا باندی ہو رہی ہے۔ چنانچہ چہل قدمی کرنے نہیں گئے۔ یہ ہمارا اس دن کا پہلا معمول تھا جو ٹوٹ گیا۔ پھر نو بجے تک اخبار کا انتظار کرتے رہے۔ مگر وہ نہ آیا تو دوسرا معمول بھی ٹوٹ گیا۔ نو بجے کے بعد دودھ والا گھنٹی بجاتا ہے۔ گھنٹی بجی اور ہم نے

میرا کالم

دروازہ کھول دیا تو دیکھا کہ دودھ والے کے بجائے ایک سیلز گرل کھڑی ہے۔ بولی "ایک نیا صابن آیا ہے۔ میں اسے بیچنے کے لئے نکلی ہوں۔ پانچ روپے میں ایک ٹکیہ ہے۔ چار ٹکیاں لینے پر ایک ٹکیہ مفت بھی ملے گی بہت اچھا صابن ہے۔ آپ اس سے نہائیں گے تو دن بھر فرحت کے احساس میں ڈوبے رہیں گے"۔ ہم نے کہا "صابن کی مدد سے اپنے اندر فرحت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش میں اب تک پچاس صابنوں کے برانڈ بدل چکے ہیں۔ ہمیں ایسا صابن اور ایسی فرحت نہیں چاہئے۔ تمہارے پاس کوئی ایسا صابن ہو تو بتاؤ جو بدن کے میل کو دور کرنے کے علاوہ روح کو بھی پاکیزہ بنادے۔ ہم تو اب اپنی روح اور اپنے من کو پاک و صاف کرنا چاہتے ہیں"۔ بولی "آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ جس مقصد کے لئے ہمارے سادھو سنت برسوں جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں آپ وہ مقصد صرف پانچ روپیہ میں حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔ ہم نے کہا "بی بی! آج تو ہمارا سارا معمول ہی چوپٹ ہوتا جارہا ہے۔ اب تم سے بحث کرنے کا وقت بھی نہیں رہا۔ یہ لو بیس روپے اور دے جاؤ صابن کی پانچ ٹکیاں"۔ وہ چلی گئی تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ آج کا دن ہی مختلف ڈھنگ سے گزارا جائے۔ ملک میں جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ سیاستدان چاہے کچھ بھی کریں۔ ادیبوں، فنکاروں اور صحافیوں سے بھی آج ہم نہیں ملیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم اپنے ایک ایسے دوست کے پاس چلے گئے جن سے پچھلے پندرہ برس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ (فون پر البتہ ہر ہفتہ بات ہو جاتی ہے)۔ موصوف غیر شادی شدہ ہیں اور اکیلے رہتے ہیں۔ ان کے آباد اجداد نے اتنی جائداد چھوڑی ہے کہ انھیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ دن بھر موسیقی سنتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ تو فون پر بھی اپنے پسندیدہ گانے اور دھنیں ہمیں سناتے رہتے ہیں۔ موسیقی میں یہ اور خود موسیقی ان میں اتنا ڈوب چکی ہے کہ دونوں کا بیچ کر باہر نکلنا دشوار نظر آتا ہے۔ گویا "فنافی الموسیقی" ہیں۔ دنیا سے اتنے بے خبر ہیں کہ چارلس ڈیگال کو اب تک فرانس کا اور جمال عبدالناصر کو مصر کا صدر سمجھتے ہیں۔ پچھلے تیس پینتیس برسوں سے اخبار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کہتے ہیں اخبار پڑھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے اس میں کیوں نہ میں

روی شنکر کا ستار ہی سن لوں۔ بہر حال ہمارے دوست نے جاتے ہی ہمیں گلے سے لگایا۔ بولے "آج میرا ارادہ چیکو وسکی کی سمفنیاں سننے کا تھا۔ مگر تم آئے ہو تو تمہاری خاطر آج کندن لال سہگل کو سن لیتے ہیں"۔ وہ بات چیت کم کرتے ہیں۔ البتہ موسیقی کی دھنوں کے حساب سے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور حرکات و سکنات میں فرق آنے لگتا ہے۔ بعض دفعہ تو آنکھوں سے آنسو بھی رواں ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھار ایک عجیب و غریب مسکراہٹ ان کے سارے وجود میں پھیل جاتی ہے۔ دن میں گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک ہم کے یل سہگل کو گھول کر کانوں سے پی گئے۔ موسیقی ہمارے سارے وجود میں کچھ اس طرح سما گئی کہ ایک مرحلہ پر ہمارا اپنا ہاتھ غلطی سے خود اپنے ہی زانو پر ذرا زور سے پڑ گیا تو یوں لگا جیسے ہم نے کسی طبلہ پر تھاپ ماری ہو۔ ذرا سی گردن کھجائی تو محسوس ہوا جیسے ہم نے ستار کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔ سہگل کے گانوں کے بیچ ہی ہمارے دوست کے نوکر نے کھانا کھلایا۔ کیا کھلایا یہ یاد نہیں رہا۔ سہگل کے گانے البتہ یاد ہیں اور ان کی معرفت ہمیں اپنی زندگی کے وہ دن اور ان دنوں سے وابستہ وہ باتیں بھی یاد آئیں جو چالیس پینتالیس برس پہلے ہماری زندگی کا معمول تھیں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

شام کے چھے بجے ہم نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے دوست نے پوچھا "کہاں جانا ہے؟" ہم نے کہا "آج سیتا رام کیسری جی کا نتیجہ آنے والا ہے۔ ذرا چل کر دیکھیں کہ کیا ہوا۔" ہمارے دوست نے پوچھا "کون سیتا رام کیسری؟ کیا کرتے ہیں وہ؟ تمہارے دوست ہیں کیا؟ کبھی لے آو انہیں بھی۔ کسی دن انہیں بھی موسیقی سناتے ہیں۔" اور ہم نے دل ہی دل میں سوچا اے کاش کبھی سیتا رام کیسری جی بھی موسیقی سُن لیتے۔ ہمارے دوست نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور کو ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا "ایک مہینہ سے میں کہیں باہر نہیں گیا۔ یہ ڈرائیور یونہی مفت میں تنخواہ لے رہا ہے۔ کم بخت گانے بھی ڈھنگ سے نہیں سنتا۔ تم اسے لے جاؤ۔ جب جی چاہے گاڑی واپس کر دینا" ہم باہر نکلے تو آسمان پر گھن گھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے اور ہمارا جی چاہ رہا تھا کہ سہگل کے

دیپک راگ کے جواب میں راگ ملہار گانے لگیں ۔برسو رے گرج گرج کر برسو۔
ڈرائیور نے پوچھا " صاحب کہاں چلیئے گا ؟ " ۔ ہمارے ذہن میں کئی جگہوں
کا خیال آیا ۔ پریس کلب آف انڈیا ، کناٹ پلیس کا کافی ہاؤس ، بنگالی مارکیٹ
(جہاں ہر شام ادیبوں اور فنکاروں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے) لیکن نہ جانے کیوں ہمارے
منہ سے "انڈیا انٹر نیشنل سنٹر "کا نام نکل گیا جہاں اس شام کوکب دری مرحوم کی یاد
میں " شام غزل " کا پروگرام آراستہ کیا جارہا تھا ۔ غزل کے ابھرتے ہوئے فنکار
سدیپ کا ذکر تو بہت سنا تھا لیکن کبھی اسے گاتے ہوئے نہیں سنا تھا ۔ یوں بھی
غزل اور موسیقی کے سائے میں عرصہ سے ہماری کوئی شام نہیں گزری تھی ۔ وہاں
پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ ہے ۔ ہم ایک نشست پر جا بیٹھے تو دیکھا کہ برابر والی
نشست پر الیکشن کمشنر جی وی جی کرشنا مورتی بھی بیٹھے ہوئے ہیں ۔ ہم نے سوچا
کرشنا مورتی جی بھی خوب آدمی ہیں ، سیتارام کیسری جی کو الیکشن کے بکھیڑے میں
پھنسا کر خود غزل گائیکی کا مزہ لینے کے لیئے یہاں آبیٹھے ہیں ۔ شاید اس دن وہ بھی
ایک مختلف دن گزارنا چاہتے تھے ۔ اس محفل میں دلی کی کریم Cream ہی
نہیں آئی تھی بلکہ آئس کریم بھی موجود تھی ۔ نوجوان فنکار سدیپ نے اپنی آواز کا
جادو جگایا اور سماں باندھ دیا ۔ ، ذوقؔ ، مجازؔ اور فیضؔ کے بعد سدیپ نے مخدوم محی
الدین کی غزل چھیڑدی ۔

پھر بلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے

اس غزل نے ہم پر عجیب و غریب کیفیت طاری کردی کیونکہ یہ وہ غزل تھی جسے
کہنے کے فوری بعد مخدوم نے اسے " سیاست " کے دفتر میں سنایا تھا ۔ اس کے
ابتدائی سامعین میں ہم بھی شامل تھے ۔ وہ دن ، وہ ساعتیں ، وہ حیدرآباد ، وہ چہرے ،
وہ سائے ، وہ گلیاں اور وہ ماحول سب کچھ یاد آیا جو اس غزل کا پس منظر بنے تھے ۔ ان
لمحوں کی باز یافت نے ایک عجیب سی سرشاری ہم پر طاری کردی ۔ بڑی دیر بعد ہم
انڈیا انٹر نیشنل سنٹر سے باہر نکلے تو ہوا میں خنکی تھی اور ایک عجیب سی فرحت ۔ ہر
شئے ہمیں ہلکی پھلکی اور تروتازہ نظر آئی ۔ راستہ میں گاڑی جب سیتارام کیسری جی کے
گھر کے سامنے سے گزری تو دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ ہے ۔ جو زندہ باد کے نعرے لگارہی

ہے ۔ ڈرائیور نے کہا " شاید سیتارام کیسری جی جیت گئے " ۔ ہم نے پوچھا " کون سیتارام کیسری جی ؟ " اس پر ڈرائیور نے ہمیں پلٹ کر غور سے دیکھا ۔ پھر اس نے ہم سے کوئی بات نہیں کی ۔ غرض وہ ایک مختلف دن تھا ۔ اس دن ہماری روح بھی صاف و شفاف ، پاکیزہ ، اجلی اور شبک محسوس ہوئی ۔ ہم نے سوچا کہیں یہ اس صابن سے نہانے کا اثر تو نہیں ہے جو سیلز گرل صبح میں ہمیں دے گئی تھی ۔

(۲۲ / جون ۱۹۹۷ء)

مزاج پُرسی کرنا ایک مشکل فن ہے

بڑا کٹھن ہوتا ہے وہ مرحلہ جب ہمیں کبھی کسی کی مزاج پُرسی کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے ۔ پُرسہ دینا اور مزاج پرسی کرنا یہ دو ہی چیزیں ایسی ہیں جن کا گُر ہمیں آج تک نہ آیا ۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جوں جوں ہماری عمر میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے ہماری زندگی میں ان دونوں کاموں کی گنجائش کچھ زیادہ ہی نکلتی جارہی ہے ۔ یوسفی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ " ایک زمانہ تھا جب محفلوں میں ہمارا تعارف کچھ اس طرح کرایا جاتا تھا کہ فلاں کے بھانجے ہیں اور فلاں کے بھتیجے ہیں ۔ اور اب اس طرح تعارف کرایا جاتا ہے کہ فلاں کے ماموں ، فلاں کے چچا اور فلاں کے نانا ہیں "۔ عمر کی یہ وہ منزل ہوتی ہے جب دنیا سے آدمی کے رشتے ناطے ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگتے ہیں اور وہ اپنے آپ میں سمٹتا چلا جاتا ہے ۔ ادھر ہم جب بھی حیدرآباد جاتے ہیں تو ہمارے دو اہم کام یہی ہوتے ہیں ، مزاج پرسی کرنا اور پُرسہ دینا ۔ پچھلے دنوں ہم حیدرآباد گئے تو چار عدد مزاج پُرسیاں (دو تازہ ، دو پرانی) اور دو عدد پُرسے ہمارا انتظار کررہے تھے ۔ سچ پوچھیے تو پُرسہ دینے میں ہمیں اتنی دشواری پیش نہیں آتی جتنی کہ کسی کی مزاج پُرسی کرنے میں ۔ کیونکہ پُرسہ دیتے وقت آدمی کو اپنے چہرے پر جھوٹ موٹ کی جو غمگینی اور المناکی وغیرہ طاری کرنی پڑتی ہے ویسا چہرہ قدرت نے ہمیں بچپن سے عطا کر رکھا ہے بلکہ اس چہرے کو ساتھ لے کر ہم کسی شادی میں بھی شرکت کے لئے جاتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مبارکباد دینے نہیں بلکہ پُرسہ دینے آئے ہیں ۔ اپنے پیدائشی غمگین چہرے کی وجہ سے پُرسہ تو ہم آسانی سے نمٹا لیتے ہیں لیکن مزاج پُرسی میں ہمیں بڑی تگ و دو اور محنت کرنی پڑتی ہے ۔ ہم حیدرآباد پہنچے تو پتہ چلا کہ

ہمارے دوست ڈاکٹر مغنی تبسم بھی اس بار اپنی مزاج پرسی کروانے کے لیے ہماری آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ مغنی تبسم دوستوں کو یہ نادر موقع ذرا کم ہی فراہم کرتے ہیں۔ کچھ دوست ایسے ہیں جن کی مزاج پرسی ہم پچھلے دو تین برسوں سے لگاتار کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن نہ تو ان کا مزاج ٹھیک ہوا اور نہ ہی ہمارے اندازِ مزاج پرسی میں کوئی فرق آیا۔ ایسی مزاج پرسیاں اب ایک دفتری معمول سا بن گئی ہیں۔ لیکن مغنی تبسم کی مزاج پرسی کرنے کے تصور میں جو کشش تھی وہ ہمیں سب سے پہلے ان کے پاس لے گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ مغنی تبسم اپنی تحریروں میں ادیبوں اور شاعروں وغیرہ کی اکثر مزاج پرسی کرتے رہتے ہیں (دو ایک بار ہماری بھی مزاج پرسی کر چکے ہیں)۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ان کی مزاج پرسی کر کے حساب کو بے باق کردیں۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کے مزاج کو کیا ہوا ہے۔ صرف اتنا پتہ چلا تھا کہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتے اور آدمی عموماً دو ہی صورتوں میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ یا تو مقروض ہو یا بیمار ہو۔ ہم نے ان کی مزاج پرسی کرنے کے معاملہ میں عجلت اس لیے بھی دکھائی کہ کہیں ہمارے جاتے جاتے وہ صحت یاب ہو کر گھر سے نہ نکل جائیں۔ ہم پہنچے تو اسٹول پر اپنی سیدھی ٹانگ رکھے بیٹھے تھے۔ اسٹول چونکہ چھوٹا تھا اس لیے اسٹول اور اپنی ٹانگ دونوں کو "ہم رتبہ اور ہم پلّہ" بنانے کے لیے اسٹول کے پایوں کے نیچے جہاں اصولاً دو اینٹیں ہونی چاہیے تھیں وہاں دو ضخیم سی ڈکشنریاں رکھی ہوئی تھیں (ڈکشنریوں کا ایسا نادر استعمال ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ پروفیسر ہونے کے بھی تو فائدے ہیں) ہم نے اپنے چہرے پر مصنوعی غمگینی طاری کرتے ہوئے گہری تشویش اور تردّد کے ساتھ پوچھا "آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

ہمارے آسان سے سوال کا ہاں یا نہ میں جواب دینے کی بجائے بولے "بھئی! میرا تو ایک ہی مزاج ہے۔ مگر آپ نے یہ جملہ کہہ کر "آپ کے مزاج کیسے ہیں؟" بادی النظر میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرے کوئی دس بارہ مزاج اور بھی ہیں۔ بیمار کا مزاج یا خود مزاج پرسی کرنے والے کا مزاج کتنا ہی

خراب کیوں نہ ہو اسے کم از کم زبان کی غلطی تو نہیں کرنی چاہیے ۔ پھر آپ تو ادیب ہیں ۔ میں تو شدید بخار کی بحرانی کیفیت میں بھی زبان کی غلطی کرنے یا اسے سننے کا روادار نہیں ہوں"

ہم نے کہا " مفتی تبسم! آپ بھی حد کرتے ہیں ۔ آپ کی جان پر بن آئی ہے اور آپ صَرف و نحو کے چکر میں پڑے ہیں ۔"

بولے " کس نے کہا کہ میری جان پر بن آئی ہے ۔ بھلا چنگا ہوں ۔ صرف ایک ٹانگ میں درد ہے ۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ٹانگ میرے سالم مزاج کا حصہ ہے تو یہ سراسر غلطی ہے ۔ یوں بھی ہم جیسوں کے لئے ٹانگوں کا جسم سے جڑے رہنا اتنا ضروری بھی نہیں ہے ۔ ہمیں کونسا رکشا چلانا ہے یا لکڑیاں توڑنی ہیں ۔ ادب میں صرف باتیں بنانا ہے ۔ سو وہ ٹانگوں کی مدد کے بغیر بھی اچھی بن جاتی ہیں ۔"

ان کی باتوں کو سن کر ہم اپنے چہرہ پر سے غمگینی کے آثار کو ہٹانے کی دانستہ کوشش کرنے لگے تو کسی قدر تشویش کے ساتھ ہمارے چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے " یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے ۔ دو مہینوں بعد آپ کو دیکھ رہا ہوں ۔ یہ آپ کی آنکھوں کے نیچے جو حلقے ہیں وہ اتنے سیاہ کیوں ہوگئے ہیں؟ آخر آپ کی صحت کو کیا ہوتا جارہا ہے ؟"

ہم نے کہا " ادھر مہینے بھر سے کھُل کر بھوک نہیں لگتی ۔ راتوں کو نیند بھی ٹھیک سے نہیں آتی " پوچھا " کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا ؟"

عرض کیا " ادب کے ڈاکٹروں سے ہی فرصت نہیں ملتی ۔ طب کے ڈاکٹروں کے پاس جانے کا وقت کہاں سے لاؤں گا ۔"

بولے " یہ آثار اچھے نہیں ہیں ۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے ۔ یوں بھی اردو ادب میں اب نئے ادیبوں کے آنے کا سلسلہ ختم سا ہوتا جارہا ہے البتہ جو ادیب پہلے سے موجود ہیں ان کے جانے کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جارہا ہے ۔ آپ پر احتیاط لازم ہے ۔ اردو ادب کو آپ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں "

ہم نے کہا " یہ اردو ادب کی سراسر ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی ہے کہ وہ اب

بھی ہم سے امیدیں وابستہ کئے بیٹھا ہے۔ ساٹھ برس کے ہونے جارہے ہیں۔ آخر کب تک ہم سے امیدیں وابستہ کی جائیں گی۔"

بولے "اردو ادب کے لئے آپ ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ آپ کی صحت کا یہ حال کب سے ہے؟۔"

اس جملہ سے ہم نے اندازہ لگایا کہ مغنی تبسم بڑی چالاکی کے ساتھ ہم سے اپنی مزاج پرسی کروانے کے بجائے خود ہماری مزاج پرسی کرنے پر اتر آئے ہیں۔ لہذا ہم نے ان کی نیت کو تاڑ کر کہا "اپنی مزاج پرسی کو آپ صرف ادب تک ہی محدود رکھیں تو اچھا ہے۔ ہمارے طبعیٔ مزاج کے بارے میں پرسش کرنے کا ہم نے آج تک کسی کو اختیار نہیں دیا"۔ یہ کہہ کر ہم وہاں سے خالی ہاتھ واپس آگئے اور یوں مغنی تبسم کی مزاج پرسی کرنے کا جو ایک نادر موقع ہمارے ہاتھ آیا تھا وہ بھی جاتا رہا۔

جو لوگ مثالی صحت رکھتے ہیں ان کے دکھ درد کو بھلا کوئی کیا جانے۔ خود ہماری مثال لیجیے کہ آج تک کسی اسپتال میں کسی بھی مرض کے علاج کے لئے شریک نہیں ہوئے۔ لعنت ہے ایسی صحت پر۔ ہمارے کیسے کیسے دوست ہیں۔ جو اسپتال میں مختلف بیماریوں کے بہانے بیسیوں بار شریک ہو کر نازک اندام نرسوں سے اپنی نبضیں پکڑوا چکے ہیں۔ اور ایک ہماری منحوس نبض ہے کہ اگر اسے کسی نے زکام اور نزلہ کی آڑ میں پکڑا بھی تو کس نے؟۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان۔ ڈاکٹر رام پرشاد، اور ڈاکٹر شاہد علی خاں نے۔ افسوس ہوتا ہے کہ ہم تو دوستوں کی مزاج پرسی کرنے کے لئے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور کوئی ہماری مزاج پرسی کرنے کے لئے نہیں آتا۔ پھر ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو مزاج پرسی کروانے کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین تصور کرتے ہیں۔ اس وقت ہمیں اپنے ایک دوست کی یاد آگئی جو سیاسی حلقوں میں بھی خاصی شہرت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک بار وہ بیمار پڑ کر اسپتال میں شریک ہوئے۔ روزانہ سینکڑوں لوگ گلدستے، پھل وغیرہ لے کر ان کی مزاج پرسی کو آتے رہے۔ مزاج پرسی کرنے والوں کی باضابطہ فہرست مرتب ہوتی تھی اور دوسرے دن اخباروں میں ان کے نام یوں

شائع ہوتے تھے جیسے یہ مزاج پرسی نہ کرتے تو ہمارے دوست کا زندہ رہنا محال تھا۔ ایک دن یہ مژدۂ جانفزا بھی آیا کہ خود وزیر اعظم ہندوستان ان کی مزاج پرسی کے لئے قدم رنجہ فرمانا چاہتے ہیں۔ خوشی کے مارے ہمارے دوست کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لیکن برا ہو ڈاکٹروں کا کہ انہوں نے اسی دن انہیں اسپتال سے ڈسچارج کردینے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمارے دوست ایک ایک ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر منت سماجت کرتے رہے کہ مجھے مزید دو دنوں تک اسپتال میں ہی رہنے دیا جائے۔ علاج نہ کرنے کی جتنی بھی فیس ہوسکتی ہے وہ مجھ سے وصول کرلی جائے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وزیر اعظم میری مزاج پرسی نہ کریں اور میں یونہی مفت میں صحت یاب ہو جاؤں۔ مگر اسپتال کے ارباب اختیار کا کہنا تھا کہ وزیر اعظم کے آنے کی صورت میں انہیں سارے اسپتال کی صفائی وغیرہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ یہ اخراجات کون دے گا۔ اور آپ حیرت کریں گے کہ ہمارے دوست نے ازراہ مزاج پرسی ان اخراجات کا بوجھ بھی خوشی خوشی برداشت کیا۔ جیتا کیا نہ کرتا۔ مگر شومیٔ قسمت دیکھئے کہ وزیر اعظم کسی ایمرجنسی میں ایسے الجھے کہ ہمارے دوست کی مزاج پرسی کرنے کے لئے نہ آسکے۔ بالآخر نائب صدر جمہوریہ کی جانب سے ان کی مزاج پرسی کی صورت میں ان کے صحت یاب ہو جانے کا سودا طے کرایا گیا۔ تب کہیں جا کر وہ اسپتال سے نکلے (نکلے نہیں بلکہ نکالے گئے)۔ مگر اب بھی ہم جیسوں سے رازدارانہ انداز میں کہتے ہیں۔ "تم دیکھ لینا ایک دن میں وزیر اعظم سے اپنی مزاج پرسی کرواکے چھوڑوں گا۔ وزیر اعظم مزاج پرسی نہ کریں تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور تم جانتے ہو کہ میں کوئی کام کرنے کا بیڑہ اٹھا لیتا ہوں تو اسے پورا کرکے رہتا ہوں۔"

(۲۸ / نومبر ۱۹۹۳ء)

تھوکنا منع ہے

ممبئی شہر کا انتظامیہ ان دنوں ممبئی کو صاف ستھرا شہر بنانے کی خاطر مختلف تجویزوں پر غور کررہا ہے۔ ان میں سے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جو کوئی بھی آدمی ممبئی کی سڑکوں پر تھوکتا ہوا پایا جائے گا اس پر بھاری جرمانہ عاید کیا جائے گا۔ تجویز تو خیر بہت اچھی ہے لیکن اگر اس تجویز پر سختی سے عمل کیا گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس سے ممبئی میں سیر و سیاحت کے کاروبار پر بُرا اثر پڑجائے گا کیونکہ ممبئی ملک کے ان شہروں میں سے ہے جہاں آدمی صرف فلموں میں کام کرنے کے لئے نہیں آتا بلکہ چوپاٹی اور میرین ڈرائیو کے دلفریب نظاروں کو بھی دیکھنے جاتا ہے۔

یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ تھوکنا اور بسا اوقات تھوکے ہوئے تھوک کو پھر سے چاٹنا ہم ہندوستانیوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جن کے بچے امریکہ میں آباد ہیں۔ بچوں نے انھیں کئی بار امریکہ آنے کی دعوت دی لیکن یہ محض اس خیال سے امریکہ نہیں گئے کہ وہاں تھوکنے اور بے دریغ تھوکنے کی آزادی نہیں ہے۔ جس ملک میں آدمی کو اپنا تھوک اپنے منہ میں ہی رکھنا پڑے وہاں جاکر کوئی کیا کرے۔ ایک دن ہم نے انھیں اس مسئلہ پر منانے کی کوشش کی تو اتنے خفا ہوئے اور کچھ اس زور و شور سے ہم سے بحث کی کہ ہمیں گھر جاکر بڑی دیر تک اپنا چہرا دھونا پڑا۔

ہمارے ایک دوست پہلے تو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ مرنے کے بعد جنت میں جائیں گے اور اوپر سے جنت کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کے مطابق جنت میں جہاں جگہ جگہ دودھ اور شہد کی نہریں ہونگیں۔ انواع و اقسام کے پھلوں کے درخت ہونگے۔ حوریں تو خیر ہونگی ہی۔ وہیں جگہ جگہ نفیس اگالدان بھی

رکھے ہونگے کہ موقعہ آنے پر تھوکنے وغیرہ کی سہولت حاصل رہے ۔ ایک بار ہم نے ان سے کہا کہ میاں ان دنوں دنیا کے حالات اتنے خراب ہوتے جا رہے ہیں اور زندگی اتنی اذیت ناک ہوتی جارہی ہے کہ اگر آدمی مرنے کے بعد دوزخ میں بھی چلا جائے تو وہاں انشاء اللہ خوش رہے گا۔ پھر ہم نے انھیں یہ قصہ بھی سنایا کہ ایک صاحب نے ایک ایسا طریقہ دریافت کیا تھا جس کی مدد سے روحوں سے بات چیت کی جاسکتی تھی۔ ایک خاتون نے ان صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کی روح سے بات چیت کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ کچھ دیر بعد خاتون کے مرحوم شوہر کی روح سے رابطہ قائم ہوگیا اور دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ کچھ اس طرح کی تھی۔

خاتون نے پوچھا "کہیے آپ کیسے ہیں؟ کس حال میں ہیں؟"

شوہر کی روح نے جواب دیا "بہت اچھا ہوں اور بہت مزے میں ہوں"

خاتون نے پھر پوچھا "کیا تم اتنا ہی مزے میں ہو جتنا کہ دنیا میں رہا کرتے تھے"

شوہر نے کہا "بے شک بہت خوش ہوں اور آرام سے ہوں"

خاتون نے پوچھا "اچھا یہ بتایئے۔ جنت کیسی جگہ ہے؟ وہاں اور کیا کیا آرام اور سہولتیں ہیں؟"۔

اس پر شوہر کی روح نے کہا "ڈارلنگ، میں جنت سے کہاں بول رہا ہوں۔ میں تو دوزخ سے بول رہا ہوں"

اتنا سنتے ہی خاتون نے اپنے شوہر کی روح کو طلاق دیدی۔

یہ تو خیر ایک لطیفۂ معترضہ تھا جو اچانک یاد آگیا۔ بات تھوکنے کی عادت اور اس سے متعلق سہولتوں کی ہورہی تھی۔ بعض لوگ ہر جگہ تھوکنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں جہاں یہ عبارت لکھی ہوتی ہے کہ "یہاں تھوکنا منع ہے" وہاں وہاں لوگ سب سے زیادہ تھوکتے ہیں۔ ایک بار ہم نے ایک صاحب کو جو ایسی ہی ایک عبارت کے نیچے تھوکنے میں مصروف تھے ٹوکا تو بولے "قبلہ میں اس عبارت کی تختی پر تھوڑا ہی تھوک رہا ہوں۔ میں تو اس تختی کے نیچے تھوک رہا ہوں۔ کسی کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے"

خدا نے ہر قوم کے ہر فرد کے منہ میں تھوک کا لعاب بننے کی گنجائش فراہم کر رکھی ہے لیکن اسکے باوجود اس نعمت سے جتنا ہم ہندوستانی فائدہ اٹھاتے ہیں اتنا کوئی اور قوم نہیں اٹھا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم کا زیادہ تر وقت تھوک کے لعاب کو اپنے منہ میں پیدا کرنے اور حتی الامکان اس کی ذخیرہ اندوزی کرنے اور پھر جب صورتحال بے قابو ہوجائے تو اس لعاب کو منہ سے باہر نکالنے میں ضائع ہوجاتا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ بعض لوگوں نے تھوکنے اور اس سے متعلق بعض سرگرمیوں کو باضابطہ ایک فن بنادیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض افراد پان کی پیک کو اپنے منہ میں جمع کر کے بات کرنے میں ایسی مہارت حاصل کرلیتے ہیں کہ بے ساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے۔ ایسا آدمی ہمیشہ اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر بات کرتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وہ آپ سے نہیں بلکہ آسمان سے باتیں کررہا ہو۔

اس معاملہ میں بھی ہمارے ایک دوست نے مزید تحقیق کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پان کی پیک کو اپنے منہ میں جمع کر کے صرف اردو زبان میں ہی بات کرسکتے ہیں۔ کسی اور زبان میں نہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ پان کھانا اور اس سے متعلق لوازمات اردو تہذیب کی دین ہیں۔ انھوں نے جب کبھی اس حالت میں انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کی پانی سر سے اونچا ہوتا نظر آیا۔ ایک بار ہم نے جان بوجھ کر اس حالت میں ان سے انگریزی میں بات کی اور نتیجہ میں گھر آکر ہمیں خود اپنے کپڑوں کو دھلوانا پڑا۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو زبان کا صوتی مزاج اور آہنگ ہی کچھ ایسا ہے جو پان کھانے والوں کو ہی راس آتا ہے بلکہ جو آدمی پان نہیں کھاسکتا اسے اردو بولنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اہلِ زبان پان کھاتے اور پان کی پیک کو اگالدان میں انڈیلتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اب ہم انھیں کیا سمجھاتے کہ ایسی ہی باتوں کی وجہ سے تو اردو زبان کی یہ حالت ہوتی جارہی ہے۔ غرض اردو زبان اور تھوکنے کا رشتہ کچھ اتنا پرانا اور اٹوٹ ہے کہ بارہ تیرہ برس پہلے جب ہمیں لندن جانے کا موقعہ ملا اور وہاں کے ہیتھرو ایرپورٹ پر اترے تو یہ دیکھ کر جی خوش ہوگیا کہ وہاں جگہ جگہ اس عبارت کی تختیاں نظر آئیں کہ یہاں تھوکنا

منع ہے ۔ ہم انگریزوں کی رواداری کے قائل ہو گئے کہ وہ اپنے ملک میں بھی اردو کو اس کا جائز مقام دے رہے ہیں ۔ مگر جب بعد میں غور کیا کہ اس عبارت کے علاوہ کسی اور عبارت کی تختی ہیتھرو ایرپورٹ پر اردو میں موجود نہیں ہے تو ہمیں احساس ہوا کہ صرف اردو زبان میں ہی اس عبارت کو لکھوانے کا کیا مقصد ہے اور اس عبارت کا روئے سخن کس کی طرف ہے ۔ برصغیر کو چھوڑ کر ہم نے کسی اور ملک میں انسانوں کو پان کھاتے ہوئے نہیں دیکھا اور تھوکنے کے فن میں برصغیر نے جو ترقی کی ہے اس کا راز اسی پان میں پوشیدہ ہے ۔

جن غیر ملکی اصحاب کو یہ پتہ نہیں ہے کہ پان کھانے کے بعد انسان کے منہ میں پیک کا رنگ لال ہو جاتا ہے وہ تو "لال پیک" کو دیکھ کر پریشان سے ہو جاتے ہیں ۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے ایک غیر ملکی دوست پہلی بار ہندوستان آئے تھے ۔ دو تین دنوں میں انھوں نے یہاں لوگوں کو پان کی پیک کو تھوکتے ہوئے جو دیکھا تو پریشان ہو کر ہم سے کہا "حیرت کی بات ہے کہ اکثر ہندوستانی جگہ جگہ اپنے منہ سے خون تھوکتے رہتے ہیں ۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے ۔ اس بیماری کی روک تھام کیوں نہیں کی جاتی" ۔ تب ہم نے انھیں سمجھایا کہ میاں جسے تم خون سمجھ رہے ہو وہ اصل میں پان کی پیک ہے ۔ بھلا ہم اتنی آسانی سے خون کیسے بہا سکتے ہیں ۔ ہم نے تو اپنی جدو جہد آزادی میں بھی بڑی احتیاط سے خون بہایا تھا ۔ پان کی پیک البتہ دن بھر بہاتے رہتے ہیں ۔ ہمارے کہنے کے بعد موصوف نے خود بھی پان کھایا اور اپنے بل بوتے پر جگہ جگہ تھوکنے کے مظاہرے کئے ۔ چند دن اور ہندوستان میں رہ جاتے تو ہمارے مجلسی آداب بھی ضرور سیکھ لیتے ۔

پان کی پیک کے لیے انواع و اقسام کے جو اگالدان محفلوں میں رکھے جاتے ہیں تو ان سے بھی غیر ملکیوں کو بڑی غلط فہمی ہوتی ہے ۔ ہمارے ایک جاپانی دوست ہمارے ساتھ ایک مشاعرہ میں چلے گئے ۔ سامعین میں ہم دونوں بالکل پیچھے بیٹھے تھے ۔ صدر مشاعرہ کے آگے ایک خوبصورت اگالدان بھی رکھا تھا ۔ انھوں نے صدر مشاعرہ کو دو ایک بار اگالدان کو اپنے منہ تک لیجاتے ہوئے دیکھا تو نہایت راز دارانہ انداز میں ہم سے پوچھا "صدر مشاعرہ کونسے مشروب کا استعمال کر رہے ہیں؟"

تھوکنا منع ہے

اس پر ہم نے تفصیل سے سمجھایا کہ "صدر مشاعرہ اگالدان میں سے مشروب نہیں پی رہے ہیں بلکہ اگالدان میں مشروب کو منتقل کر رہے ہیں" ۔ یہ سن کر ہمارے جاپانی دوست کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ۔ بہر حال تھوکنا اور بر سر عام تھوکنا ہمارا محبوب مشغلہ ہے ۔

بعض افراد نے اسے ایک باضابطہ "کھیل" کا درجہ دیدیا ہے ۔ ہمارے ایک اور دوست ہیں جو پان کی پیک کو بارہ فیٹ کی دوری تک پھینکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس فن میں انھوں نے وہ ید طولیٰ حاصل کیا ہے کہ پیک کا ایک چھینٹا بھی اِدھر اُدھر ہونے نہیں پاتا ۔ ہم نے دیکھا کہ وہ بعض اوقات اپنے احباب کے ساتھ پان کی پیک کو پھینکنے کے مقابلے منعقد کرتے رہتے ہیں ۔ وہ ایک کالونی میں دوسری منزل کے فلیٹ میں رہتے ہیں اور ان کے فلیٹ کے مقابل دوسری منزل پر ہی ان کے ایک اور پڑوسی کا فلیٹ واقع ہے ۔ ایک بار ان کے پڑوسی سے کسی بات پر ان بن ہوگئی تو وہ آدھی رات کو بڑی خاموشی کے ساتھ از راہ دشمنی پان کی پیک اس کے فلیٹ کی بالکونی میں پہنچا دیا کرتے تھے اور کسی کو یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ پان کی پیک کس راستہ سے بالکونی میں داخل ہوئی ہے ۔ بہرحال ہمارے ہاں تھوکنے کی ایک لمبی روایت ہے اور اس پر اچانک پابندی عاید کرنے سے عوام کی صحت پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے ۔ ممبئی کارپوریشن کو پہلے اس نکتہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے ۔

(۱۲/ جنوری ۱۹۹۷ء)

حیدرآبادی کھانوں کا میلہ

دلی یوں بھی میلوں ٹھیلوں کا شہر ہے۔ سیاسی میلے تو آئے دن ہوتے رہتے ہیں جو ہر سیاسی جماعت کی جانب سے ریلیوں اور احتجاجی مظاہروں کی صورت میں وقفہ وقفہ سے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے شہر حیدرآباد کے حوالے سے یہاں انواع و اقسام کے میلے منعقد ہونے لگے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے حیدرآبادی زیورات کا ایک میلہ بھی آراستہ کیا گیا تھا جس میں ایک لحیم شحیم چندن ہار کو دیکھنے کے بعد ہمارے ایک دوست نے کہا تھا "یہ چندن ہار ہے یا قیدی کو جکڑنے والی بیڑیاں۔کیونکہ یہ ہار اتنا وزنی ہے کہ اگر کسی نازک اندام حسینہ کے گلے میں اسے سچ مچ پہنا دیا جائے تو اس کا چلنا پھرنا دوبھر ہو جائے۔ اسے جو کوئی بھی خاتون پہنتی ہوگی وہ پہلوان تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن حسینہ بالکل نہیں ہوگی"

ہم نے یہ کہہ کر انہیں مطمئن کرایا تھا کہ "بھیا! یہ سب ہماری گزشتہ تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ ان ہاروں کو پہننے والیاں اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ ان زیورات کو پہننے کا گر وہی جانتی تھیں۔ یوں بھی گزشتہ تہذیب کی باتیں ہم لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آ سکتیں۔ ڈھاکہ کی ململ کے بارے میں پڑھ رکھا ہے کہ اس کا پورا ایک تھان ایک انگوٹھی میں سے بڑی آسانی سے گزر جایا کرتا تھا۔ بلکہ کسی منچلے نے اودھ کے ایک نواب کے بارے میں یہ مشہور بھی کر رکھا تھا کہ وہ اپنے دربار میں ڈھاکہ کی ململ کے ایک تھان کو انگوٹھی میں سے گزارنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ نواب اودھ ایک طرف بیٹھے ململ کے تھان کو انگوٹھی میں سے کھینچ رہے تھے اور دوسری طرف اس ململ کو بنانے والا کاریگر تھان کو انگوٹھی میں سے چھوڑتا چلا جا رہا تھا۔ ایک مرحلہ پر انہیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ ململ کے تھان کا آخری سرا اب انگوٹھی میں سے گزرنے ہی والا ہے۔

نواب اودھ ذرا عجلت پسند آدمی واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے ململ کے تھان کو یکبارگی جو ذرا طاقت سے کھینچا تو ململ کے تھان کے ساتھ ساتھ بیچارا سالم کاریگر بھی انگوٹھی میں سے باہر نکل آیا۔ سارے دربار میں واہ واہ کا شور بلند ہوا اور نواب اودھ نے کاریگر کا منہ بند کرنے کے لئے اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ اس لطیفہ کی رُو سے ساری خوبی ململ کے تھان میں نظر نہیں آتی بلکہ اس انگوٹھی میں بھی نظر آتی ہے جس میں سے تھان تو تھان آدمی بھی گزر جاتا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے دنوں دلی میں حیدر آبادی اشیاء کے میلوں کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ حیدر آبادی ملبوسات کا بھی ایک میلہ منعقد ہوا تھا جس میں ایک صاحب نے ڈھیر سارے حیدر آبادی ملبوسات خریدنے کے بعد کہا تھا "یار! میں تو بالکل ننگا ہوگیا"۔ مگر اس بار ہم حیدر آبادی کھانوں کے میلے کا کچھ حال بیان کرنا چاہتے ہیں جو ان دنوں تاج محل ہوٹل میں چل رہا ہے۔ یوں بھی حیدر آبادی کھانے ان دنوں دلی میں بہت مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو ہماری روڈا مستری صاحبہ ہیں جو جب تک پارلیمنٹ کی رکن بنی رہیں آئے دن دلی والوں کو بڑے اہتمام کے ساتھ حیدر آبادی کھانے نہ صرف خود کھلاتی رہیں، بلکہ کئی ہوٹلوں میں ان کھانوں کے میلے بھی سجائے۔ ان کے دلی سے چلے جانے کے بعد یہ ذمہ داری ہمارے نحیف و نزار کندھوں پر بھی عائد ہوئی ہے۔ چنانچہ ہمارے گھر میں بھی مہینہ میں دو ایک بار حیدر آبادی کھانوں کے میلے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دلی کے تاج محل ہوٹل میں حیدر آبادی کھانوں کا جو میلہ ان دنوں چل رہا ہے وہ صحیح معنوں میں حیدر آبادی کھانوں کا کل ہند میلہ ہے اور اس کا اہتمام نواب محبوب عالم خاں نے کیا ہے بلکہ وہی اسکے کرتا دھرتا ہیں۔ دلی کے اخباروں میں اس کے قد آدم اشتہارات شائع ہو رہے ہیں۔ جس میں حلیم، کچے گوشت کی بریانی، ٹماٹر کا کٹ، مرغ امباڑا، بگھارے بینگن، چگر گوشت، ڈبل کا میٹھا، لقمی وغیرہ کے ساتھ ساتھ خود محبوب عالم خاں کی قد آور شخصیت کا حال مزے لے لے کر بیان کیا جارہا ہے کہ چھ فٹ نو انچ کے قد والے میزبان اور داعی کی صحبت میں حیدر آبادی کھانوں کا لطف اٹھایئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اکثر لوگ حیدر آبادی کھانا کھانے کے لئے کم جا رہے ہیں اور حیدر آبادی کھانوں کے منتظم و مہتمم کی "دراز قامتی" کو دیکھنے زیادہ جا رہے ہیں۔ لنچ کے

وقت کھانے کے دام میں آدھی رعایت دی جاتی ہے ۔ ہم غریب آدمی ہیں ۔ کھانے کے پورے دام کہاں سے ادا کرسکتے ہیں ۔ لہذا دو بار گئے تو لنچ میں ہی گئے اور وہ بھی پہلے سے کھانے کی میز کی بکنگ کروا کے گئے ۔ حیدرآبادی کھانوں کے شائقین کی وہ بھیڑ ہے کہ لائین لگانا پڑتا ہے ۔ ہم جگر گوشت کھانا چاہتے تھے لیکن پتہ چلا کہ اس دن حیدرآباد کا طیارہ وقت پر نہیں آیا ۔ لہذا جگر گوشت نہیں ملے گا ۔ ہم دو آدمی تھے ۔ لہذا کچے گوشت کی بریانی ، مرغ اسپاڑا اور دہی کی چٹنی سے کام چلایا اور دیکھتے ہی دیکھتے چھ سو روپے کا بل اور وہ بھی رعایت کے ساتھ ادا کیا ۔ ہمارے دوست نے پوچھا "کیا حیدرآبادی کھانا اتنا مہنگا ہوتا ہے ؟" ہم نے کہا "اتنا مہنگا تو نہیں ہوتا لیکن فائیو اسٹار ہوٹل میں جب اس کا اہتمام کیا جاتا ہے تو ضرور مہنگا ہو جاتا ہے کیونکہ اس بل میں کم از کم سو روپے تو اس مسکراہٹ کے ہوتے ہیں جو آپکے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی ہوٹل کی ریسپشنسٹ (Recep tionist) کے نازک اندام ہونٹوں پر آپ کے لئے سج جاتی ہے ۔ مونچھوں والا جو دربان آپ کی موٹر کا دروازہ کھولتا ہے تو اس کے پچاس ساٹھ روپے بھی اس بل میں شامل ہوتے ہیں ۔ پھر ایرکنڈیشنگ ، پھولوں کی سجاوٹ ، ڈائننگ ہال کی تزئین اور خود میزبان اور داعی کے ذاتی قد کے دو سو روپے اس میں سے نکال دیجئے تو یہ بریانی ہمیں وہی پچاس ساٹھ روپے میں پڑجاتی ہے ۔ مہنگی نہیں ہے ۔ بہرحال حیدرآبادی کھانوں کے لئے شائقین کی بھیڑ کو دیکھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی ۔ ہم ماسٹر شیف یا حیدرآبادی کھانوں کے سربراہ اور تعارف کنندہ سے بھی ملنا چاہتے تھے ۔ لیکن پتہ چلا کہ صبح سے پکوان کی نگرانی میں مصروف رہتے ہیں اس لئے دوپہر کو آرام کرتے ہیں ۔ اور ڈنر میں نمودار ہوتے ہیں ۔ چونکہ ڈنر کا پورا بل دینے کی سکت ہم میں نہیں تھی اس لئے خاموش رہ گئے ۔ ہم نے اس میلہ میں ایک دلچسپ بات یہ بھی دیکھی کہ یوروپی اور امریکی باشندے بھی حیدرآبادی کھانوں پر ٹوٹ پڑ رہے ہیں بلکہ ایک امریکی کو ہم نے اس حال میں دیکھا کہ بگھارے بینگنوں کو ثانا شاہی کھیر میں ملا کر کھائے چلا جارہا تھا اور حیدرآبادی کھانوں کے ذائقہ کی تعریف کرتے اس کی زبان نہیں سوکھ رہی تھی ۔ حیدرآبادی کھانوں کے سلسلہ میں ہمیں یاد آیا کہ دو سال پہلے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی اس طرح کے ایک میلے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں حیدرآبادی کھانوں کے نام بڑے

دلچسپ رکھے گئے تھے۔ دو نام اب تک یاد ہیں۔ ایک نام تھا "چٹنی بھاگ متی" اور دوسرا نام تھا "کشنی کباب۔" "چٹنی بھاگ متی" کا مطلب تو ہم نے یہ نکالا تھا کہ شاید خود بھاگ متی کو کوٹ کر اس کی چٹنی بنائی گئی ہے۔ لیکن جب ہم نے اسے کھانے سے پہلے وضاحت طلب کی تب بتایا گیا کہ یہ وہ چٹنی ہے جسے بھاگ متی بہت پسند کرتی تھی۔ دو تین بار ہم نے یہ چٹنی کھائی تھی۔ اور ہر بار اس کا ذائقہ ہمیں مختلف لگا تھا۔ جب ذائقہ کے اس فرق کا سبب پوچھا تو جواب ملا "حضور! آپ نے اتوار کو یہ چٹنی کھائی تھی اور آج منگل ہے۔ بھاگ متی اتوار اور منگل کو جس ذائقہ کی چٹنی کھایا کرتی تھی اسی ذائقہ کو ہم نے برقرار رکھا ہے"۔ کشنی کباب کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ یہ کباب مہاراجہ سرکشن پرشاد کو بہت پسند تھے۔ لہذا آپ بھی پچاس روپے میں ایک کباب کھائیے۔

بہرحال حیدرآبادی کھانوں کا یہ موجودہ میلہ دلی میں بے پناہ مقبول ہو رہا ہے اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ہمارے ایک دوست پرسوں ہم سے شکایت کرنے لگے کہ اس میلہ میں شرکت کرنے کی کوشش میں ان کا پیٹ خراب ہوگیا ہے۔ ہم نے کہا "حیدرآبادی کھانے اتنے ثقیل تو نہیں ہوتے کہ آدمی کا پیٹ خراب ہوجائے"

بولے "میرا پیٹ حیدرآبادی کھانوں کی وجہ سے خراب نہیں ہوا ہے بلکہ میں تو نہایت نیک نیتی کے ساتھ اس میلہ میں گیا تھا لیکن جب کھانے کی کوئی میز خالی نہ ملی تو مجبوراً مجھے خان مارکیٹ کے ایک پنجابی ڈھابے میں "چھولے اور بھٹورے" کھانے پڑے۔ تب سے پیٹ کو پکڑے گھوم رہا ہوں" (۱۹۹۵ء)

چلو اکیسویں صدی میں

ایک دن ہم خراماں خراماں کہیں چلے جا رہے تھے کہ راستہ میں اچانک ایک دوست مل گئے۔ کہنے لگے "کہاں جا رہے ہو؟ ان دنوں تمہاری چال میں ایک ایسا ٹھہراؤ، دھیما پن اور اعتماد آگیا ہے کہ لگتا ہے چوری چوری اکیسویں صدی میں جانے کا ارادہ رکھتے ہو ورنہ اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں جہاں آدمی کو ابھی کچھ دیر بعد آنے والے لمحے کے آنے کا بھروسہ تک نہ ہو وہاں تمہارا یوں اطمینان اور بے فکری کے ساتھ چلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ یوں بھی اب اکیسویں صدی کے آنے میں دن ہی کتنے باقی رہ گئے ہیں۔ بھیا! اس رفتار سے تو تم سچ مچ اکیسویں صدی میں داخل ہو جاؤ گے"۔ ہم اس سوال کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ہمارے دوست جو ہمیشہ عجلت میں رہتے ہیں اور ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں آگے کو نکل گئے۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہمارا تو یہ عالم ہے کہ آج کا دن بیت گیا تو یہ پتہ ہی نہیں رہتا کہ آنے والا دن آئے گا بھی یا نہیں، اسی لئے رات کو سونے سے پہلے اپنے گناہوں کی نہ صرف معافی مانگ لیتے ہیں بلکہ بچوں کو یہ تک بتادیتے ہیں کہ ہم نے کس کس سے کتنا قرض لے رکھا ہے۔ ہم انہیں پابند بھی کرتے ہیں کہ ہمارے بعد وہ ان سب کا قرض ادا کر دیں ورنہ ہماری روح کو تکلیف پہنچے گی، یوں بھی ہماری روح بہت حساس ہے۔ ہمارے جسم کے ساتھ جو ہوا سو ہوا کم از کم ہماری روح کو تو سکون ملنا چاہئے۔ ہماری اولاد اتنی سعادتمند ہے کہ ہر رات کو سونے سے پہلے جب ہم دوستوں سے لیئے ہوئے قرض کی رقم اور خود قرضداروں کی تعداد میں ضرور کچھ نہ کچھ اضافہ کر دیتے ہیں تو وہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتی۔ اس کے دو ہی مطلب ہیں یا تو ان

کی نیت بہت اچھی یا پھر بہت ہی خراب ہے ۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ ہم بیسویں صدی میں پچھلے 62 برسوں سے لگاتار جی رہے ہیں اور 62 برس کی عمر وہ ہوتی ہے جس میں آدمی اچھے بُرے سب کاموں سے فارغ ہو جاتا ہے بلکہ بُرے کام کرنے کا تو اہل ہی نہیں رہتا۔ جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا تھا تو ہم اس دنیا میں موجود نہیں تھے بلکہ ہماری اجازت کے بغیر پہلی جنگ عظیم تک لڑی جا چکی تھی ۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے وقت ہم پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہو گئے تھے لیکن اس وقت بھی کسی نے ہم سے اجازت نہیں لی تھی ۔ دنیا میں جب پہلا ایٹم بم گرایا گیا تو تب بھی ہمیں مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا ۔ پھر ہم ملک کی آزادی میں ، باوجود کم سنی کے ، حصہ لینا ہی چاہتے تھے کہ ملک آزاد ہو گیا ۔ ہم نے سوچا کہ جب دنیا کے معاملات بالا بالا ہی طے پا جاتے ہیں تو ہم نے بھی وقت اور زمانہ کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو ایک شاعر نے اختیار کیا تھا ۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

جس آدمی کا بیسویں صدی میں ہی جب کوئی عمل دخل نہ رہا ہو تو وہ اکیسویں صدی میں جا کر کیا کرے گا ۔ لیکن اب جب کہ اکیسویں صدی ہماری زندگی کے تھکے ہوئے وقت کے آگے دستک دینے لگی ہے تو دل میں ایک خواہش سی جاگتی ہے کہ خدا کرے اکیسویں صدی ایسی ہو کہ اس میں دکانیں تو بہت سی ہوں لیکن دکاندار کوئی نہ ہو ، مکان تو بہت سے ہوں لیکن مالک مکان کوئی نہ ہو ۔ کیونکہ بیسویں صدی میں ہمارا زیادہ تر وقت دکانداروں اور مکان مالکوں سے ہی لڑتے جھگڑتے گزرا ۔ اکیسویں صدی میں کچھ ایسا ہو کہ ہم دکانوں سے جو چیز چاہیں گھر لے آئیں اور دکاندار ہم سے بھاؤ تاؤ نہ کرے ۔ ہم سے کوئی دام ہی نہ لے تو اور بھی اچھا ہے ۔ بیسویں صدی میں سائنس نے وہ وہ کرشمے دکھائے کہ ہماری عقل اب تک دنگ ہے ۔ اکیسویں صدی میں تو سائنس اور بھی کرشمے دکھائے گی ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا گھر زمین پر ہو ، دفتر مریخ میں اور آپ کی

سسرال زہرہ میں ہو۔ کبھی آپ بور ہونے لگیں تو بال بچوں سے کہیں گے " بھئی! آج زمین پر بہت گرمی ہو رہی ہے۔ چلو ذرا مریخ تک ہو آئیں۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھالیں گے۔ شام کی چائے واپسی میں چاند میں پی لیں گے "۔ ہو سکتا ہے اکیسویں صدی میں انسانی جسم کے پارٹس بھی بازار میں ملنے لگ جائیں۔ اگر آپ کا دل ٹوٹ گیا تو آپ بازار سے ایک نیا دل خرید کر لے آئیں گے یا کسی سے ادھار لے لیں گے۔ مثال کے طور پر زید اپنے پڑوسی بکر کے پاس جاکر کہے گا " یار! تمہارے پاس کوئی فالتو دل ہو تو دینا۔ گھر واپس ہوتے وقت مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں اپنا دل کسی کو دے آیا ہوں۔ اب دل کے بنا گھر جاتے ہوئے ڈر ہونے لگا ہے۔ اگر بیوی پوچھے کہ دل کسے دے آئے تو کیا جواب دونگا "۔ اس پر بکر بڑی بے دلی کے ساتھ بولے گا " یار! تم بھی کیسے وقت میرے پاس دل مانگنے آئے۔ چار دن پہلے عمر مجھ سے میرا فالتو دل مانگ کر لے گیا تھا۔ وعدہ کر گیا تھا کہ ایک ہی دن میں واپس کردے گا مگر اب تک نہیں آیا۔ اگر ہوتا تو میں تمہیں ضرور دیتا "۔ پھر سائنس کی ترقی کے باعث اکیسویں صدی میں آدمی کے بہت سے کام بٹن دباتے ہی پورے ہوجایا کریں گے۔ کیا عجب کہ بٹن دباتے ہی آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائیں۔ بٹن دباتے ہی کھانا آپ کے سامنے آجائے۔ دوسرا بٹن دباتے ہی یہ کھانا آپ کے پیٹ میں پہنچ جائے اور تیسرے بٹن کو دباتے ہی یہ کھانا خود بخود ہضم ہونے لگ جائے۔ ایک اور بٹن دبائیں تو آپ کو ڈکار آجائے اور پھر کسی بٹن کو دباتے ہی آپ کو نیند آجائے۔ اکیسویں صدی کے تعلق سے ہمارے دل میں یوں تو طرح طرح کی خواہشات ہیں۔ لیکن ہم لالچی اور حرصی آدمی بالکل نہیں ہیں۔ پھر ہماری ضرورتیں بھی بہت محدود ہیں۔ ہمیں نہ فالتو دل چاہیئے اور نہ ہی ہمیں ایسے بٹن چاہئیں جن سے آدمی کا کھانا ہضم ہو جائے۔ ہمیں تو کھانا ہی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ کیا ہم بیوقوف ہیں کہ اسے خواہ مخواہ ہی ہضم کرتے پھریں۔ ہماری تو بس ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ اگر ہم اکیسویں صدی تک زندہ رہے تو ہمیں بس میں بیٹھنے کی جگہ آسانی سے مل جائے۔ پچھلے کئی برسوں سے ہم بس کے ڈنڈے سے لٹک کر

سفر کر رہے ہیں ۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم بس کے ڈنڈے سے لٹک کر ہی اکیسویں صدی میں پہنچیں ۔ ہم کو تو خیر کوئی اعتراض نہ ہو گا لیکن اکیسویں صدی کو تو اعتراض ہو سکتا ہے ۔ ہمارے پاس کہنے کو یوں تو بہت سی باتیں ہیں لیکن چونکہ ہم لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں اسی لئے ہماری دعا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی لکھنے پڑھنے کا کاروبار چلتا رہے ۔ شاعر شعر کہتے رہیں اور افسانہ نگار افسانے لکھتے رہیں ۔ ہم تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ شعروں اور افسانوں میں کوئی معنی بھی ہونے چاہئیں ۔ بیسویں صدی کے بہت سے شعر اور بہت سے افسانے اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آئے ۔ جب بھی ہم نے شکایت کی تو ہم سے کہا گیا کہ یہ ادب آنے والی صدیوں کے لئے تخلیق کیا جا رہا ہے ۔ خدا کرے کم از کم اکیسویں صدی میں ہمیں ان شعروں اور افسانوں کا مطلب سمجھ میں آجائے ۔ آخر میں ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر چہ آج ہم بیسویں صدی میں جی رہے ہیں اور اکیسویں صدی کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں لیکن اب بھی ہمارے پاس بعض ایسے لوگ ہیں جو ذہنی طور پر 2000 سال قبل مسیح میں زندہ ہیں ۔ ہمارے ایک دوست آج بھی سولھویں صدی میں جی رہے ہیں ۔ ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کہ وہ سولہویں صدی میں جی کر بیسویں صدی میں کیوں سانس لے رہے ہیں ۔ ہمیں ان پر اصل اعتراض تو یہ ہے کہ پہلے تو انہوں نے پیدا ہونے میں اتنی دیر کردی اور اب ہم سب کو اپنی سولھویں صدی سے پریشان کرتے رہتے ہیں ۔ ہماری خواہش صرف اتنی ہے کہ ہم جب اکیسویں صدی میں جائیں تو ہمارے ساتھ جو لوگ چلیں وہ کم از کم براہ راست بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں پہنچ جائیں ۔ اکیسویں صدی میں چاہے کچھ بھی ہو مگر حساب کا گھپلا نہیں ہونا چاہئے ۔

(۱۲ / اپریل ۱۹۹۸ء)

ابراہام لنکن، نرالا بن گئے

امریکہ کے سابق صدر ابراہام لنکن کو اس دنیا سے گذرے ہوئے صدیاں بیت گئیں لیکن اب یہ اطلاع آئی ہے کہ لکھنؤ میں ابراہام لنکن کو ذرا سی تصحیح اور اصلاح کے بعد ہندی کا مشہور شاعر سوریہ کانت نرالا بنا دیا گیا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ابراہام لنکن نے دنیا کے سامنے جمہوریت کا ایک جامع اور مبسوط تصور پیش کیا تھا لیکن کسی نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ اپنی وفات کے کئی سو برس بعد ایک دن اچانک ہندی کے مشہور شاعر بھی بن جائیں گے۔ کون کہتا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کی ترقی اور اس کے زوال کے سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ ابراہام لنکن کو ہی دیکھئے کہ وہ اپنی وفات کے کئی سو برس بعد اب ہندی میں شاعری کرنے لگے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ تیس برس پہلے لکھنؤ میں ایک امریکن لائبریری ہوا کرتی تھی جس میں ابراہام لنکن کا ایک مجسمہ بھی رکھا ہوا تھا۔ 60 کی دہائی میں جب یہ لائبریری بند کر دی گئی تو لائبریری کے اربابِ حل وعقد نے سوچا کہ وہ ابراہام لنکن کے مجسمے کو کہاں کہاں ڈھوتے پھریں گے۔ لہذا انہوں نے یہ مجسمہ لکھنؤ میونسپل کارپوریشن کو تحفتاً دیدیا کہ وہ اسے شہر کے کسی موزوں مقام پر نصب کردے۔ یہ مجسمہ لکھنؤ میونسپل کارپوریشن کے گودام میں برسوں سے پڑا ہوا سڑ رہا تھا کیونکہ اسے نصب کرنے کے لئے میونسپل کارپوریشن کو کوئی مناسب جگہ نہیں مل رہی تھی۔ بعد میں خود میونسپل کارپوریشن بھی اس مجسمہ کو بھول بھال گیا۔ یوں بھی میونسپل کارپوریشنوں کی یاد داشت خاصی کمزور ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہندی کے بعض حامیوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندی کے مشہور شاعر سوریہ کانت

نرالا کا کوئی موزوں مجسمہ لکھنؤ میں نصب کیا جائے کیونکہ نرالا کا تعلق لکھنؤ شہر سے تھا ۔ لکھنؤ کے میئر نے وعدہ کیا کہ وہ اندرون ایک ہفتہ نرالا کا مجسمہ نصب کروادیں گے ۔ اس وعدہ کے بعد جب مجسمہ سازوں سے نرالا کا مجسمہ تیار کرنے کی خواہش کی گئی تو انہوں نے معذرت کی کہ اتنی قلیل مدت میں نرالا کا مجسمہ تیار کرنا دشوار ہے ۔ لیکن لکھنؤ کے میئر اپنی بات پر اڑے رہے کہ نرالا کا مجسمہ بہر حال اندرون ایک ہفتہ نہ صرف تیار ہوجانا چاہیے بلکہ اس کی تنصیب بھی عمل میں آجانی چاہیے ۔ دنیا جانتی ہے کہ میونسپل کارپوریشن کے عہدیدار بہت ہوشیار اور چالاک ہوتے ہیں ۔ عوام کو شہری سہولتیں فراہم کرنے کے کام کو چھوڑ کر باقی سب کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں ۔ چنانچہ میونسپل کارپوریشن کے کسی عہدیدار کو اچانک یہ یاد آیا کہ کارپوریشن کے گودام میں ابراہام لنکن کا ایک مجسمہ بلا وجہ پڑا ہوا ہے ۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس مجسمہ کو ضروری ترمیم اور اصلاح کے بعد سوریہ کانت نرالا کا مجسمہ بنادیا جائے ۔ مجسمہ کو جھاڑ پونچھ کر نکالا گیا تو پتہ چلا کہ ابراہام لنکن اور نرالا میں بڑی مشابہت اور مماثلت ہے ۔ (کیونکہ دونوں کے پاس دو آنکھیں ، دو کان ، ایک ایک ناک اور پیشانی وغیرہ جیسے اعضاء موجود تھے) صرف داڑھی مونچھوں میں بس ذرا سافرق تھا تو سوچا کہ مجسمہ ساز سے کہا جائے کہ وہ ابراہام لنکن کی مونچھوں کو ذرا تراش دے ۔ اگر چہ اس کام کے لئے کسی ماہر مجسمہ ساز کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی ۔ یہ کام تو کسی حجام کی مدد سے بھی کیاجا سکتا تھا ۔ بہر حال ضروری ترمیم اور اصلاح کے بعد لکھنؤ کے میئر نے بڑی شان و شوکت اور اہتمام کے ساتھ نرالا کے مجسمہ کی نقاب کشائی کردی ۔ اگر چہ کچھ لوگوں نے اس وقت بھی شکایت کی کہ مجسمہ میں نرالا کی داڑھی اور مونچھیں تو اصلی دکھائی دیتی ہیں لیکن چہرہ میں وہ بات نظر نہیں آتی ۔ اس پر میئر نے انہیں سمجھایا کہ ایک ہفتہ کے اندر نرالا کا جو مجسمہ بنے گا اس میں اتنی کوتاہیاں تو ہونگیں ۔ بہر حال ابراہام لنکن ، میونسپل کارپوریشن کے عہدیداروں کے ہاتھوں گودام سے نکل کر سوریہ کانت نرالا بن گئے اور نصب بھی ہوگئے ۔ ہمیں اس واقعہ پر ایک بادشاہ کاقصہ یاد آگیا ۔ بادشاہ نے اپنے ایک غریب مصاحب کی

کسی بات پر خوش ہوکر ایک ہاتھی بطور تحفہ دیدیا اور کہا " میاں ! تم بھی کیا یاد کروگے ۔ ہم تمہیں اپنا خاص ہاتھی تحفہ میں دیتے ہیں ۔ " بیچارا غریب مصاحب اپنا پیٹ ہی بڑی مشکل سے بھر پاتا تھا ۔ اب بادشاہ کے ہاتھی کا پیٹ بھرنے کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہو گئی ۔ کئی دنوں تک اپنی بچی کھچی جائداد بیچ کر ہاتھی کا پیٹ بھرتا رہا ۔ بالآخر تنگ آکر اس نے ہاتھی کو ہی بیچ دیا ۔ ایک دن بادشاہ کو اپنے ہاتھی کی یاد آئی تو انہوں نے مصاحب سے پوچھا " میاں ! بتاؤ ہمارا ہاتھی کس حال میں ہے ؟ " ۔ اس پر مصاحب نے کہا " حضور ! آپ کا ہاتھی بفضل تعالیٰ خیریت سے ہے اور اتفاق سے اس وقت میری جیب میں موجود ہے " ۔ یہ کہہ کر مصاحب نے اپنی جیب سے ایک چوہا نکالا اور اسے بھرے دربار میں چھوڑ دیا ۔ پھر بولا " حضور ! یہ ہے تو ہاتھی ہی لیکن مجھ غریب کے پاس کھانے کے لئے مناسب چارہ نہ مل سکا تو چوہے کی جسامت کا ہو گیا ہے " ۔ اب اگر امریکہ کے عہدیداروں کو بھی کبھی ابراہام لنکن کے مجسمہ کی یاد آجائے اور وہ اس کی خیریت پوچھ بیٹھیں تو لکھنؤ میونسپل کارپوریشن اپنی جیب سے ابراہام لنکن کا مجسمہ نکال کر بھرے دربار میں رکھ دے گا اور عرض کرے گا " حضور ! یہ ہے تو ابراہام لنکن کا ہی مجسمہ لیکن لکھنؤ کے مخصوص حالات کی وجہ سے سوریہ کانت نرالا بن گیا ہے ۔

یورپ کے ایک شہر کے میونسپل کارپوریشن کی یاد بھی آگئی ۔ اس شہر میں ایک چوراہے پر ایک قومی ہیرو کا مجسمہ نصب کیا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ قومی ہیرو کے مجسمہ کی ٹانگیں پھیلی ہوئی ہیں اور یوں لگ رہا ہے جیسے وہ کموڈ پر بیٹھا ہوا ہے ۔ کسی نے قومی ہیرو کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا تو مجسمہ ساز نے کہا " حضور ! مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں قومی ہیرو کا ایسا مجسمہ تیار کروں جس میں وہ گھوڑے پر بیٹھا ہوا ہو ۔ میں نے اسی مناسبت سے ہیرو کی ٹانگیں پھیلا دی تھیں ۔ ان ٹانگوں کے نیچے گھوڑے کو بھی آنا تھا ۔ لیکن میونسپل کارپوریشن کے عہدیداروں نے آخر وقت میں بتایا کہ میونسپل کارپوریشن کے بجٹ میں گھوڑے کا مجسمہ بنانے کی گنجائش نہیں ہے ۔ تاہم میں نے قومی ہیرو کی ٹانگیں پھیلا رکھی ہیں ۔ جب کارپوریشن کے بجٹ میں گنجائش نکل آئے گی تو ان کے نیچے گھوڑا

بھی بنا دونگا "۔ خیر یوروپ کے ایک میونسپل کارپوریشن نے تو اپنے ہیرو کی ٹانگیں پھیلادی تھیں۔ یہ تو نہیں کیا تھا کہ کسی اور شخص کا مجسمہ اپنے قومی ہیرو کے مجسمہ کے نعم البدل کے طور پر رکھ دے۔ ہم نے اشیاء میں ملاوٹ کی بہت سی مثالیں نہ صرف دیکھی ہیں بلکہ آئے دن ان کا استعمال بھی کیا ہے۔ لیکن مجسموں میں ملاوٹ کی یہ ایک انوکھی مثال ہے۔

اتر پردیش کے وزیر برائے شہری ترقیات لال جی ٹنڈن نے اب کہا ہے کہ ابراہام لنکن کے جس مجسمہ کو سوریہ کانت نزالا کا مجسمہ بنادیا گیا ہے اسے اب وہاں سے ہٹا دیا جائے گا اور اس کی جگہ نزالا کا اصلی مجسمہ نصب کیا جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ نزالا اب اس دنیا میں نہیں ہیں ورنہ وہ اپنے مجسمہ کی تنصیب پر یقینا خوش ہوتے۔ ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے نصب کئے جائیں تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ آٹھ نو برس پہلے ہمیں تاشقند جانے کا موقعہ ملا تھا۔ ہمیں وہاں کے " باغ شعراء " میں بھی لیجایا گیا جہاں چاروں طرف ازبکستان کے عظیم شاعروں اور فنکاروں کے مجسمے نصب ہیں۔ مولانا مقیمی، علی شیر نوائی، ملا نصیر الدین، ظہیر الدین بابر وغیرہ کے خوبصورت مجسمے ایستادہ تھے۔ ہم نے اپنے مترجم سے پوچھا " ان مجسموں کی تیاری پر کیا خرچ آتا ہے ؟ " اس نے کہا " ایک ایک مجسمہ کی تیاری پر ہزاروں روبل کا خرچ آتا ہے " ہم نے دست بستہ عرض کیا "حضور! اگر آپ ہمیں صرف ہزار روبل ہی دینے کا وعدہ کریں تو ہم خود بہ نفس نفیس آپ کے باغ شعراء میں مجسمہ کے طور پر کھڑے ہونے کو تیار ہیں۔"

بیچارے ادیبوں اور فنکاروں کو زندگی میں تو کچھ نہیں ملتا البتہ بعد مرگ ان کے مجسمے جگہ جگہ نصب کئے جاتے ہیں جن پر ہزاروں روپیوں کا خرچ آتا ہے۔ کچھ برس پہلے آنجہانی این ٹی راما راو نے بھی حیدرآباد کے ٹینک بنڈ پر آندھرا پردیش کے فنکاروں اور ادیبوں کے مجسمے نصب کئے تھے جو آج بھی موجود ہیں۔ ان میں مخدوم محی الدین کا بھی مجسمہ شامل ہے۔ ہمارے ایک پنجابی دوست، حیدرآباد سے ہمارا جو تعلق ہے اس سے بخوبی واقف ہیں اور ہماری مزاح نگاری کے بارے میں اچھی سی رائے رکھتے ہیں۔ پچھلے ہفتہ وہ پہلی بار حیدرآباد گئے تو واپسی پر ہم

سے کہنے لگے " بھیا! حیدرآباد میں تو تمہاری بڑی عزت ہے ۔ ہم نے تو ٹینک بنڈ پر تمہارا مجسمہ بھی دیکھا " ۔ ہم نے کہا " بھیا! تم جسے ہمارا مجسمہ سمجھ رہے ہو وہ اصل میں حیدرآباد کے مشہور شاعر مخدوم محی الدین کا مجسمہ ہے "۔ اس پر وہ بولے " یار! مگر اس مجسمہ پر جو شیروانی ہے وہ تو بالکل تمہاری شیروانی کی طرح لگتی ہے ۔ اس لئے میں نے سمجھا کہ تمہارا ہی مجسمہ ہوگا "۔ ہم نے دست بستہ عرض کیا " شیروانی ضرور ہماری ہو سکتی ہے لیکن اس کے اندر جو شخصیت ہے وہ دوسری ہے " بولے " خدا پر بھروسہ رکھو جب ابراہام لنکن، سوریہ کانت ترالا بن سکتے ہیں تو تم بھی ایک دن مخدوم محی الدین بن سکتے ہو ۔ برا وقت کبھی پوچھ کر نہیں آتا " ۔ ابراہام لنکن کا سوریہ کانت ترالا بن جانا مجسمہ سازی کی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے ۔ یوں بھی مجسموں کی تیاری میں بہت سی باتوں اور باریکیوں کا خیال نہیں رکھا جاتا ۔ خود حیدرآباد میں سالار جنگ پُل پر چھترپتی شیواجی مہاراج کا جو مجسمہ نصب ہے اس میں وہ ایک ایسے گھوڑے پر سوار دکھائے گئے ہیں جو ایک عظیم ہیرو کا گھوڑا نہیں دکھائی دیتا بلکہ تانگے کا گھوڑا نظر آتا ہے ۔ بلکہ تانگوں کے بعض گھوڑے تو اس سے کہیں زیادہ صحت مند ہوتے ہیں ۔ ہم جب بھی اس پُل پر سے گزرتے ہیں تو ہمیں اس گھوڑے پر بڑا ترس آتا ہے جو چھترپتی شیواجی مہاراج کا بھاری بھر کم بوجھ سنبھالے ہوئے ہے ۔ ہو سکتا ہے حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے بجٹ میں ٹٹو کی گنجائش نہ نکل آئی ہو ۔ میونسپل کارپوریشن کی مجبوریوں کو بھلا آپ اور ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں ۔ (۱۳ / اپریل ۱۹۹۰ء)

مدر ٹریسا کے ساتھ کچھ ساعتیں

خدا کے فضل سے ہم میں قناعت کرنے کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے ۔ ہر حال میں قانع رہتے ہیں ۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ قناعت اور کنجوسی میں بہت کم فرق باقی رہ جائے ۔ ماشاءاللہ طبیعت میں استغنا بھی موجود ہے ۔ نام و نمود ، شہرت اور جاہ و حشمت سے اپنے آپ کو حتی المقدور دور رکھنے کی بھی کوشش کی ہے ۔ انعام و اکرام کی طرف بھی کبھی للچائی نظروں سے نہیں دیکھا ۔ کسی نے انعام دیا تو لے لیا۔ نہیں دیا تو شکایت بھی نہیں کی ۔ جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا ۔ پھر انعام و اکرام سے دور رہنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان دنوں انعام دینے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ جس مصنف کو سزا ملنی چاہیے اسے انعام کا مستحق قرار دیا جاتا ہے ۔ لہذا ان دنوں انعامات کو حاصل کرنے کا ایک جنون سا پھیلتا جارہا ہے ۔ یادش بخیر ، پچھلے دنوں ہارٹی کلچر ڈپارٹمنٹ نے کسی انعام کے لئے موزوں شخصیتوں کے نام مانگے تو اردو کے ایک محقق اور نقاد نے اپنی کتابیں اس مقابلہ میں داخل کیں ۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ شعر و ادب کے نخلستان میں جو گل بوٹے کھلائے ہیں وہ نباتات عالم میں افضل ترین درجہ پانے کے لائق ہیں ۔ جب ہارٹی کلچر ڈپارٹمنٹ نے اپنی مجبوریوں کی بنا پر ان کی تصانیف کو انعام نہیں دیا تو ایک عرصہ تک اپنی ناقدری کا رونا روتے رہے ۔ ان حالات سے مایوس ہو کر ہم نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہم انعام پانے والوں کی صف میں جانے کے بجائے انعام دینے والوں کی صف میں شامل ہو جائیں ۔ چنانچہ پچھلے آٹھ برسوں سے ہم ایک ایسی تنظیم کی انعامی کمیٹی کے کنوینر ہیں جو ہر سال بڑی پابندی سے ملک کی مختلف زبانوں کے ان صحافیوں اور

ادیبوں کو انعامات دیتی ہے جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ قومی یکجہتی کو فروغ دیا ہو۔ چنانچہ اس سال کے انعامات کے لئے جب صحافیوں کا انتخاب ہوگیا تو مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ان انعامات کی تقسیم کیلئے کس ہستی کو بلایا جائے۔ ہم اپنی بعض شخصی مجبوریوں کی وجہ سے انعامات کی تقسیم کا جلسہ جلدی رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس لئے جلسہ کو فی الحال ٹالنے کے خیال سے یہ تجویز پیش کردی کہ کیوں نہ اس مقصد کے لئے مدر ٹریسا کو زحمت دی جائے۔ ہم نے سوچا تھا کہ مدر ٹریسا یوں بھی 85 برس کی ہوگئی ہیں اور پھر مصروف بھی اتنا رہتی ہیں کہ پہلے تو اس دعوت کو قبول نہیں کریں گی اور کریں گی بھی تو دو تین مہینوں بعد کا ہی کوئی وقت دے سکیں گی۔ لہذا ہم نے انعامی کمیٹی کی کوآرڈینیٹر مسز نفیس خاں سے کہا کہ کیوں نہ پہلے مدر ٹریسا کو اس سلسلہ میں ایک خط لکھ دیا جائے۔ بولیں "کیوں نہ مدر ٹریسا کے آفس سے فون پر بات چیت کرلی جائے"۔ چنانچہ مدر ٹریسا کے دہلی کے "چیریٹی ہوم" سے ان کے کلکتہ کا فون نمبر معلوم کر کے جب انہیں فون کیا گیا اور پوچھا کہ کیا مدر ٹریسا سے بات ہوسکتی ہے تو جواب آیا۔ "میں خود مدر ٹریسا بول رہی ہوں۔ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں۔؟" ہم نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ مدر ٹریسا خود فون اٹھائیں گی۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ ہمیں یقین ہی نہیں آیا اور ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہم نے کس مقصد کے لئے انہیں فون ملایا ہے۔ ہم نے سٹپٹا کر کہا "مدر ٹریسا اس وقت تو آپ بہت مصروف نظر آرہی ہیں۔ ہم پھر بعد میں فون کرتے ہیں۔" بڑی نرمی سے بولیں "جی نہیں ایسی بھی کیا مصروفیت ہے۔ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟"۔ ہم سے کچھ بن نہ پڑا تو ہم نے فون کا ریسیور مسز خان کے حوالہ کردیا کہ وہی بات کریں۔ ہمیں کچھ سوجھائی نہیں دے رہا ہے۔ اور اس طرح مدر ٹریسا نے دو چار منٹ میں ہی ہماری دعوت قبول کرلی۔ ہم نے احتیاطاً اپنا دہلی کا فون نمبر بھی نہیں لکھوا دیا۔ فون کا ریسیور رکھنے کے بعد کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ہم نے خود مدر ٹریسا سے بات کی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مدر ٹریسا جیسی عالمی شہرت یافتہ اور نوبل امن یافتہ خاتون کے ہاں کوئی سکریٹری نہ ہو۔ ہمارے ہاں لوگوں

کو صرف ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ہی ملتا ہے تو اپنے ہاں ایک سکریٹری رکھ لیتے ہیں یا خود ہی آواز بدل کر سکریٹری کی طرح بات کرتے ہیں۔ دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ ہماری بات مدر ٹریسا سے ہوئی ہے۔ سوچا کہ ضرور کہیں غلط فون مل گیا ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ایک بار پھر اس نمبر پر فون ملا کر دوبارہ توثیق کرلی جائے۔ لیکن قبل اس کہ ہم انہیں دوبارہ فون کرتے دوسرے دن صبح صبح ان کا فون آگیا کہ میں نے جہاز کی سیٹیں بک کرالی ہیں۔ میں فلاں دن فلاں فلائٹ سے دہلی پہنچونگی۔ آنے جانے کا کوئی کرایہ نہیں لونگی۔ قیام و طعام کی زحمت بھی آپ نہ کریں۔ کیونکہ میں اپنے ادارے کی جانب سے چلائے جانے والے یتیم خانے میں ٹھہروں گی۔ ایرپورٹ پر آنے کی زحمت نہ کریں۔ البتہ جلسہ سے کچھ دیر پہلے میرے ادارہ پر آجائیں تاکہ جلسہ میں ساتھ چل سکوں۔ جلسہ کے انعقاد میں ابھی تین ہفتے باقی تھے۔ لیکن اس عرصہ میں بعض چھوٹی موٹی تفصیلات طئے کرنے کے لئے دفتر میں ان کے دس بارہ فون آگئے۔ ہم لوگوں نے تجویز رکھی تھی کہ وہ جلسے کے بعد رات کا کھانا انعام یافتگان کے اور انعامی کمیٹی کے ارکان کے ساتھ کھائیں۔ اس کے جواب میں بولیں آپ کے ساتھ وقت ضرور گزارونگی لیکن کھانا نہیں کھاونگی۔ البتہ جو کھانا آپ مجھے کھلانے والے ہیں وہی کھانا میرے "چیریٹی ہوم" پر بھیج دیں۔ میں اس کھانے کو اپنے یتیم خانہ میں یتیم بچوں کے ساتھ کھانا پسند کرونگی۔

غرض 21 ستمبر کو مدر ٹریسا ہمارے جلسہ میں شرکت کے لئے دہلی آئیں۔ پروگرام کے مطابق ہم انہیں لینے دہلی کے کمشنر لین میں واقع انکے چیریٹی ہوم میں ذرا جلدی ہی پہنچ گئے۔ کئی کمروں پر مشتمل ایک خوبصورت سا گھر ہے جس کے ایک ہال میں ہم نے جھانک کر دیکھا تو اس میں کئی جھولے پڑے ہوئے تھے۔ جن میں کئی یتیم بچے آرام کررہے تھے۔ اور جو آرام نہیں کررہے تھے ان کی دیکھ بھال سسٹرس کررہی تھیں۔ اس وقت ادھیڑ عمر کا ایک جوڑا ریسپشنسٹ سے کسی موزوں یتیم بچہ کو گود لینے کے بارے میں استفسار کررہا تھا۔ اتنے میں ایک اور خاتون وہاں آئیں اور ایک بے یارو مددگار بچہ کو چیریٹی ہوم میں داخل کرنے کے

بارے میں بات چیت کرنے لگیں۔ جس حسنِ اخلاق کے ساتھ ضرورتمندوں سے بات چیت کی جارہی تھی اس سے ہم بے حد متاثر ہوئے۔ ہم چونکہ قبل از وقت پہنچ گئے تھے اس لئے سوچا کہ کیوں نہ کچھ وقت یونہی گزار لیا جائے۔ اچانک ریسیپشنٹ نے ہم سے پوچھ لیا" اور فرمایئے۔ آپ کی کیا خدمت کی جاسکتی ہے۔ کیا آپ بھی کسی یتیم بچہ کے سلسلے میں آئے ہیں؟" ہم نے کہا" سسٹر! ہم نے یہاں آنے میں بہت دیر کردی۔ جی تو چاہتا ہے کہ ہم بھی یتیم بن کر آپ کے یتیم خانہ میں داخل ہوں۔ لیکن کیا کریں ہم خود اس وقت کئی بچوں کو، جو بے سہارا بالکل نہیں ہیں، یتیم بنانے کے اہل ہوچکے ہیں"۔ پھر ہم نے جب اپنی آمد کی غرض و غایت بتائی تو سسٹر نے کہا" آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا مدر ٹریسا تو آپ ہی کا انتظار کررہی ہیں۔" ہمارے نہ نہ کرتے سسٹر اندر چلی گئیں اور دو چار منٹ بعد خود مدر ٹریسا باہر آگئیں۔ بڑی شفقت سے ملیں۔ بولیں، چلئے جلسہ گاہ کی طرف چلتے ہیں۔ ہم نے کہا" مدر ٹریسا ہم تو یونہی عجلت میں جلدی آگئے ہیں ورنہ ہمیں تو پورے ایک گھنٹہ کے بعد جلسہ گاہ پہنچنا ہے"۔ بولیں" مگر میں تو اب تیار ہوچکی ہوں۔ سارے یتیم بچوں سے بھی مل چکی ہوں۔" پھر کچھ دیر سوچ کر بولیں" چلئے اتنی دیر میں ہم لوگ میرے ایک اور چیریٹی ہوم میں چلتے ہیں وہاں بھی میں اپنے بچوں سے مل لوں"۔ ہم ماڈل ٹاون میں واقع ایک اور چیریٹی ہوم کی طرف روانہ ہوگئے۔ اگرچہ چیریٹی ہوم کے منتظمین کو مدر ٹریسا کے آنے کی اطلاع نہیں تھی لیکن جو ڈسپلن ہم نے وہاں دیکھا وہ حیرت ناک تھا۔ چیریٹی ہوم کے یتیم بچے اچانک مدر ٹریسا کے اطراف جمع ہوگئے۔ کوئی ان کے پیر چھورہا تھا۔ مدر ٹریسا نے کسی کو گود میں اٹھالیا تھا اور ساتھ ہی کسی یتیم بچہ کا بوسہ لے رہی تھیں۔ پیار کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈ آیا تھا۔ مدر ٹریسا نے پندرہ بیس منٹ میں سارے چیریٹی ہوم کا معائنہ کیا۔ 85برس کی عمر میں ان میں جو پھرتی اور مستعدی نظر آئی وہ تعجب خیز ہے۔ مدر ٹریسا کا ہمارے جلسہ میں آنا ایک اہم واقعہ تھا۔ ہم نے اپنی خیرمقدمی تقریر میں کہا" کسی بھی ایوارڈ کی عزت اس لئے نہیں ہوتی کہ اس ایوارڈ کی رقم کتنی ہے بلکہ ایوارڈ کی عزت اس بات سے ہوتی ہے کہ

ایوارڈ دینے والا کون ہے اور ایوارڈ پانے والا کون ۔ اس سال ایوارڈس کی خاص بات یہ ہے کہ اس سال جن ہاتھوں سے یہ ایوارڈ تقسیم ہو رہے ہیں وہ کوئی معمولی ہاتھ نہیں ہیں ۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو کسی بے سہارا کے سر پر ہوں تو ایک وشال سہارا بن جاتے ہیں ۔ کسی یتیم کے سر پر ہوں تو ممتا کا روپ دھارن کر لیتے ہیں ۔ کسی زخم کو چھولیں تو مرہم بن جائیں کسی کانٹے کو چھولیں تو یہ پھول بن جائیں اور پھول کو چھولیں تو وہ خوشبو بن جائیں اور خوشبو کو چھولیں تو بادصبا بن کر خوشبو کی مہک کو سارے ماحول میں پھیلا دیں " ۔ ہمارے ان خیر مقدمی کلمات پر مدر ٹریسا سراپا عجز و انکسار بن گئیں ۔ مدر ٹریسا نے اپنی تقریر میں محبت کا وہی درس دیا جو صدیوں سے انسانیت کو دیا جا رہا ہے ۔ لیکن انسانیت ابھی تک اسے سننے کی اہل نہیں بن سکی ہے ۔ مدر ٹریسا نے ہمیں راستہ میں ایک واقعہ بھی سنایا تھا ۔ کہنے لگیں " کلکتہ میں ایک راستہ سے گزرتے ہوئے مجھے کوڑے کے ڈھیر میں چھپا ہوا ایک انسانی ہاتھ نظر آیا ۔ میں نے اپنی موٹر رکوائی ۔ کوڑے کے ڈھیر کو ہٹایا تو اس میں سے ایک بوڑھی عورت نکل آئی جو اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی ۔ میں اسے اپنے ہوم میں لے آئی ۔ اسے نہلایا دھلایا اس کی دیکھ بھال کی ۔ جب اسے ہوش آیا تو شکایت کرنے لگی کہ آپ نے مجھے بچایا کیوں ۔ میں تو مرنا چاہتی تھی ۔ میں نے کہا " جس طرح پر سکون زندگی کی اہمیت ہوتی ہے اسی طرح پر سکون موت کی اہمیت ہوتی ہے ۔ مرنا تو سب کو ہے لیکن سکون قلب کے ساتھ مرنے میں کیا قباحت ہے ۔ " پھر اس عورت نے اپنے بیٹے کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اس نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے ۔ میں نے کہا " تم اب خدا کے حضور میں جانے والی ہو ۔ تمہیں اس وقت بھی اپنے بیٹے کے خلاف نفرت کا اظہار نہیں کرنا چاہئے ۔ جب تم خدا کے سامنے جانے والی ہو تو تمہارے چہرے پر نفرت کے آثار نہیں ہونے چاہئیں ۔ دنیا کی نفرتیں اسی دنیا میں چھوڑ جاؤ ۔ وہ بڑھیا تین دن بعد مر گئی ۔ لیکن مرتے وقت اس کے چہرے پر میں نے جو سکون دیکھا وہ میری زندگی کا حاصل تھا ۔ "

مدر ٹریسا سچ مچ محبت کا ایک سمندر ہیں ۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے کہ ہم

میرا کالم

اس دور میں سانس لے رہے ہیں جس میں مدر ٹریسا جیسی ہستی بھی شامل ہے
فراق گورکھپوری نے ایک شعر میں اپنے بارے میں کہا تھا۔

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی اے ہم عصرو
جب جب یہ دھیان آئے گا انکو تم نے فراقؔ کو دیکھا تھا

اور ہمارے لئے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ہم نے مدر ٹریسا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان سے باتیں کیں اور ان کی سرپرستی ہمیں حاصل رہی۔

(ستمبر ۱۹۹۶)

محکمہ موسمیات کی حمایت میں

دہلی کے ہندی روزنامہ " جے وی جی ٹائمس " میں محکمہ موسمیات کے خلاف ایک قاری کا خط شائع ہوا ہے جس میں اس نے محکمہ موسمیات پر گرج چمک کے ساتھ اپنے غصہ کے چھینٹے برسائے ہیں اور محکمہ موسمیات کے خلاف اپنی برہمی کے نہ صرف طوفانی ہواؤں کے تیز جھکڑ چلائے ہیں بلکہ کہیں کہیں اولے بھی برسائے ہیں۔ اس کا غصہ اتنا شدید ہے کہ لگتا ہے یہ اس کی زندگی کا اعظم ترین غصہ ہے۔ مراسلہ نگار کا کہنا ہے کہ محکمہ موسمیات حکومت کا واحد محکمہ ہے جس کا مصرف کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کی بیشتر پیش قیاسیاں نہ صرف غلط اور گمراہ کن ہوتی ہیں بلکہ خود قدرت کے لیے بھی اس محکمہ کا وجود ناقابل برداشت نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت محکمہ موسمیات کی تاک میں بیٹھی رہتی ہے۔ ادھر اس محکمہ نے پیشین گوئی کی اور ادھر قدرت اس پیشین گوئی کی تردید کرنے کیلئے کمربستہ ہوگئی۔ محکمہ موسمیات اور قدرت کے درمیان وہ رشتہ اور تعلق خاطر نظر نہیں آتا جو عموماً چولی اور دامن کے درمیان پایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ تعلق کچھ ایسا ہے جو آگ اور پانی کے بیچ ہوتا ہے۔ مراسلہ نگار نے ایک مثال بھی دی ہے کہ پچھلے دنوں دور درشن جب دہلی کے موسم کے بارے میں یہ پیش قیاسی کر رہا تھا کہ دہلی میں ابھی تک مانسون کے بادل نہیں آئے ہیں اور یہ کہ دہلی میں عام طور پر موسم خشک رہے گا تو عین اسی وقت ساری دہلی پر مانسون کے بادل چھائے ہوئے تھے اور دہلی میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ یہ ایسا نکما اور کام چور محکمہ ہے کہ کھڑکی سے باہر تک جھانک کر نہیں دیکھتا کہ موسم کیا کر رہا ہے۔ جو محکمہ دن کو رات اور رات کو دن کہے ایسے محکمہ کو رکھنے کا کیا فائدہ۔

مراسلہ نگار نے آخر میں یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ اس محکمہ کو فوراً برخاست کیا جائے۔ اس طرح حکومت کے اخراجات میں خاصی کمی واقع ہوسکتی ہے۔

مراسلہ نگار سے ہمیں دلی ہمدردی ہے کہ وہ ایک ایسے مسئلہ پر اپنے شدید غم و غصہ کا اظہار کر رہا ہے جس پر اسے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیئے۔ ہم بھی محکمہ موسمیات کی پیش قیاسیوں کو نہایت پابندی سے سنتے ہیں لیکن کبھی اپنا خون اس طرح نہیں کھولاتے جس طرح مذکورہ بالا قاری نے کھولایا ہے۔ ہم تو ان پیش قیاسیوں کو ایک تفریحی پروگرام کے طور پر سنتے ہیں۔ پھر مراسلہ نگار نے جس طرح اپنا سارا غصہ محکمہ موسمیات پر اتارا ہے اس سے لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ حکومت کے سارے محکمے تو ٹھیک ٹھاک کام کر رہے ہیں اور محکمہ موسمیات ہی واحد محکمہ ہے جو ایمانداری سے کام نہیں کر رہا ہے۔ مراسلہ نگار کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے ہاں حکومت کا کوئی محکمہ ایسا نہیں ہے جو ایمانداری سے کام کر رہا ہو۔ بے چارے محکمہ موسمیات پر ہی سارا غصہ اتارنے کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ ہمارا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ حکومت کا یہی وہ واحد محکمہ ہے جہاں ایمانداری کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اور اس میں کسی بے ایمانی اور گھپلے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ہم نے آج تک محکمہ موسمیات کے کسی افسر کو قدرت سے رشوت لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس محکمہ کے عہدیدار تو دیانتداری اور حلال کی روٹی کھاتے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر گذارا کرتے ہیں اور ان کی بالائی آمدنی وہی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے انہیں ملتی ہے۔ ان کی جانب سے کی جانے والی پیش قیاسیاں جب غلط ثابت ہوتی ہیں تو ان کا ایمان کچھ اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ اس محکمہ کے سوائے کسی اور محکمہ کے عہدیدار اس حقیقت کو نہیں مانتے کہ قدرت جو چاہتی ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ آدمی لاکھ کوشش کرے لیکن وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محکمہ موسمیات کا عملہ نہایت دین دار ہوتا ہے۔ خدا کی ذات پر اس کے عملہ کو پورا بھروسہ ہوتا ہے اور دنیا کی بے ثباتی کا جتنا گہرا ادارک اسے ہوتا ہے کسی اور کو نہیں ہوتا۔ جب کہ حکومت کے دوسرے محکموں میں کام کرنے والے بعض عہدیدار تو ایسے

بھی ہوتے ہیں جو خود کو خدا سمجھ بیٹھتے ہیں ۔ ان کے کروفر کو دیکھ کر عام آدمی کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ دنیا ان ہی کے حکم سے چل رہی ہے ۔ جب کہ محکمہ موسمیات کے عہدیدار ایک گوشہ میں بیٹھے یاد الہٰی میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے اختیارات کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے ۔ مراسلہ نگار سے ہمیں ایک شکایت اور بھی ہے ۔ جب اسے پتہ ہے کہ محکمہ موسمیات اور قدرت کے درمیان نہایت شدید اختلافات ہیں اور ان دونوں کی آپس میں کبھی نہیں بنتی تو مراسلہ نگار کو ان دونوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے ۔ ہماری تو روایت یہ رہی ہے کہ اگر دو فریقوں کے درمیان آپس میں اختلافات ہیں تو ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے ۔ انگریزوں کو دیکھئے کہ انہوں نے کس طرح " لڑاؤ اور حکومت کرو " کے اصول پر عمل کرتے ہوئے تین سو برس سے زیادہ عرصہ تک اس ملک میں اپنی بالادستی برقرار رکھی ۔ آپ تو جانتے ہیں کہ دو بلّیاں جب روٹی کی تقسیم کے مسئلہ پر لڑ جھگڑ کر تصفیہ کے لئے بندر کے پاس جاتی ہیں تو فائدہ بلّیوں کا نہیں بلکہ بندر کا ہوتا ہے ۔ مراسلہ نگار کو بھی اس معاملہ میں بندر بن جانا چاہئے ۔ ہمیں دیکھئے کہ محکمہ موسمیات اور قدرت کے درمیان پائی جانے والے ازلی دشمنی سے ہم کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ کسی دن محکمہ موسمیات جب پیش قیاسی کرتا ہے کہ موسلادھار بارش ہوگی تو ہم اس دن رین کوٹ اور چھتری وغیرہ لے کر نہیں جاتے اور جب محکمہ موسمیات موسم کے خشک رہنے کی پیش قیاسی کرتا ہے تو ہم اپنے ساتھ نہ صرف چھتری اور رین کوٹ رکھتے ہیں بلکہ اکثر اوقات تو حفظ ماتقدم کے طور پر گھر سے باہر ہی نہیں نکلتے اور نہایت مزے میں رہتے ہیں ۔ مراسلہ نگار بھی اگر ہمارے اصول پر عمل کرنے لگے تو اسے محکمہ موسمیات کے خلاف مراسلہ شائع کرنے اور نزلہ زکام اور کھانسی بخار میں مبتلا ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی ۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے بشرطیکہ آدمی واقعی عقلمند ہو ۔ البتہ مراسلہ نگار کی اس رائے سے ہم متفق ہیں کہ دور درشن جب موسم کا حال نشر کرے تو نیوز ریڈر کو موسم کا حال نشر کرنے سے پہلے اسٹوڈیو کی کھڑکی کھول کر ضرور دیکھ لینا چاہئیے کہ باہر بارش ہورہی ہے یا موسم خشک ہے ۔ ہم نے

دوردرشن کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ موسم کا حال نشر کرنے والے نیوز ریڈر کو اصولاً اس ٹاور کے اوپر بٹھانا چاہئے جہاں سے ٹیلی ویژن نشریات کو پھیلانے کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ یہ ممکن نہ ہو تو پھر اسے قطب مینار کی اوپری منزل پر بٹھایا جائے ۔ اس طرح نیوز ریڈر آسمان اور موسم دونوں سے حتی الامکان قریب رہیگا اور اسے موسم کا حال نشر کرنے میں سہولت رہے گی ۔ لیکن ہماری تجویز یہ کہہ کر مسترد کردی گئی کہ خبروں کو اسٹوڈیو کے سوائے کسی اور جگہ سے نشر نہیں کیا جا سکتا ۔ اچھی اور سچی تجویزوں کو یوں بھی کون مانتا ہے ۔ ہمیں مراسلہ نگار کی اس تجویز سے بھی سخت اختلاف ہے جس میں اس نے سرے سے محکمہ موسمیات کو ہی برخاست کرنے کا مطالبہ کیا ہے ۔ بھیا! غصہ میں ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں ۔ خدا کے فضل سے اس ملک میں سرکار کا ایک ہی محکمہ تو ایسا ہے جہاں دیانتداری اور ایمانداری پر سچے دل سے عمل کیا جاتا ہے ۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر اس محکمہ کو چھوڑ کر حکومت کے سارے محکموں کو برخاست کر دیا جائے تو اس ملک میں دائمی امن و سکون قائم ہو سکتا ہے ۔ عوام کی ساری پریشانیوں کا اصل سبب ہی یہ ہے کہ اس ملک میں کئی محکمے قائم ہیں ۔ اگر یہ نہ ہوں تو عوام کے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے ۔ محکمہ پولیس کو ہی لیجئے ۔ یہ محکمہ ابتداء میں اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ اس سے ملک میں امن و امان قائم ہو گا ۔ لیکن اب اس محکمہ کی سرپرستی میں کئی غنڈے ، بدمعاش اور مجرم پروان چڑھ رہے ہیں ۔ اور روز افزوں ترقی کر رہے ہیں ۔ عام آدمی حوالات میں بند رہتا ہے اور مجرم کھلے بندوں سماج میں دندناتے پھرتے رہتے ہیں ۔ آپ اس محکمہ کو برخاست کرنے کے بارے میں کیوں تجویز پیش نہیں کرتے ۔

ہمارے ہاں انسداد رشوت ستانی کا بھی ایک محکمہ قائم ہے جس میں سب سے زیادہ رشوت چلتی ہے ۔ یہ محکمہ رشوت ستانی کا انسداد نہیں کرتا بلکہ اسے "فروغ" دیتا ہے ۔ اس لئے ہم نے بہت عرصہ پہلے اس محکمہ کے بارے میں ایک جائز تجویز یہ رکھی تھی کہ اس محکمہ کو برخاست کر کے اس کی جگہ "فروغ رشوت ستانی" کا ایک الگ محکمہ قائم کیا جائے جس کے ذمہ یہ کام ہو کہ مختلف

محکموں میں مختلف کاموں کے سلسلہ میں لی جانے والی رشوت کی شرح مقرر کرے۔ ٹیلی فون خراب ہو جائے تو لائین مین کو کتنی رشوت دی جائے۔ راشن کی دکان، گیس کی ایجنسی اور پٹرول پمپ کا پرمٹ حاصل کرنے کی رشوت کیا ہوگی۔ اگر ایک بار مختلف کاموں کے لئے رشوت کے نرخ مقرر ہو جائیں تو اہل غرض کو بے پناہ سہولت حاصل ہوگی۔ اکثرا وقات رشوت کے نرخ طے نہ ہونے کی وجہ سے عوام کو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ ایک عہدیدار ایک کام کے دس ہزار روپے رشوت لیتا ہے تو دوسرا عہدیدار اسی کام کے صرف دس روپے لیتا ہے۔ رشوت کے نرخ میں اتنا بھاری فرق تو نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے اگر اس ملک میں "رشوت ستانی" کو قانونی حیثیت دیدی جائے اور رشوت کے نرخ مقرر کر دیئے جائیں تو عوام اطمینان اور چین کی زندگی جی سکیں گے۔ اگر کوئی شخص غصہ کی حالت میں صرف محکمہ موسمیات کو برخاست کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے تو ہم اس کے خلاف ہیں۔

بھیا ہم تو پورے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ حکومت کے سارے ہی محکموں کو برخاست کرنے کے حامی ہیں۔ البتہ محکمہ موسمیات کو برقرار رکھنے کے اس لئے قائل ہیں کہ ہمارے ہاں کوئی محکمہ تو ایسا باقی رہے جہاں رشوت کا چلن نہ ہو۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ ہماری باتوں کو مذاق میں ٹال دیتے ہیں حالانکہ ہم پتے کی باتیں کہتے ہیں۔ جن پر اگر حکومت سنجیدگی سے عمل کرے تو اس کا بھی بھلا ہوگا اور ہم جیسے عوام کا بھی بھلا ہوگا۔

(۳/اگست ۱۹۹۰ء)

کچھ حیدرآبادیوں کے بارے میں

ہمارے ایک غیر حیدرآبادی دوست کا کہنا ہے کہ حیدرآباد ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے ۔ ہم نے اعدادو شمار کی بنیاد پر ان سے اختلاف کیا تو بولے " آپ شہر حیدرآباد کی آبادی میں صرف ان لوگوں کو شامل کرتے ہیں جو حیدرآباد میں رہتے ہیں ۔ آپ ان حیدرآبادیوں کو شامل نہیں کرتے جو دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ دیگر شہروں کے لوگ کہیں بھی جاتے ہیں تو اپنے شہر کی شناخت کو بھول کر مقامی ماحول کا حصہ بن جاتے ہیں ۔ لیکن حیدرآبادی دنیا کے کسی بھی کونے میں رہے وہ حیدرآباد ہی میں رہتا ہے ۔ چنانچہ حیدرآباد اب حیدرآباد سے کہیں زیادہ بیرونی ممالک میں آباد نظر آتا ہے ۔ اس اعتبار سے یہ شہر ہندوستان کا سب سے بڑا شہر قرار پاتا ہے ۔"

کچھ برس پہلے ہم امریکہ گئے تھے تو ہمارے ایک پاکستانی دوست نے کہا تھا کہ حیدرآبادی امریکہ کے ہر گوشہ میں آباد ہیں ۔ کوئی پتھر اٹھائیے تو اس کے نیچے سے ایک حیدرآبادی فرشی سلام کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے ۔ حیدرآبادی سارا دن وقت بے وقت سلام کرنے میں گذار دیتے ہیں ۔ پتہ نہیں کام کب کرتے ہیں ۔ سچ پوچھئے تو ہم بھی ایک عرصہ تک بلا وجہ سلام کرنے کی عادت میں مبتلا رہے ۔ کسی نے پانی پیش کیا اور ہم نے سلام کیا ۔ کسی نے ہمارے لئے جگہ دی اور ہم نے سلام کیا ۔ کسی نے ہمارا مزاج پوچھا اور ہم نے سلام کیا ۔ ہمارے دوست اوتار سنگھ جج جو انگریزی کے صحافی ہیں ، ایک عرصہ تک ہماری اس عادت سے پریشان رہے ۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ تم نے آتے ہی مجھے سلام کردیا تھا ۔ پھر یہ بار بار سلام کرکے مجھے کیوں پریشان کرتے ہو ۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ محفلوں میں

ہمارے ان بے جا سلاموں پر روک لگانے کے لیے وہ ہمارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھے رہتے تھے کہ کہیں ہمارے ہاتھ سے سلام نہ سرزد ہو جائے ۔ ان کا کہنا ہے کہ حیدرآبادیوں کا سلام ، سلام برائے سلامتی نہیں ہوتا بلکہ صرف سلام برائے سلام ہوتا ہے جیسے ان دنوں ادب برائے ادب ہوتا ہے ۔ ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۵۶ ء کے بعد ہمارے اکثر دوست جب حیدرآباد کو چھوڑ کر بیرونی ملکوں میں آباد ہونے لگے تو دس بارہ برسوں تک ہم ان کا باضابطہ حساب کتاب رکھتے رہے کہ کونسا دوست کس ملک میں آباد ہے ۔ لیکن پچیس تیس برس پہلے جب اچانک خلیجی ممالک کے دروازے کھلے اور حیدرآبادی جوق در جوق ان ملکوں میں جانے لگے تو ہمارے لیے ان کا حساب کتاب رکھنا نا ممکن نظر آنے لگا ۔ حساب میں ہم یوں بھی کمزور ہیں ۔ پھر ہم نے اپنے حیدرآبادی احباب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں ۔ اب ہمیں خود نہیں معلوم کہ ہمارا کون سا دوست کہاں آباد ہے ۔ سعودی عرب میں ہے یا کویت میں ، قطر میں ہے یا دوبئی میں ، مسقط میں ہے یا دمام میں ۔ حساب کے اس گھپلے کی وجہ سے اس بار مسقط میں ہمارے ساتھ ایک دلچسپ صورتحال پیش آئی ۔ مسقط جانے سے پہلے ہم نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہاں کون حیدرآبادی دوست آباد ہے ۔ ہمیں کچھ یاد نہ آیا ۔ تاہم اتنا ضرور یاد تھا کہ ہمارے ایک حیدرآبادی دوست مہدی علی خاں جو میکانیکل انجینیر ہیں اور جو برسوں دوبئی میں مقیم رہے ، اب حال ہی میں مسقط میں آباد ہوئے ہیں ۔ ہم جس دوست کی دعوت پر مسقط گئے تھے ان کا تعلق اتر پردیش سے ہے ۔ لہذا ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ یوں تو مسقط میں ہمارے کئی حیدرآبادی احباب ہوں گے لیکن ایک دوست مہدی علی خاں حال ہی میں مسقط میں آباد ہوئے ہیں ۔ اگر ہو سکے تو انہیں ہماری آمد کے بارے میں بتادیں ۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہماری یہ چھوٹی سی خواہش مسقط میں ہمارے پانچ روزہ قیام کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی ۔ ہمارے میزبان ہمایوں ظفر زیدی نے پہلے تو مسقط کے حیدرآبادیوں کو تلاش کیا ۔ پھر ان حیدرآبادیوں میں سے " مہدی علی خانوں " کو ڈھونڈنا شروع کر دیا ۔ ہم مسقط پہونچے تو ہمایوں نے کہا " آپ نے

فون پر مہدی علی خاں کے بارے میں کہا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ آپ کے حیدرآبادی دوست مہدی علی خاں کیا کام کرتے ہیں۔ لہذا مجھے جتنے بھی حیدرآبادی مہدی علی خاں ملے میں نے انہیں آپ کی آمد کے بارے میں بتا دیا ہے۔ اب تک جملہ پانچ مہدی علی خاں ملے ہیں۔ ان میں سے جو بھی آپ کے کام کا مہدی علی خاں ملے اس سے مل لیجیے۔"

دوسرے دن ہم صبح صبح گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک عدد مہدی علی خاں کا فون آگیا۔ ہم نے خوشی خوشی کہا "مہدی علی خاں صاحب دیکھئے آپ کو ڈھونڈھ ہی نکالا۔ کیسے ہیں آپ؟"

بولے "اچھا ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" ہم نے کہا "ہم تو اچھے ہیں۔ مگر آپ کی آواز سے تو لگ رہا ہے کہ آپ اچھے نہیں ہیں۔ خاصی بھاری آواز ہے۔ کیا نزلہ اور زکام میں مبتلا ہیں"۔

بولے "جی نہیں! ادھر ایک برس سے تو کبھی نزلہ اور زکام میں مبتلا نہیں ہوا۔ خیر چھوڑیئے۔ مسقط میں آپ کا آنا مبارک ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔"

ہم نے تھوڑی دیر میں اندازہ لگایا کہ ہم جن صاحب سے بات کر رہے ہیں وہ مہدی علی خاں تو ہیں لیکن ان کی آواز ان مہدی علی خاں کی نہیں ہے جن سے ہماری دوستی ہے۔ ہم نے کہا "مہدی علی خاں صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ زکام کے بارے میں بعد میں بات ہوگی۔ پہلے یہ بتایئے کہ آپ ہمارے دوست محمد میاں کے سمدھی ہیں نا؟"

دوسری طرف سے مہدی علی خاں نے کہا "حضور! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی تو خود میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ میں کسی کا کیسے سمدھی بن سکتا ہوں۔ بہر حال چلئے اس بہانے آپ سے بات ہوگئی۔ میں آپ کے جلسہ میں ضرور آؤنگا۔ خدا حافظ۔"

ہماری بات چیت کو سن کر ہمایوں نے کہا "چلئے ایک مہدی علی خاں کا فون تو آگیا۔ اب چار مہدی علی خانوں کے فون آنے باقی ہیں۔" ہم دوبارہ

ہونے کی کوشش کرنے لگے تو پھر فون کی گھنٹی بجی۔ پتہ چلا کہ ایک اور مہدی علی خاں کا فون آیا ہے۔ ہم نے ہمالیوں سے کہا "بھیا! اب تم ہی ان مہدی علی خاں سے نپٹو۔ ان سے پوچھو کہ کیا وہ میکانیکل انجینیر ہیں؟ اگر ہیں تو پوچھو کہ کیا وہ ہمارے دوست کے سمدھی ہیں"۔ ہمالیوں نے بات کی تو پتہ چلا میکانیکل انجینیر نہیں بلکہ الیکٹریکل انجینیر ہیں۔ ایک کوالیفیکیشن یہ بھی بتائی کہ ہمارے مدّاح ہیں اور ہمارے مضامین پڑھتے رہتے ہیں۔ چنچل گوڑہ کے رہنے والے ہیں۔ ہم سے ملنے کے متمنی نظر آئے تو ہم نے انہیں جلسہ میں آنے کی دعوت دیدی۔ غرض دوپہر ہونے تک ہم نے پانچوں مہدی علی خانوں کے فون ریسیو کئے لیکن ان میں سے کوئی بھی مطلوبہ مہدی علی خان نہ نکلا۔ ایک مہدی علی خاں تو ایسے بھی نکلے جو مسقط کے ایک ہوٹل میں خانساماں ہیں۔ بہت اصرار کرتے رہے کہ ہم مسقط میں قیام کے دوران میں ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں۔ چونکہ ہماری مزاح نگاری سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ اس لئے ہمیں ان کے لہجہ میں بے پناہ پیار اور خلوص نظر آیا۔ وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ حیدرآباد نے نہ صرف اچھے خانساماں پیدا کئے ہیں بلکہ اچھے مزاح نگار بھی پیدا کئے ہیں۔ خیر وہ جلسہ میں تو نہ آسکے البتہ باقی چاروں غیر مطلوبہ مہدی علی خاں جلسے میں موجود تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمارے دوست مہدی علی خاں کو عین جلسہ کے دن ہماری آمد کا پتہ چل گیا اور وہ بھی باقی مہدی علی خانوں کے ہمراہ جلسہ میں موجود تھے۔ بہت شرمندہ تھے کہ ان کی تلاش میں کئی غیر ضروری مہدی علی خانوں سے ہماری ملاقات ہو گئی۔ ہمالیوں کہنے لگے "مجھے یہ تو پتہ تھا کہ مسقط میں کئی حیدرآبادی آباد ہیں لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ ان میں سے اتنے سارے ... علی خاں بھی یہاں آباد ہیں"۔

اصلی مہدی علی خاں اگرچہ ہمیں دیر سے ملے لیکن یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ان کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ ہمیں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کھانا کھلایا جائے۔ ایک دن وہ ہمیں ایک نخلستان میں بھی لے گئے جو مسقط سے سوا سو کیلو میٹر دور واقع ہے۔ اس کا نام "نخل" ہے۔ دو تین پہاڑیوں کے بیچ میں

ے پانچ چھ چھوٹے چھوٹے چشمے نکلتے ہیں ۔ کھجور کے چند درخت ہیں ۔ یہاں وہاں کچھ پانی بھی دکھائی دیتا ہے ۔ بس اس کو عمان والوں نے تفریح گاہ بنا دیا ہے ۔ جتنے پانی کو دیکھ کر لوگ یہاں خوش ہوتے ہیں اتنا پانی تو نل کی پائپ لائین خراب ہونے کی صورت میں ہماری اکثر سڑکوں پر بہتا رہتا ہے ۔ بہر حال ہر ایک کے خوش ہونے کے الگ الگ طریقے ہیں ۔ مسقط میں ہمیں اور بھی کئی حیدرآبادی ملے ۔ مسقط ایرپورٹ پر ہمیں لینے کے لیے دو حیدرآبادی احباب ڈاکٹر عبد الحیٔ اور ادریس مشہدی بھی آئے تھے ۔ ڈاکٹر عبد الحیٔ (جن کے ہاں یوسف ناظم مقیم تھے) کا شمار مسقط کے مشہور ڈاکٹروں میں ہوتا ہے ۔ ہر دم مریضوں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں (بعض مریض بھی ان کی کچھ کم خدمت نہیں کرتے) اور دوسری طرف ادریس مشہدی اصلاً حیدرآبادی ہیں مگر براہ بمبئی مسقط میں مقیم ہیں ۔ حیدرآباد کے سارے فنکاروں ، ادیبوں اور شاعروں کو جانتے ہیں ۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ مزاح نگاروں کی محفل میں شرکاء کی ایک تہائی تعداد حیدرآبادیوں پر مشتمل تھی ۔ ہماری دعا ہے کہ حیدرآبادی جہاں بھی رہیں خوش رہیں اور حیدرآباد کی یاد کو اپنے سینوں میں بسائے رکھیں ۔ (۲۱ / جنوری ۱۹۹۶ ء)

گلبرگہ میں چار دن

صاحبو! ہم جب بھی بیرون ملک کے کسی ایسے شہر سے لوٹتے ہیں جو عصری ضرورتوں اور آسائشوں سے آراستہ ہوتا ہے تو ہم واپس ہوتے ہی کچھ عرصہ اپنے ملک کے کسی چھوٹے سے قصبہ یا شہر میں گزارنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے ملک کے بڑے شہروں میں آدمی رہتا کم ہے اور معلق زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ دلی میں اتنے لمبے عرصہ تک رہنے کے باوجود آج تک ہمیں یقین نہیں آیا کہ ہم اس شہر میں واقعی آباد ہیں۔ سارا دن ایک قطار سے نکل کر دوسری قطار میں جاتے رہتے ہیں۔ ابھی ٹریفک کے سگنل پر کھڑے مکھیاں مارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو دوسرے ہی لمحہ کسی دفتر کے آگے ہی قطار میں جاکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ دلی میں آدمی رہتا کم ہے اور لٹکتا ہوا زیادہ پایا جاتا ہے۔ یادش بخیر پندرہ بیس برس پہلے دلی میں ایک سرکاری ہوٹل نیا نیا کھلا تھا (اب بھی موجود ہے) اس کا کرایہ نہایت واجبی اور معقول تھا لیکن اس میں جو لفٹیں لگی ہوئی تھیں وہ کچھ اتنی سست رفتار تھیں اور یہاں مسافروں کی اتنی بھیڑ رہتی تھی کہ مسافر کو سولھویں یا اٹھارویں منزل پر جانا ہوتا تھا تو اس کام میں پورا ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ ایک دن ہم سید رحمت علی سابق رکن پارلیمنٹ کے گھر پر بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے اس سرکاری ہوٹل کی تعریف کرتے ہوئے کہا" چاہے کچھ بھی ہو یہاں کمرہ کا کرایہ نہایت واجبی ہے" ہم نے کہا" کمرہ کا کرایہ واجبی نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا کیونکہ اس ہوٹل میں ٹھہرنے والا مسافر کمرہ میں کم اور لفٹ میں زیادہ رہتا ہے۔" بعد میں رحمت علی صاحب نے ہمارا یہ جملہ اس وقت کے وزیر سیاحت کو سنادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لفٹ

کی رفتار فوراً بڑھ گئی لیکن ہوٹل کے کمرہ کے کرایہ میں اضافہ ہوگیا۔ ہمیں یہ بات اس لئے یاد آئی کہ بڑے شہر میں رہنے والا آدمی اسی طرح زندہ رہتا ہے جس طرح کسی زمانے میں مذکورہ بالا ہوٹل کے مسافر کمرہ میں کم اور لفٹ میں زیادہ رہا کرتے تھے۔ آپ ہندوستان کے کسی بھی بڑے شہر کی زندگی کا جائزہ لیجیے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ گھر میں کم اور لفٹ میں زیادہ رہتے ہیں۔ گویا ہمیشہ کہیں نہ کہیں لٹکے رہتے ہیں۔ پھر دلی تو وہ شہر ہے جہاں ہر معاملہ کو لٹکایا جاتا ہے۔ پھر بھی بڑے شہروں میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو ہر دم اپنے چھوٹے پن کا احساس ہوتا رہتا ہے بلکہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑا آدمی چھوٹے قصبوں میں اور چھوٹا آدمی بڑے شہروں میں ہی پایا جاتا ہے۔

توبہ کیجیے۔ ہم بھی کیا بڑے شہروں کا ذکر لے بیٹھے۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ ہم دوبئی سے واپس آتے ہی گلبرگہ چلے گئے تھے اتنی لمبی تمہید لکھ دی۔ بڑے شہروں میں رہنے کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی ذات میں بڑے شہروں کی طرح ہی بکھراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ ہمارے گلبرگہ جانے کی ایک بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ سلیمان خطیب میموریل ٹرسٹ کی سکریٹری اور سلیمان خطیب مرحوم کی صاحبزادی ڈاکٹر شمیم ثریا نے وہاں آنے جانے کا کرایہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سلیمان خطیب میموریل ٹرسٹ پچھلے کئی برسوں سے ان طلبہ کو گولڈ میڈل اور خصوصی انعامات دیتا ہے جنھوں نے ریاست کرناٹک کے ایس ایس سی کے امتحان میں اردو ذریعہ تعلیم سے پہلی دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی ہو۔ ڈاکٹر شمیم ثریا اپنے والد مرحوم کا سالانہ عرس تو نہیں مناتیں البتہ ان طلبہ میں تقسیم انعامات کی سالانہ تقریب ضرور منعقد کرتی ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کی اولاد معنوی اور اولاد حقیقی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شاعر کی اولاد معنوی یعنے شعر بھلے ہی بحر سے خارج نہ ہوں لیکن ان کی اولادِ حقیقی اکثر صورتوں میں بحر سے خارج ہوتی ہے۔ سلیمان خطیب مرحوم نے اپنی اولاد بھی اسی اہتمام سے پیدا کی جس اہتمام سے وہ شعر کہتے تھے۔ چنانچہ سلیمان خطیب کے کئی حقیقی شعر امریکہ میں آباد ہیں اور مزے میں ہیں۔ البتہ شمیم ثریا

اپنے والد کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ہندوستان میں رہ گئیں ۔ انہوں نے سوچ بچار کے بعد نوجوان طلبہ کو سالانہ انعامات دینے کا سلسلہ شروع کر کے اپنے والد کی یاد کو نوجوان نسل سے جوڑ دیا تاکہ وہ نسل بعد نسل یاد آتے رہیں ۔ ہم جب گلبرگہ جانے لگے تو یاد آیا کہ سلیمان خطیب کو ہم سے بچھڑے ہوئے پورے بیس برس بیت گئے ۔ وقت بھی کیا ظالم چیز ہے ۔ یوں لگتا ہے ابھی کل کی بات ہے کہ سلیمان خطیب اسٹیج سے " چھورا چھوری "سنا رہے ہیں اور " پگڈنڈی " سنا رہے ہیں ۔

سلیمان خطیب کی کتنی ہی باتیں یاد آگئیں ۔ ان کا یہ معصوم مفروضہ بھی یاد آیا کہ اچھی مزاح نگاری کے لئے آدمی کا گلبرگہ میں پیدا ہونا ضروری ہے ۔ وہ اپنے اس معصوم مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے پہلے تو اپنے آپ کو اور پھر ہمیں بطور دلیل پیش کرتے تھے ۔

سلیمان خطیب ان معدودے چند فنکاروں میں سے تھے جو شعر کہنے کے معاملہ میں تو نہایت پختہ کار تھے لیکن عملی زندگی کو برتنے کے معاملہ میں بسا اوقات بچوں اور نوجوانوں کا سا رویہ رکھتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اندر ایک گہرا تجسس اور تحیّر آخر وقت تک برقرار رہا ۔ سلیمان خطیب میموریل گولڈ میڈل کی تقسیم کی تقریب میں سلیمان خطیب کے کئی چاہنے والے موجود تھے ۔ مگر ہمیں تو اپنے آپ کو ان کمسن طلبہ کے درمیان پاکر خوشی ہوئی جنھیں انعام ملا تھا ۔ ان بچوں نے تقریب میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا اور ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ان طلبہ کی تقریروں سے ان کے والدین کی علمی قابلیت اور لیاقت کا اظہار نہیں ہوا ورنہ عموماً ایسے موقعوں پر بچے جب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو اصل میں وہ ان کے والدین کے خیالات ہوتے ہیں ۔ بچے غلطی نہ کریں تو کم از کم ہمیں تو ان کی لیاقت مشکوک نظر آتی ہے ۔ اس دن بچوں نے اپنی تقریروں میں بعض غلطیاں بھی کیں جو نہایت ضروری تھیں ۔ ایسی غلطیاں وہ نہ کریں تو زندگی میں کامیاب کیسے ہوں ۔ ہمیں اس وقت پاکستان کے مشہور شاعر ، ڈرامہ نویس کالم نویس اور ہمارے دوست امجد اسلام امجد کی یاد آئی جو کسی زمانے میں لاہور کے ایک کالج میں اردو پڑھایا کرتے تھے ۔ انہوں نے

ایک تحریری امتحان میں طلبہ سے کہا کہ وہ بعض محاوروں کو جملوں میں استعمال کریں ۔ ایک محاورہ تھا" کلنک کا ٹیکہ لگنا ۔ "اس پر ایک طالبہ نے کلنک کے ٹیکے کو جملہ میں اس طرح استعمال کیا تھا " کل میرے گھر میں سب نے کلنک کا ٹیکہ لگوایا ۔ میں گھر پر نہیں تھی ۔ اسی لئے کلنک کا ٹیکہ نہیں لگوا سکی ۔ مگر میں بھی اوّلین فرصت میں کلنک کا ٹیکہ لگوالونگی ۔ " امجد نے یہ جملہ سنا کر جب ہنسنا شروع کیا تو ہم نے کہا " اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ۔ کلنک کا ٹیکہ لگنے والا محاورہ اس زمانے کا ہے جب ہیضہ ، طاعون اور معیادی بخار جیسی بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے ابھی ایجاد نہیں ہوئے تھے ۔ اس طالبہ نے تو " کلنک کے ٹیکے " کو ایک صحت مند پس منظر میں استعمال کیا ہے ۔ وہ ایسا ٹیکہ لگوانا چاہتی ہے جس سے وہ " کلنک " سے محفوظ رہ سکے ۔ اس میں طالبہ کی کیا غلطی ہے ؟ " اس پر امجد اسلام امجد نے ہمیں حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا " اگر ایسی بات ہے تو تم بھی لگوالو کلنک کا ٹیکہ ۔ "

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بچّے جب ایسی معصوم غلطیاں کرتے ہیں تو سچّے اور کھرے معلوم ہوتے ہیں ۔ جن طلبہ نے سلیمان خطیب گولڈمیڈل حاصل کیا ہے ہمیں بھی وہ سچّے اور کھرے ہی لگے اور ہماری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں ۔ گلبرگہ میں اس بار ہم نے ذرا زیادہ عرصہ تک قیام کیا اور اپنی نوجوانی کے دنوں کو یاد کیا ۔ ہمارے رفیق دیرینہ وہاب عندلیب بھی ملے جو اب خیر سے 64 برس کے ہوچکے ہیں لیکن اب بھی پینتیس چالیس برس کے لگتے ہیں ۔ دروغ بر گردن راوی کسی نے بتا یا تھا کہ دس بارہ برس پہلے جب وہ ایک انٹرمیڈیٹ کالج میں پرنسپل کے عہدہ کا جائزہ حاصل کرنے کے لئے پہنچے تو اسکول کے چوکیدار نے انہیں پرنسپل کے کمرہ کی طرف لیجانے کے بجائے بارہویں جماعت کی ایک بنچ پر لیجا کر بٹھا دیا تھا ۔ اس بار تو ہم نے بھی وہاب عندلیب سے شکایتاً کہا " حضور آپ نے چالیس برس کی عمر کا دکھائی دینے کی کوشش میں پورے 64 برس لگادیئے ۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو تضیع اوقات ہے ۔ ہمیں دیکھئے کہ 63 برس کے ہیں تو 63 برس کے ہی لگتے ہیں "

گلبرگہ کے اکثر احباب سے بھی ہمیں یہی شکایت ہے کہ وہ قول اور فعل کے بہت پکے ہوتے ہیں۔ ہمیں بہت پہلے جس حالت میں ملے تھے آج بھی اسی حالت میں دکھائی دیتے ہیں۔ حامد اکمل بھلے ہی اب پختہ اور اعلیٰ پایہ کے شعر کہتے ہوں لیکن اب بھی ہائی اسکول کے طالب علم دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر ہاشم علی سے لگ بھگ چالیس برس پہلے جب ہم ملے تھے تو انہوں نے ہمیں علامہ اقبالؔ کا ایک شعر سنایا تھا۔ ماشاللہ اس بار بھی وہی شعر سنایا۔ مجیب الرحمٰن صاحب کو جس جھولے کے ساتھ پہلے پہل دیکھا تھا وہ جھولا یا ہوبہو ویسا ہی جھولا اب بھی ان کے پاس ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں جو چیزیں اس وقت تھیں اب موجود نہ ہوں۔ آج بھی وہ علم کا دریا اسی روانی کے ساتھ بہاتے ہیں جس روانی کے ساتھ وہ پہلے بہاتے تھے۔ بات میں ایسے ایسے نکتے نکالتے ہیں کہ اصل بات کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

ہمیں تو سارا گلبرگہ " تھرماس " میں رکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہم جب بھی گلبرگہ جاتے ہیں تو اردو کی محقق، مزاح نگار اور پروفیسر ڈاکٹر لئیق صلاح ہمیں خالص عربی کھانا ضرور کھلاتی ہیں۔ اس بار بھی وہی کھلایا (یہ نہ سمجھا جائے کہ پچھلی دفعہ جو کھانا بنایا تھا وہی کھانا کھلایا۔ یہ بالکل تازہ تھا) اس عربی کھانے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اسے کھانے کے بعد عربی کے سوائے ہر زبان کے معنی ومطالب روشن ہوجاتے۔

گلبرگہ میں خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی تو بہت پہلے سے ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے بعض دوست جیسے عبدالعظیم، عبدالحمید، اقبال احمد سرڈگی، ڈاکٹر ناصر بن علی اور ڈاکٹر رحمت اللہ وغیرہ تعلیمی ادارے چلانے میں دن رات مصروف ہیں جس کی وجہ سے گلبرگہ اب ایک اہم تعلیمی مرکز بن گیا ہے۔ ملک میں تعلیم یافتہ بیروزگاروں کی تعداد میں یہ جو آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے تو اس میں گلبرگہ کا بڑا حصہ ہے۔ جسے دیکھئے یا تو پڑھ رہا ہے یا پڑھا رہا ہے۔ جو پڑھ نہیں سکتا وہ پٹی ہی پڑھا دیتا ہے۔ غرض سلیمان خطیب ٹرسٹ کی تقریب کی وجہ سے ہمیں گلبرگہ میں بہت عرصہ بعد ذرا اطمینان سے رہنے کا موقعہ ملا۔ چار دن

بہت ہوتے ہیں ۔ بہادر شاہ ظفر نے تو چار دن کی عمر دراز میں سے دو دن آرزو میں اور بقیہ دو دن انتظار میں گزار دیئے تھے ۔ یہ اور بات ہے کہ ان ہی چار دنوں میں سے انہوں نے اپنے بیٹوں کے کٹے ہوئے سروں کو دیکھنے کا وقت بھی نکال لیا تھا ۔ ہم نے بھی اسی طرح اپنے عزیز دوست ڈاکٹر طیب انصاری سے ملنے کا وقت نکال لیا ۔ طیب انصاری گلبرگہ میں یوں رہتے ہیں جیسے کسی زمانہ میں فانی بدایونی حیدرآباد میں رہا کرتے تھے ۔ ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور ۔ ان سے کسی تقریب میں ملاقات نہ ہوئی تو ہم ان کے گھر گئے ۔ دیکھا کہ گھر کا ساز وسامان باندھ کر کوچ کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں پتہ چلا ان کا تبادلہ گرمنکال ہوگیا ہے جو گلبرگہ سے بھی چھوٹا ہے ۔ ہم نے انہیں مبارکباد دی کہ " بڑا آدمی جب چھوٹے شہر میں جاتا ہے تو وہ آدمی اور بھی بڑا ہو جاتا ہے ۔ اسی چکر میں تو ہم گلبرگہ آئے ہیں اور تم گرمنکال جارہے ہو ۔ " طیب انصاری نے ہمارے طنز کو بھانپ کر ہمیں اور گلبرگہ کے بعض احباب کو حسبِ معمول دو چار گالیاں دیں اور حسب معمول بہت محبت سے ملے ۔ طیب کی یہی حسبِ معمول ادا تو ہمیں بہت پسند ہے ۔

گلبرگہ کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ہم اس طالبہ کا بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اردو زبان وادب سے بے پناہ دلچسپی رکھتی ہے ۔ ہم سے ملنے کے لیے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ آئی ۔ ہمارے کئی مضامین اسے یاد ہیں ۔ ہم نے اتنی محنت سے ان مضامین کو نہیں لکھا ہوگا جتنی محنت سے اس نے انہیں یاد کر رکھا ہے ۔ کہنے لگی " میں آپ سے اتنی ہی عقیدت رکھتی ہوں جتنی عقیدت مادھوری ڈکشٹ کو ایم ایف حسین سے ہے "

ہم نے ہنس کر کہا " بی بی ! کہاں ہم اور کہاں ایم ایف حسین ۔ ایم ایف حسین تو خیر ہم کبھی نہیں بن سکتے البتہ تم ضرور مادھوری ڈکشٹ بن سکتی ہو ۔ " ہمارے جواب سے خوش ہو کر اپنی آٹوگراف بک ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولی " آپ کا بہت بہت شکریہ ! یہی بات ذرا اس آٹوگراف بک میں لکھ دیجیے ۔ " ہم نے اس عزیزہ کے روشن مستقبل کے لئے دعائیں دیں اور دہلی واپس چلے آئے ۔ (١٩ اکتوبر ١٩٩٧ء)

نئے سال کی پیشگی مبارکباد ملنے پر

نئے سال کے آنے میں ابھی پورے پندرہ دن باقی ہیں اور آج ہمارے پاس امریکہ سے نئے سال کا ایک تہنیتی کارڈ آیا ہے جسے ہمارے ایک دوست نے بھیجا ہے۔ اسے پاکر ہمیں ایک تعزیتی جلسہ کی یاد آگئی جو ایک بزرگ شاعر کے گزر جانے کی جھوٹی اطلاع ملنے پر برسوں پہلے ایک انجمن کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ ابھی یہ تعزیتی جلسہ جاری تھا کہ کسی نے آکر یہ اطلاع دی کہ بزرگ شاعر نے ابھی تک آخری ہچکی نہیں لی ہے اور یہ کہ موصوف کے بدن میں دو چار سانسیں اور باقی رہ گئی ہیں۔ اس اطلاع کو پاکر منتظمین بہت شپٹائے اور احساسِ ندامت کے مارے اس تعزیتی جلسہ کو اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ بزرگ شاعر سچ مچ اس دنیا سے گزر نہیں گئے۔ بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال تھا کہ موصوف کی رحلت کا ایک سبب خود یہ تعزیتی جلسہ بھی تھا۔ ہمیں بھی اس جلسہ میں مرحوم کے بارے میں اظہار خیال کرنا تھا بلکہ جس وقت ہم اظہار خیال کر رہے تھے عین اسی وقت جلسہ کے ایک منتظم نے چپکے سے ایک پرچہ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا کہ مرحوم کی خوبیوں اور اوصاف حمیدہ کی تعداد میں مزید کچھ اضافہ فرمایئے اور اپنی تقریر دلپذیر کا سلسلہ جاری رکھئے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ہم نے سمجھا کہ مرحوم کی خوبیوں کے بیان میں شاید ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ حالانکہ ہم اس وقت تک ان کی ذات میں وہ خوبیاں بھی تلاش کرچکے تھے جو ان کی ذات میں سرے سے موجود ہی نہیں تھیں۔ یوں بھی آدمی جب مرجاتا ہے تو اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ آدمی کم اور فرشتہ زیادہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ ایک شخص بڑا ظالم اور جابر تھا اور اپنے

بیوی بچوں پر بے پناہ مظالم ڈھایا کرتا تھا جب اس کا انتقال ہوا تو پادری نے اس شخص کے تابوت کے سامنے دعائیہ تقریر کرتے ہوئے اس کی انسان دوستی، رحمدلی، مروت، وسیع القلبی اور سچائی کی اتنی تعریف کی کہ اس شخص کی اہلیہ مشکوک ہوگئی اور اس نے تابوت کو کھلوا کر دیکھ لیا کہ کہیں تابوت میں اس کے شوہر کے بجائے کسی اور کی نعش موجود نہ ہو۔ یہ ایک لطیفہ معترضہ تھا۔ بہرحال منتظمین نے جب بزرگ شاعر کی ذات میں مزید خوبیاں تلاش کرنے کی خواہش کی تو ہم نے پوری فراخ دلی کے ساتھ بالآخر اپنی نجی خوبیاں بھی بزرگ شاعر کے کھاتہ میں ڈالنا شروع کردیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ تعزیتی جلسہ ان بزرگ شاعر کا نہ ہو بلکہ خود ہمارا ہو۔ مانا کہ ہم بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں اور ہم میں وہ اوصاف حمیدہ ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں لیکن انسان کی خوبیوں کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم اپنی خوبیاں گناتے گناتے تھک کر نڈھال ہوگئے اور ہمیں یہ محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنی خوبیاں بیان کرتے کرتے خود رحلت کر جائیں گے تو چار و ناچار اپنی تقریر ختم کی۔ اس پر منتظمین نے ایک اور مقرر کو اظہار خیال کی دعوت دیتے ہوئے آگاہ کیا کہ جب ہم تازہ دم ہوجائیں گے تو مرحوم کی مزید خوبیاں بیان کریں گے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ دوسرا مقرر بھی جب نڈھال ہو رہا تھا تو عین اسی وقت یہ خوش خبری پہنچی کہ بزرگ شاعر سچ مچ گزر گئے۔ پہلی بار کسی تعزیتی جلسہ کے منتظمین کو جتنا خوش اور مسرور پایا اتنا کبھی نہیں پایا۔ جلسہ جو تعزیتی تھا اچانک مسرت وشادمانی کے جشن میں تبدیل ہوگیا۔

نئے سال کا تہنیتی کارڈ قبل ازوقت پانے پر ہمیں اس تعزیتی جلسہ کی یاد اس لئے آگئی کہ جاریہ سال کے ختم ہونے میں ابھی پورے پندرہ دن باقی ہیں اور ہم ابھی سے نئے سال کی مبارکباد قبول کریں تو کیونکر کریں۔ ہمیں یوں لگ رہا ہے جیسے جاریہ سال کے ختم ہونے تک ہمیں اس کی خوبیوں کے بارے میں اظہار خیال کرنا ہوگا۔ آج کی تیز رفتار زندگی میں پندرہ دن بہت ہوتے ہیں اور ان پندرہ دنوں میں بہت کچھ ہوسکتا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسابقت کی دوڑ اور انسانوں کی بھیڑ میں پندرہ دنوں کا یہ عرصہ کچھ بھی نہیں ہے۔

آپ پندرہ دنوں کی بات کرتے ہیں ہم تو پندرہ برسوں سے اپنے ایک نجی معاملہ کی یکسوئی کا انتظار کر رہے ہیں لیکن یہ خوش خبری آج تک نہیں آئی ۔ حالانکہ اس عرصہ میں ہم ہر سال بڑی پابندی کے ساتھ اپنے چاہنے والوں کے ہاں سے تہنیتی کارڈ وصول کرتے آئے ہیں ۔ جن میں اس تمنّا کا اظہار کیا جاتا ہے کہ نیا سال ہماری جھولی میں خوشیاں ہی خوشیاں بھردے ۔ حالانکہ ہماری جھولی اب اتنی بوسیدہ ہوچکی ہے کہ اگر خدانخواستہ دوچار بھاری بھرکم خوشیاں اس میں گر پڑیں تو پھٹ کر تار تار ہوجائے گی ۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ پچھلے پینتالیس برسوں سے ہمارے پاس بڑی پابندی کے ساتھ نئے سال کے تہنیتی کارڈ آتے ہیں ۔ ہماری زندگی کے ابتدائی اٹھارہ برس تو کچھ ایسے گزرے کہ کسی کے دل میں ہمارے لئے نیک تمنائیں پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں اور کسی کو ہماری خوشی کا خیال ہی نہیں آیا تھا ۔ آتا بھی کیسے کہ اس وقت تک خود ہمارے دل میں کوئی تمنا نہیں جاگی تھی اور ہم نے دنیا کو صرف سیدھی نظر سے دیکھا تھا ۔ ترچھی نظر سے بالکل نہیں دیکھا تھا ۔ آدمی دنیا اور اس کے باسیوں کو جب ترچھی نظر سے دیکھنے کے قابل ہوجاتا ہے تو تب ہی اس کے لئے لوگوں کے دلوں میں نیک تمنائیں پیدا ہوتی ہیں ۔ اس زمانے میں اگرچہ تہنیتی کارڈ دو چار ہی آتے تھے لیکن جو بھی آتے تھے وہ اتنے بھاری بھرکم ہوتے تھے کہ اب سیکڑوں تہنیتی کارڈوں کو پاکر بھی اتنی خوشی نہیں ہوتی ۔ ایک تہنیتی کارڈ تو ایسا بھی آتا تھا جسے ہم گھر سے باہر لیجا کر کھولتے تھے ۔ محض اس ڈر سے کہ کہیں سارا گھر معطر نہ ہوجائے ۔ پھر بھی اسے کھولنے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری کائنات معطر ہوگئی ہے ۔ اگرچہ اس کارڈ کو پانے کے بعد بھی عملاً ہماری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہوتا تھا لیکن سال بھر ایک خوشبو سی ہمارے ساتھ رہا کرتی تھی ۔ پھر دو ایک برس بعد تہنیتی کارڈ کی یہ خوشبو بھی اچانک معدوم ہوگئی ۔ پھر پورے تیس برس بعد ہم نے خوشبو سے وابستہ اس پیکر کو ایک مغربی ملک میں دیکھا تو بڑی دیر تک دیکھتے رہ گئے ۔ ہمیں دیر تک دیکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس سابقہ پری پیکر کی حیثیت اب دیو پیکر

کی ہو چکی تھی ۔ فاضل گوشت اور چربی سے ڈھکے ہوئے اس پیکر میں سے تیس برس پہلے کے پیکر کو برآمد کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی ۔تاہم اچانک اُس بیتی خوشبو کی یاد آگئی جس میں ہم نے اپنی زندگی کے ڈیڑھ دو برس گذارے تھے ۔ وقت جب گذرتا ہے تو شخصیتوں کو اسی طرح روندتا ہوا نکل جاتا ہے ۔سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اب اپنا ماضی خود کسی اور کا ماضی نظر آتا ہے ۔ ایسے میں بھلا کسے فکر کہ کوئی اس کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرے ۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ نئے سال کی آمد کے بکھیڑے میں ہماری زندگی کے ہر برس کے کم و بیش ڈیڑھ دو مہینے اس طرح گزر جاتے ہیں کہ خواہ مخواہ لوگوں کی نیک تمنائیں ، جن کی ہمیں ضرورت نہیں ہوتی ، قبول کرتے رہو اور اپنی نیک تمنائیں ، جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا ، لوگوں تک پہنچاتے رہو ۔ اگر یہ مصروفیت نہ ہوتو ہم اپنا وقت کسی اور بیہودہ کام میں ضائع کرسکتے ہیں ۔ وقت تو ایک بہتا ہوا دریا ہے اور کس کی مجال ہے کہ اس بہتے ہوئے دریا کو ہفتوں ، مہینوں اور برسوں کے حساب سے کاٹ کر الگ کرلے ۔ ہم تو ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر بھی کوئی لکیر کھینچنے کے اہل نہیں ہیں ۔

تاہم کبھی کبھار ہمیں ان تہنیتی کارڈوں کا ایک مقصد بھی نظر آتا ہے ۔ تیس برس پہلے کی بات ہے کہ ہم نے اپنے ایک دوست سے سو روپے ادھار لئے تھے جو ہم اس وقت کے اپنے معاشی حالات کی وجہ سے لوٹا نہیں سکے تھے ۔ اگرچہ اس دوست نے کبھی ان روپیوں کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا لیکن جب نیا سال آیا تو ہمیں اس کے پاس سے ایک خوبصورت تہنیتی کارڈ وصول ہوا جس میں اس تمنا کا اظہار کیا گیا تھا کہ نیا سال ہمارے لئے خوشحالی کا پیغام لے آئے ۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہمارے دوست نے اس تہنیتی کارڈ میں ہمارے لئے صرف اتنی ہی خوشحالی مانگی ہے کہ ہم اس کے سو روپے واپس کرنے کے اہل بن جائیں ۔ چنانچہ اس سال ہم سچ مچ خوشحالی کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہ آئی ۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ہمارا یہ دوست ہندوستان سے باہر چلا گیا ۔ ہم نے سوچا کہ کم از کم اگلے برس ہمارا یہ دوست ہماری خوشحالی کی دعا نہیں مانگے گا ۔ لیکن جب

نئے سال کی پیشگی مبارکباد ملنے پر

دوسرا نیا سال آیا تو ہمیں اس دوست کا یوروپ سے پھر ایک تہنیتی کارڈ وصول ہوا جس میں اس نے پھر وہی رٹ لگا رکھی تھی کہ نیا سال ہمارے لئے خوشحالی کا موجب بنے۔ یقین مانئے ہمارا یہ دوست لگاتار پچیس برسوں تک یورپ میں بیٹھ کر ہمارے لئے خوشحالی اور خوشیوں کی نیک تمنائیں بھیجتا رہا لیکن قدرت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ پھر یوں ہوا کہ ہمارا یہ دوست نہ صرف ہماری خوشحالی بلکہ خود اپنی خوشحالی سے بے نیاز ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ہوسکتا ہے اس نے پوری نیک نیتی کے ساتھ ہمارے لئے خوشحالی کی دعائیں کی ہوں لیکن ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ وہ اپنے سو روپیوں کی واپسی کی حد تک ہماری خوشحالی میں دلچسپی رکھتا ہے۔ حالانکہ اس عرصہ میں اس نے یورپ سے نہایت قیمتی تہنیتی کارڈ بھیجنے میں ہم پر سینکڑوں روپے خرچ کر دیئے تھے۔ اب ہمارے اس دوست کے تہنیتی کارڈ کے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن پھر بھی نئے سال کے موقع پر اس کی یاد بے ساختہ آجاتی ہے اور ہم اس کے لیے دعائے مغفرت ضرور کرتے ہیں۔

اتنا سب کچھ کہہ دینے کے باوجود ہمیں نہ جانے کیوں نئے سال کے تہنیتی کارڈ اچھے لگتے ہیں اور ہم انہیں بڑے سلیقہ سے سجا سجا کر نہ صرف اپنے ڈرائنگ روم میں جگہ جگہ رکھتے ہیں بلکہ ایک سال تو تہنیتی کارڈوں کی اتنی بھرمار ہوگئی کہ بعض کارڈوں کو اپنے باورچی خانہ میں تک سجا کر رکھنے کی نوبت آگئی مگر بعد میں ہماری اہلیہ نے "ضرورت شعری" کے تحت ان کارڈوں کی مدد سے گیس کا چولھا جلانے کی ترکیب ایجاد کرلی تو ہم نے ان کارڈوں کو وہاں سے ہٹا دیا کیونکہ ہمیں ان بے نام تمناؤں کا اس طرح جلنا اچھا نہیں لگا۔ زندگی کا سفر ایسے ہی گمنام جذبوں اور بے نام رشتوں کے سبب ہی تو جاری رہتا ہے ورنہ اکیسویں صدی کی طرف تیزی سے جانے والی اس دنیا میں کم از کم ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔

(۲۱/ ڈسمبر ۱۹۹۷ء)

کمسن مجاہدین آزادی

آندھرا پردیش کے مجاہدین آزادی کی تنظیم کے جنرل سکریٹری مسٹر اوما پتی مہاتندا اور مسٹر سی بال ریڈی نے پچھلے دنوں ایک پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات پر حیرت اور افسوس کا اظہار کیا کہ آندھرا پردیش میں ایسے کئی مجاہدین آزادی موجود ہیں جن کی عمریں اس وقت پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان ہیں۔ ایک خاتون مجاہد آزادی تو ایسی بھی ہیں جنہوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا لیکن انہیں مجاہد آزادی کا صداقتنامہ ملا ہوا ہے۔ کریم نگر کے ایک خاندان کے تین بھائی مجاہدین آزادی ہیں اور چوتھا بھائی بھی مجاہد آزادی بننے کی جد و جہد میں لگا ہوا ہے۔ ان جنرل سکریٹریز نے حیرت کا اظہار کیا ہے کہ جن افراد کی عمریں آزادی کے وقت بڑی مشکل سے سات برس آٹھ برس کی ہونگیں انھیں آخر کس طرح مجاہد آزادی سمجھا جاسکتا ہے۔ ملک کی آزادی کے وقت جو بچے ابھی انگوٹھا چوس رہے تھے انہیں مجاہد آزادی کا درجہ دینا ہماری آزادی کے ساتھ ایک سنگین مذاق ہے۔

آندھراپردیش کے مجاہدین آزادی کی تنظیم کے سربراہوں کو اب مجاہدین کی اس نئی قسم کا پتہ چلا ہے۔ حالانکہ پورے چار سال پہلے تو ہم نے اپنے ایک کالم میں ایک ایسے مجاہد آزادی کا ذکر کیا تھا جو ملک کی آزادی سے صرف تین مہینے پہلے تولد ہوا تھا۔ اس عجیب الخلقت مجاہد آزادی سے مل کر ہم خود دنگ رہ گئے تھے۔ جب ہم نے اس سے پوچھا تھا کہ میاں آزادی کے وقت تو تمہاری عمر صرف تین مہینوں کی تھی۔ پھر تم نے کس طرح جدوجہد آزادی میں حصہ لیا تھا۔ اس پر اس نے کہا تھا" بے شک آزادی کے وقت میری عمر صرف تین مہینے کی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے جدوجہد

آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ان دنوں انگریزوں کے خلاف ایک جلوس نکالا گیا تھا جس میں میری ماں بھی شریک تھی اور میں اس وقت اتفاق سے اپنی ماں کی گود میں تھا۔ جب انگریزوں نے جلوسیوں پر لاٹھیاں برسانا شروع کردیں تو میری ماں کا جذبۂ حُبّ الوطنی اچانک جاگ گیا اور وہ قربانی کے جذبہ سے سرشار ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ اپنے وطن کی خاطر وہ اپنی اولاد کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرے گی۔ چنانچہ جب انگریز سپاہیوں کی لاٹھیاں برسنے لگیں تو میری ماں نے مجھے ڈھال کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ نتیجہ میں میرے کندھے اور کولھے پر لاٹھیوں کی دو چوٹیں آئیں۔" اس عجیب الخلقت مجاہد آزادی کو دیکھ کر ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور ہم اس کی ماں کے جذبہ حُبّ الوطنی سے بے حد متاثر ہوئے تھے جس نے ملک کی آزادی کی خاطر اپنے تین مہینے کے کمسن بیٹے کو بھی قربانی کے لئے پیش کردیا تھا۔ ممتا اور حُبّ الوطنی کی ایسی مثالیں انسانی تاریخ میں ذرا کم ہی ملتی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ لوگ ہماری باتوں کو مذاق میں ٹال جاتے ہیں اور ہماری بات کو سنجیدہ نہیں لیتے۔ دیکھا جائے تو ہم نے چار سال پہلے ہی ایک ایسے کمسن مجاہد آزادی کی نشاندہی کردی تھی لیکن اس وقت مجاہدین آزادی کی تنظیم یا کسی اور نے ہماری بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ دو ایک اصحاب نے کہا کہ ہم مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن اب جو مجاہدین آزادی سامنے آئے ہیں وہ بھی تو آزادی کے وقت چھ سات برس کے تھے۔ مبالغہ میں اگر چار پانچ برسوں کا فرق پڑجائے تو اسے مبالغہ نہیں کہتے۔ تاجرین بھی مال کو تولتے وقت ڈنڈی مارتے ہیں تو پندرہ بیس گرام کا مال بچالیتے ہیں ہم نے تو پوری ایمانداری کے ساتھ کوئی ڈنڈی مارے بغیر ایک ایسے مجاہد آزادی کی نشاندہی کردی تھی جس کی عمر آزادی کے وقت صرف تین مہینوں کی تھی۔

مجاہدین آزادی کی تنظیم کے سربراہوں کی خدمت میں ہماری عرض یہ ہے کہ اگر جدوجہد آزادی میں چھ سات برس کی عمر کے لڑکوں نے حصہ لیا تھا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

بعض ہونہار بچوں کی صلاحیتیں پیدائش کے ساتھ ہی نمودار ہوجاتی ہیں ۔ ایک بدنام زمانہ جیب کترے کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ پیدا ہوا تو اس دایا کی انگوٹھی غائب ہوگئی تھی جس نے اس جیب کترے کی ولادت کے سلسلہ میں مدد کی تھی ۔ انگوٹھی کی تلاش کی گئی مگر وہ نہ ملی ۔ مگر بچہ کی بند مٹھی کھولی گئی تو پتہ چلا کہ انگوٹھی اس بچہ کی مٹھی میں بند ۔ تھی ۔ ہونہار بروا کے پات چکنے چکنے تو ہوتے ہیں لیکن یہ لتے بھی چکنے ہوسکتے ہیں اس کا پتہ نہیں تھا ۔ ایک شاعر دوست کے بارے میں مشہور ہے کہ بچپن میں جب یہ روتے تھے تو ترنم کے ساتھ روتے تھے اور رونے میں بھی ردیف قافیے کی پابندی کو ملحوظ رکھتے تھے ۔ چنانچہ جب بھی یہ روتے تھے تو لوگ بے ساختہ " مرحبا اور مکرّر ارشاد " کی صدائیں بلند کرتے تھے ۔ جب ایک کمسن بچہ انگوٹھی ہڑپ کرسکتا ہے اور شعر کہہ سکتا ہے تو ایک کمسن بچہ جدوجہد آزادی میں حصہ کیونکر نہیں لے سکتا ۔ پھر آزادی تو ہر آدمی کا ایک ایسا پیدائشی حق ہے جس کے لیے وہ مرنے کی خاطر بھی تیار ہو جاتا ہے ۔

مجاہدین آزادی کی تنظیم کے سربراہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ صرف ضلع کریم نگر میں (جو سابق وزیر اعظم مسٹر پی وی نرسمہاراؤ کا آبائی وطن ہے) اس وقت تین ہزار مجاہدین آزادی موجود ہیں ۔ ایک خاندان تو ایسا بھی ہے جس میں تین بھائیوں کو پہلے ہی سے مجاہدین آزادی کے صداقتنامے ملے ہوئے ہیں اور چوتھا بھائی مجاہد آزادی کا صداقتنامہ حاصل کرنے کے لیے اب بھی جد و جہد کررہا ہے ۔

اصل قصہ یہ ہے کہ مجاہدین آزادی کو ہر ماہ معقول پنشن ملتی ہے اور انھیں ٹرینوں میں مفت سفر کرنیکے علاوہ کئی اور سہولتیں بھی دی جاتی ہیں ۔ اسی لئے ہر کوئی مجاہد آزادی کا صداقتنامہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے ورنہ آزادی سے کسے دلچسپی ہے ۔ تاہم ان مجاہدین آزادی نے آج سے پچاس برس پہلے ملک کی آزادی میں حصہ لیا تھا تو وہ اب اس کا صلہ آزاد ہندوستان کی جمہوری حکومت سے کیوں مانگ رہے ہیں ۔ اس پر ہمیں ایک شاعر دوست کی یاد آگئی جو آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے ۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے بڑے زور و شور کے

ساتھ تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پچیس کتابیں لکھ ڈالیں ۔ جب ان کی پچیسویں کتاب چھپ کر آئی تو کتاب کا ایک نسخہ ہمیں دیتے ہوئے بولے "آپ کو حیرت ہوگی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ میری پچیسویں تصنیف ہے" ہم نے پوچھا "آپ کو کس نے ریٹائر کیا تھا؟" "بولے" آل انڈیا ریڈیو نے۔" اس پر ہم نے کہا "جب آپ کو آل انڈیا ریڈیو نے ریٹائر کیا تھا تو آپ اس کا بدلہ اردو ادب سے کیوں لے رہے ہیں۔" اس پر وہ ناراض ہوئے تو اب تک ناراض ہیں کیونکہ ابھی حال ہی میں ان کی چھبیسویں کتاب چھپ کر آئی ہے جو انہوں نے ہمیں نہیں دی۔

مجاہدین آزادی سے بھی ہمارا یہی کہنا ہے کہ اگر انھوں نے ملک کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیا تھا تو وہ اس کا بدلہ آزاد ہندوستان کی حکومت اور اس کے عوام سے کیوں لے رہے ہیں ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم ایک مجاہد آزادی سے واقف ہیں جو گرمی کے دنوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی ریل گاڑی کے ایرکنڈیشنڈ ڈبہ میں پائے جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ ایرکنڈیشنڈ ڈبہ میں انھیں مفت میں سفر کرنے کی سہولت حاصل ہے ۔ لہٰذا آج مغرب کی سمت جاتے ہوئے پائے جاتے ہیں تو دوسرے دن مشرق کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں ۔ یہی حال شمال اور جنوب کے سفروں کا ہے ۔ آخر میں ہم مجاہدین آزادی سے دست بدستہ ایک گذارش یہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مجاہد آزادی ہونے کو باعثِ افتخار نہ سمجھیں بلکہ بھول کر بھی کسی پر یہ ظاہر نہ کریں کہ وہ مجاہد آزادی ہیں کیونکہ ہم ایک تلخ تجربہ کے عینی گواہ اور شاہد ہیں ۔ پچھلے دنوں ہم ٹرین میں سفر کر رہے تھے ۔

نئی نسل کے کچھ نوجوان بھی ہم سفر تھے ۔ سامنے کی برتھ پر ایک بزرگ بھی سفر کر رہے تھے ۔ ان کی شامت جو آئی تو انھوں نے باتوں باتوں میں یہ انکشاف کر دیا کہ وہ مجاہد آزادی بھی رہ چکے ہیں ۔ بس پھر کیا تھا نوجوان نسل کے عاقبت نا اندیش نوجوان ان کے پیچھے یوں پڑ گئے جیسے اس ملک کی موجودہ دھاندلیوں ۔ بدعنوانیوں ۔ گھپلوں اور کرپشن کے یہی بزرگ ذمہ دار ہوں ۔ کہنے لگے " اگر آپ نے آزادی نہ دلوائی ہوتی تو آج جس طرح کے سیاستداں ہمارے درمیان موجود ہیں انھیں اقتدار

میں آنے کا موقعہ نہ ملتا۔ فساد کی اصل جڑ تو آپ ہی ہیں۔ کیا آپ نے یہ دن دیکھنے کے لیے ہمیں آزادی دلوائی تھی۔ ہم آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اس بحث میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہمیں نوجوانوں کے غم و غصہ کے آگے ان بزرگ کی زندگی خطرہ میں نظر آنے لگی۔ بالآخر ہم نے اپنی جان پر کھیل کر اس مجاہد آزادی کی زندگی بچائی۔ بھلے ہی ہم نے جد وجہد آزادی میں کوئی حصہ نہ لیا ہو لیکن ہم نے ایک مجاہد آزادی کی زندگی کو بچانے کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ اس کوشش میں ہمارے شرٹ کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ آج کے زمانہ میں ایک مجاہد آزادی کی حفاظت اور ملک کی سلامتی کے لئے کون اتنی بڑی قربانی دے سکتا ہے۔

آخر میں ہماری گزارش یہ ہے کہ مجاہدین آزادی کی تنظیم ہم جیسے بے لوث شخص کو جو مجاہدین آزادی کی اب بھی عزت کرتے ہیں، حکومت سے کہہ کر کوئی مناسب صداقتنامہ دلوادے تاکہ ہم بھی ریلوں میں مفت سفر کر سکیں اور پنشن پاسکیں۔

(۹ / مارچ ۱۹۹۷ء)

ہنسنا چھوڑو اور قوم کی خدمت کرو

دہلی سے ایک ہفتہ وار رسالہ نکلتا ہے " خبردار جدید" ۔ جس کے ایڈیٹر ہمارے نوجوان دوست معصوم مراد آبادی ہیں ۔ ہمارے حساب سے مراد آباد نے بمشکل تمام جگر مرادآبادی کے روپ میں ایک ہی معصوم ہستی پیدا کی تھی ۔ ان کے بعد چونکہ مرادآباد میں معصوموں کی پیدائش پر پابندی سی عائد ہوگئی ہے ۔ اس لئے اس کی تلافی کے لیے معصوم مراد آبادی نے "مرادآبادی" کو اپنے نام کا حصہ بنالیا ہے ۔ معصومیت چاہے برائے نام ہی کیوں نہ ہو بہر حال معصومیت ہی ہوتی ہے۔ ان ہی معصوم مرادآبادی نے ہمارا ایک مضمون اپنے رسالہ میں چھاپا تھا ۔ چنانچہ اس مضمون کے سلسلہ میں ان کے پاس بعض توصیفی خطوط بھی آئے لیکن ایک خط ایسا بھی آیا ہے جسے آپ نہ تو تعریف کے خانہ میں ڈال سکتے ہیں اور نہ ہی مذمت کے اس خط کے لکھنے والے محمد علاء الدین ہیں (یہ چراغ والے الہ دین نہیں ہیں) جو چترپور ، ضلع ہزاری باغ (بہار) کے رہنے والے ہیں ۔ مکتوب نگار نے ہمارے مضمون کی تعریف کرنے کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے ۔ " میں ان کے مضامین اکثر پڑھتا رہتا ہوں ، نہایت ہی شگفتہ اور دلچسپ ہوتے ہیں ۔ بے ساختہ ہنسی بھی آجاتی ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ کب تک ٹھی ٹھی ، ٹھا ٹھا ، ہی ہی ، ہا ہا کرتے رہیں گے ۔ انہیں دیکھنا چاہیے کہ ان دنوں حالات کتنے سنگین ہوتے جارہے ہیں ۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں معاشرہ کی خرابیوں کا بخوبی اندازہ ہے لیکن وہ جان بوجھ کر ان پر صرف ہنس کر خاموش ہو جانا چاہتے ہیں " انہیں اصلاح معاشرہ " کے سلسلہ میں عملی طور پر بھی کچھ کرنا چاہیے اور قوم کی خدمت کرنے

کے لیے ایک باضابطہ لائحہ عمل بنا کر کام کرنا چاہیے ۔ انہیں قبر کے عذاب کو بالکل نہیں بھولنا چاہیے دوسری دنیا میں جب ان سے پوچھا جائے گا کہ نیچے کی دنیا میں وہ کیا کام کر کے آئے ہیں ۔ تو وہ کیا جواب دیں گے " ۔

یقین مانئے جب سے ہم نے " خبردار جدید " کی معرفت اپنے بارے میں یہ مکتوب پڑھا ہے تب سے ہمیں رہ رہ کے " خبردار قدیم " کا خیال آرہا ہے ۔ دل کو دہلانے والی ایسی تعریف سے آج تک ہمارا واسطہ نہیں پڑا تھا ۔ قبر کے عذاب کے تصور ہی سے ہمارا سارا وجود لرزنے لگا ہے ۔ مکتوب نگار نے بعد از وقت ہی سہی ہماری آنکھیں تو کھول دی ہیں ۔ اب پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ لگ بھگ چالیس برسوں سے ہم نے ہنسنے ہنسانے کے سوائے کوئی کام نہیں کیا ۔ (بشرطیکہ ہنسنے کو واقعی ایک کام سمجھا جائے) اس سارے عرصہ میں ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ لوگوں کو ہنسانا اور ان میں خوشیوں کو بانٹنا بھی ایک نیک کام ہے ۔ ہمیں دوسری خوش فہمی یہ بھی لاحق تھی کہ سماج کی بے اعتدالیوں پر ہنس کر اور ان پر طنز کے نشتر چلا کر ہم قوم کی اصلاح کررہے ہیں ۔ قوم کی اصلاح تو نہ ہوئی الٹا ہماری عادت خراب ہوگئی ۔ چنانچہ اب ہر سنجیدہ بات کو ہنسی میں ٹال کر مطمئن ہوجاتے ہیں ۔ ہمیں احساس ہی نہ رہا کہ وہ زمانے کب کے لدگئے جب پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر بھی کٹ سکتا تھا (ابھی ساٹھ برس پہلے تک علامہ اقبالؔ اپنی شاعری میں یہ کام بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے ہیں) ۔ ہمیں اس وقت اس دانا کا قول یاد آرہا ہے جس نے کہا تھا کہ اگر طنز کے تیر و نشتر سے قوم کی اصلاح ہو سکتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی ۔ دانا کے اس زرّین قول کے باوجود نہ جانے کیوں ہم نے اپنی عمر عزیز کے چالیس برس ہنسنے ہنسانے میں گزار دیئے ۔ واقعی یہ سوال سنجیدہ غور و فکر کا طلبگار ہے ۔ تاہم مکتوب نگار کی خدمت میں ہماری دست بستہ عرض یہ ہے کہ شروع میں ہم بھی بے حد سنجیدہ آدمی تھے ۔ بات بات پر رو دیتے تھے ۔ کھانے کو نہیں ملا تو رو دیتے تھے ۔ نوکری نہیں ملی تو رو دیتے تھے ۔ کسی نے ہماری ذرا سی بے عزتی کی اور ہماری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے اور بھی ایسے کئی معاملات ہیں

جن میں ہم چھپ کر یوں روتے تھے جیسے کوئی جرم کر رہے ہوں۔ ہمارے یہ آنسو کسی نے نہیں دیکھے۔ ان ظالموں اور کافروں نے بھی نہیں دیکھے جن کے لئے یہ بہائے گئے تھے، بعد میں بد قسمتی سے ہمیں ایک ایسا کام ملا جس میں ہنسنے ہنسانے کو ہی بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی۔ لوگ پیٹ کیلئے روتے ہیں اور ہم اسی پاپی پیٹ کیلئے ہنسنے لگے، گویا اب جو ہم ہنستے ہیں تو اس طرح ہنستے ہیں جس طرح کوئی کشاکش روزگار کیلئے روتا ہے۔ ہمارے اس طرح ہنسنے اور دوسروں کے رونے میں کوئی بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔

ع اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں

آپ نے اس مریض کا واقعہ تو سنا ہوگا جس کی طبعیت خراب ہوئی تو وہ ایک ڈاکٹر کے پاس گیا، ڈاکٹر نے مریض کی کیفیت پوچھی تو بولا کہ "ڈاکٹر صاحب! ایک عجیب سا اضمحلال اور عجیب سی کسلمندی سارے وجود پر طاری رہتی ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا، سانسوں کے اس تسلسل کو روک دینے کو جی چاہتا ہے"۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم پر اداسی کا غلبہ طاری ہے۔ ان دنوں شہر میں ایک سرکس لگی ہوئی ہے۔ یوں کرو کہ آج شام اس کا شو دیکھنے کیلئے چلے جاؤ، اس میں ایک مسخرا کام کرتا ہے۔ اسے دیکھو تو تمہاری ساری اداسی، کسلمندی اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی"

مریض نے منہ بنا کر کہا "ڈاکٹر صاحب! پریشانی کی اصل جڑ تو یہی ہے"۔ ڈاکٹر نے پوچھا "کیسی پریشانی؟"۔ "مریض بولا" حضور سرکس کا وہ مسخرا میں ہی تو ہوں"

سچ تو یہ ہے کہ بسا اوقات ہم بھی ایسی ہی کیفیت سے گزرتے ہیں اور لوگ ہمیں ہمارے ہی لطیفے سنا کر ہشاش بشاش اور تازہ کار بنانے کی ناکام سعی کرتے ہیں۔ برسوں کی اس کشاکش اور ریاض کی وجہ سے ہمارے جسم میں رونے کے جو غدود ہیں انہوں نے کام کرنا چھوڑدیا ہے جب ہم رونا چاہیں تو تب بھی آنسو آنکھوں میں نہیں آتے۔

ع ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

یہی وہ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے ہم زندگی میں ڈھنگ کا کوئی کام نہ کر سکے۔

اب جو مکتوب نگار نے ہمیں "قبر کے عذاب" سے ڈرا کر قوم کی اصلاح کیلئے کام کرنے کا مشورہ دیا ہے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ایک زمانہ میں ہمارے دل میں بھی قوم کی خدمت کرنے کا خیال شدّت سے آیا کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ خدمت کے معاملہ میں کبھی ہم میں اور کبھی قوم میں اتفاق رائے نہ پیدا ہوسکا۔ جسے ہم خدمت سمجھتے تھے قوم اسے بے وقوفی کا نام دیتی تھی۔ ہم جسے خرد سمجھتے تھے قوم اسے "جنون" گردانتی تھی۔ اس اختلاف رائے کی وجہ سے ہم "اصلاح معاشرہ" سے کنارہ کش ہوگئے ورنہ آج ہمارا نام بھی سکھ رام، جئے للیتا اور چارہ گھوٹالہ کے ذمہّ داروں کے ساتھ لیا جاسکتا تھا۔

کام نے غالبؔ نکمّا کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے

یوں بھی ہمارے معاشرے میں پہلے ہی سے کئی لوگ قوم کی اتنی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اگر ہم خدمت انجام دینے کے لئے آگے بڑھتے تو کب کے پیچھے ڈھکیل دیئے جاتے، پھر ہر پانچ برس بعد قوم کی خدمت کرنے کے خواہش مند حضرات اتنی کثیر تعداد میں نمودار ہوجاتے ہیں کہ اس نقار خانہ میں ہم جیسے طوطی کی آواز کون سنتا، پھر مسئلہ یہ بھی تھا کہ قوم کی خدمت کرنے کے سلسلہ میں ہمیں جو کچھ بھی ملتا اسے بنک میں تو نہیں رکھا جاسکتا تھا گھر میں ہی رکھنا پڑتا اور ابھی چار پانچ برس پہلے تک تو ہم کرایہ کے مکان میں رہا کرتے تھے جہاں ہمیں خود اپنے آپ کو رکھنا بھی دشوار نظر آتا تھا۔ ایسے میں قوم کی خدمت کے سلسلہ میں جو معاوضہ ملتا اسے کہاں رکھتے۔ آج بھی کہیں سے ہمیں دو چار سو روپے فالتو مل جاتے ہیں تو انہیں دیوان غالبؔ اور مولوی عبد الحق کی ڈکشنری میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ انکم ٹیکس والوں کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے ہی بال بچوں اور بیوی کے چھاپوں کے ڈر سے۔ بہت پہلے ہم نے قوم کی خدمت کی خاطر اپنا تھوڑا بہت ضمیر بیچنے کی کوشش بھی کی، خریدار بھی آگے آئے لیکن ہم نے یہی سوچ کر اسے نہیں بیچا کہ ایک ہی چیز تو ہمارے پاس رہ گئی ہے۔ اسے بھی بیچ دیں تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا، سچ تو یہ ہے کہ قوم کی خدمت کا جذبہ ہم میں بدرجہ اتم موجود

ہے لیکن بعد میں عدالتوں وغیرہ کے چکر لگانے سے ڈر ہوتا ہے ۔ مانا کہ ضمانت پر بھی رہا ہو سکتے ہیں ۔ لیکن کون اس جھنجھٹ میں پڑے ۔ سیاسی رہنماؤں کا کیا ہے وہ تو حکومت کو باہر سے سپورٹ دے کر بھی اپنی جان بچا سکتے ہیں ۔ ہماری سپورٹ کی کسے ضرورت ہے ۔ ہمیں نہ کوٹھیاں بنوانی ہیں اور نہ ہی اپنے بنک بیلنس میں اضافہ کرنا ہے ۔ ایسے میں قوم کی خدمت کر کے کیا کرتے ۔ غرض ایسی ہی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے ہم نے اپنے آپ کو " اصلاح معاشرہ " سے دور رکھا ہے ۔ اب ذرا کبھی ہنس لیتے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر اپنے آپ پر تو اس پر بھی لوگوں کو اعتراض ہونے لگا ہے ۔ تاہم مکتوب نگار نے جو بنیادی سوال یہ اٹھایا ہے کہ دوسری دنیا میں کیا کرتے رہے تو اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہوگا اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ بھلے ہی نیچے کی دنیا میں رہنے والوں کو یہ پتہ نہ ہو کہ ہم اس دنیا میں کیا کر رہے ہیں لیکن اوپر والے کو تو سب کچھ پتا ہے ۔ اسے تو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ جو ہم دھاڑیں مار مار کر قہقہے لگاتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر ہنستے ہیں تو ہمارے دل پر کیا گزرتی ہے اور اس ہنسی کے پیچھے کتنے آنسو چھپے ہوتے ہیں

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس لئے مکتوب نگار سے ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ ہمیں ہنسنے سے منع نہ کریں اور خدارا قوم کی خدمت کرنے کا مشورہ تو ہرگز نہ دیں ۔ (۱۰ مئی ۱۹۹۸ء)

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے

صدر جمہوریہ کے آر نارائنن نے یوم جمہوریہ کے موقعہ پر قوم کے نام اپنے خطاب میں کچھ ایسی فکر انگیز، عبرت انگیز اور خیال انگیز باتیں کی ہیں کہ پچھلے پندرہ دنوں سے جب جب ہم ان باتوں پر غور کرتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے اور سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ صدر جمہوریہ نے فرمایا تھا کہ قوم میں فضول خرچی کی عادت بڑھتی جارہی ہے اور ہم قناعت اور " سادگی پسندی "کو فراموش کرتے جارہے ہیں۔ اگر یہی صورتحال برقرار رہی تو کچھ برس بعد ڈکشنری میں سے " سادگی " کے لفظ کو ہی خارج کردینا پڑے گا۔

ہم مانتے ہیں کہ قوم میں فضول خرچی کی عادت بہت بڑھتی جارہی ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب نے اپنے بیٹے کی ختنہ کی خوشی میں فضول خرچی کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جب ہم نے اس بیجا فضول خرچی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ " جناب آپ نے اس فضول سے موقعہ پر جو فضول خرچی کی ہے اس میں تو چار غریب نوجوانوں کی شادیاں بھی ہوسکتی تھیں۔" ہماری بات پر بپھر گئے اور بولے " جناب آپ ختنہ کی خوشی کو فضول سا موقع کہتے ہیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ختنہ کی خوشی کا موقعہ زندگی میں صرف ایک بار ہی آتا ہے۔ جب کہ شادیاں تو آپ چار بھی کرسکتے ہیں۔" ان کی اس دلیل کے آگے ہم لاجواب ہوگئے۔ آدمی جب فضول خرچی کرنے پر اتر آتا ہے تو ایسی ہی بے تکی دلیلیں پیش کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم فضول خرچی نہیں کرتے۔ ہماری بیوی روزانہ خرچ کے لئے ہمیں پانچ روپیوں کی جو بھاری رقم دیتی ہیں تو ہم اسے شام شام تک اڑا دیتے ہیں اور جیب میں پھوٹی کوڑی بھی رہنے

نہیں دیتے ۔ مانا کہ ہمارے پڑوسی کا بیٹا جو ابھی ہائی اسکول میں ہی پڑھتا ہے روزانہ پانچ سو روپے اڑادیتا ہے ۔ لیکن ہم میں اور اس میں فرق یہ ہے کہ ہمارے پڑوسی ٹھیکیدار ہیں ۔ گھر پر چار پانچ موٹریں ہیں ۔ ماشاءاللہ اتنے ہی ڈرائیور بھی ہیں ۔ گھر پر کام کرنے والے ملازمین بھی کئی ہیں ۔ غرض ان کی مالی حیثیت ایسی ہے کہ اگر ان کا بیٹا روزانہ پانچ سو روپے بھی اڑادیتا ہے تو پھر بھی کم ہے ۔ دوسری طرف ہم جو یہ دن بھر میں پورے پانچ روپے خرچ کردیتے ہیں تو یہ ہماری مالی حیثیت کے حساب سے بہت زیادہ ہے ۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہمارے مزاج میں " سادگی " کا عنصر نہیں ہے ۔ ہمارے اندر تو سادگی اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ اس معاملہ میں مزید " کوٹنے " کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ ہماری سادگی پسندی کا یہ عالم ہے کہ پچھلے دنوں ایک فائیواسٹار ہوٹل میں منعقدہ ایک عشائیہ میں شرکت کے لئے پہنچے تو بے شمار مرغن غذاؤں کو اپنے سامنے دیکھ کر ہماری طبیعت کچھ ایسی بد مزہ ہوئی کہ ہم نے کھانا کھانے سے صاف انکار کردیا ۔ میزبان نے اصرار کیا تو ہم نے اپنی " سادگی پسندی " کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ " میاں ہم تو چٹنی اور جوار کی روٹی کھانے کے عادی ہیں ۔ ہماری فقیرانہ آن بان کو ایسی مرغن غذاؤں سے ٹھیس پہنچتی ہے ۔ ایسی سادہ غذا نہ ملے تو ہم کئی کئی دن فاقہ بھی کرلیتے ہیں " ہمارے میزبان کو ہم پر جو ترس آیا تو انہوں نے فائیواسٹار ہوٹل کے انتظامیہ کو ہدایت دی کہ وہ فوراً ہمارے لئے چٹنی اور جوار کی روٹی کا بندوبست کریں ۔ انتظامیہ نے جب ہماری سادہ غذا کی فراہمی کے سلسلہ میں بعض مجبوریوں کا ذکر کیا تو ناراض ہوگئے کہ آپ کا اتنا بڑا ہوٹل ہے ۔ آپ کے ہاں چٹنی اور جوار کی روٹی تک نہیں ملتی ۔ خیر ہوٹل کے انتظامیہ نے بڑی تگ و دو کے بعد ہماری مذکورہ سادہ غذا کا بندوبست تو ضرور کیا لیکن بعد میں کسی نے بتایا کہ ہمیں چٹنی اور جوار کی روٹی فراہم کرنے پر ہوٹل کے انتظامیہ نے ہمارے میزبان سے پورے پندرہ سو روپے وصول کئے (واللہ اعلم بالصواب) جب کہ دوسرے مہمانوں کو فراہم کی گئیں مرغن غذاؤں کے دام فی کس صرف ہزار روپے وصول کئے گئے ۔ چاہے کچھ بھی ہو ہمیں فخر ہے کہ ہم نے فائیواسٹار ہوٹل میں

بھی اپنے مزاج کی۔ سادگی پسندی۔ کو ترک نہیں کیا۔ یہ ضرور ہے کہ بعد میں ہمارے ان میزبان نے کئی اور دعوتیں کیں لیکن ہمیں ان میں نہیں بلایا۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے کیونکہ ہم تو شکم سیری کے مقابلہ میں فاقے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ہم اس تہذیب کے پروردہ ہیں جس میں قناعت، توکل، فقر و فاقہ اور قلندری کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ہمارے صوفیوں، سادھوؤں اور سنتوں کے بارے میں تو یہاں تک سنا ہے کہ کئی کئی دن فاقے کرتے تھے لیکن حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے۔ ہمیں تو خیر کچھ کھانا ہوتا ہے تو کھانے کی چیزوں تک خود پہنچ جاتے ہیں۔ ہمارے سادھو سنت اس وقت تک نہیں کھاتے تھے جب تک کھانا خود چل کر ان تک نہیں پہنچتا تھا۔ حضرت شیخ سعدی کے بارے میں سنا ہے کہ ایک بار کسی لق و دق صحرا میں جہاں دور دور تک کوئی آسایش میسر نہیں تھی تشریف فرما تھے اور روکھی سوکھی روٹی کھانے میں مصروف تھے۔ ایسے میں حکمران وقت کے خصوصی مصاحب اور درباری شاعر کی سواری باد بہاری ادھر سے گذری۔ اس کی نظر حضرت شیخ سعدی پر پڑی تو رک گیا۔ بڑی عقیدت کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا" حضور یہ کیا آپ تکلیفوں اور مصائب کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے کتنی بار آپ سے کہا کہ ذرا میرے ساتھ حکمران وقت کے دربار میں چلنے کی عادت ڈال لیں تو آپ کو یوں روکھی سوکھی روٹی کھانے کی حاجت نہ رہے" اس پر حضرت شیخ سعدی نے اس باسی روٹی کا ایک ٹکڑا درباری شاعر کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا" میاں میری بات مانو۔ میری طرح اگر تم بھی روکھی سوکھی کھانے کی عادت ڈال لو تو تمہیں یوں ہر روز حکمران وقت کے دربار میں حاضری لگوانے کی حاجت نہ رہے" ہم نے اس حکایت کو اپنی گرہ میں اچھی طرح باندھ لیا ہے۔ ہمارے حالات بھی کچھ ایسے ہیں کہ ہم اپنی گرہ میں کوئی بھاری رقم تو باندھ نہیں سکتے۔ ایسی ہی اچھی اچھی باتوں کو گرہ میں باندھ کر کام چلا رہے ہیں اور ماشاءاللہ اچھی خاصی زندگی گذار رہے ہیں۔ گذار کیا رہے ہیں بلکہ گذار چکے ہیں اور کوئی دن نہیں جاتا کہ ہم خود گذر جائیں گے۔ اس ذہنی تربیت کی وجہ سے ہم میں سادگی بدرجہ اتم موجود ہے اور جہاں جاتے ہیں وہاں اپنی سادگی کو ضرور ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دورِ جدید میں سادگی کے ساتھ جینا اب دن بہ دن دشوار کن ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے ایک لکھ پتی مداح نے ہم سے کہا میاں فلاں ہل اسٹیشن پر نہایت پُرسکون جگہ پر ہمارا ایک ذاتی بنگلہ ہے۔ کبھی وہاں جاکر قیام کرو۔ اطمینان اور سکونِ قلب کے ساتھ کچھ لکھو پڑھو۔ نوکر چاکر

اور ضرورت کی ساری چیزیں وہاں موجود ہیں۔ ہم ان کے بہکاوے میں آکر وہاں چلے گئے۔ اب جو ہم وہاں گئے تو دیکھا کہ ان کے عالیشان مکان میں جگہ جگہ ایسی قالینیں بچھی ہیں جن پر ہم پاؤں رکھتے تھے تو گھٹنوں تک دھنس جاتے تھے۔ صوفے ایسے گداز تھے کہ ان پر بیٹھتے تھے تو ہم صوفوں کے اندر دھنس کر کہیں غائب ہوجاتے تھے اور ان کے ملازموں کو ہمیں ڈھونڈنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ یہی حال بستر کا بھی تھا۔ ہم نے ان آسایشوں کو دیکھا تو ہماری سادگی نے للکارا کہ میاں کس چکر میں پڑے ہو۔ تم نے تو سادہ زندگی گزارنے کی خاطر زندگی بھر جو تپسیا کی ہے وہ بھنگ ہوئی جاتی ہے۔ ہوشیار! خبردار۔ اس پر ہم نے اپنے میزبان سے کہا کہ حضور! ہم سیدھی سادی زندگی گزارنے والے آدمی ہیں۔ ہم صوفوں اور بستروں کے گداز سے کہیں زیادہ اپنے دل میں گداز پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ گداز صوفوں پر بیٹھنے کی وجہ سے ہمارے دلِ گداز کو سخت آزمائش میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ ہم تو چٹائی پر بیٹھنے کے عادی ہیں۔ بستر بھی ہمارا ایک ایسی چار پائی پر لگتا ہے جس پر سے صبح کو بیدار ہوتے ہیں تو چار پائی کی بان کے نشان ہماری پیٹھ پر صاف دکھائی دیتے ہیں۔ نرم اور گدیلے بستروں پر سوجائیں تو ہم ایسے خواب دیکھنے لگتے ہیں جو صرف بالغوں کے لئے مختص ہوتے ہیں نعوذباللہ ہم نے نوجوانی میں ایسے خواب نہیں دیکھے تو اب اس عمر میں کیا دیکھیں گے۔ ہمارا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ سونے کا بستر جتنا سخت اور کرخت ہوگا اس پر سونے سے آدمی کا دل اتنا ہی نرم ملائم اور گداز ہوجاتا ہے اور وہ حیوانی جذبات سے پاک ہوجاتا ہے۔ ہمارے اس استدلال کے بعد ہمارے میزبان نے زرکثیر خرچ کرکے اپنے دیوان خانے کو قالینوں صوفوں اور گدیلے بستروں کی آسائشوں سے پاک کیا اور ایک چٹائی بچھادی۔ اس سے ہماری انا کو تو بڑی تسکین پہنچی لیکن ان کے نوکروں کی انا کو ضرور ٹھیس پہنچی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے سادگی پسندی کی ایسی روایت اس گھر میں قائم کی تو مستقبل میں کہیں ان کے لئے دشواریاں نہ کھڑی ہوجائیں۔ لیکن لطف تو دوسرے دن آیا جب ہم نے اپنی سادگی کا سکہ کچھ ایسا جمایا کہ ہمارے میزبان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صبح ہوئی تو

ہم نے اپنے میزبان سے پوچھا آپ کے گھر کے آس پاس نیم کا پیڑ تو ضرور ہوگا بولے - اس ہل اسٹیشن پر دُور دُور تک نیم کا پیڑ پیدا نہیں ہوتا ۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں ؟ ہم نے کہا ہم صبح کو نیم کی تازہ ٹہنی سے مسواک کرنے کے عادی ہیں ۔ میزبان نے بہت اصرار کیا کہ نیم کی ٹہنی کے بجائے ہم اعلیٰ سے اعلیٰ ترین ٹوتھ پیسٹ کا استعمال کریں اور اپنے دانتوں کی سادگی پسندگی کو کم از کم ایک دن کے لئے نیم کی ٹہنی سے دُور رکھیں ۔ مگر ان کی یہ تجویز ہمارے مزاج کی سادگی کو نہ بھائی ۔ نتیجہ میں انہیں نیم کی ٹہنی کو حاصل کرنے کے لئے اپنی گاڑیاں جنگل میں چاروں طرف دوڑانی پڑیں اور یوں ہماری سادگی کی لاج رکھنی پڑی ۔

صدر جمہوریہ کی بات سے ہمیں صد فیصد اتفاق ہے کہ ہمیں سادگی پسندی کی زندگی گزارنی چاہیے لیکن یہ مسئلہ تو اس ملک کی صرف بیس پچیس فی صد آبادی کا ہے ۔ خدا کا شکر ادا کیجئے کہ اس ملک کی 75 فیصد آبادی غربت کی سطح سے نیچے جاکر زندگی گزارتی ہے جس کی وجہ سے اسے سادگی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے ۔ آپ سیدھے سادے کھانے کی بات کرتے ہیں انہیں تو کئی کئی دن فاقے کرنے پڑتے ہیں ۔ جب تک اس ملک میں غربت برقرار رہے گی تب تک سادگی کے لفظ کو ڈکشنری سے کوئی نہیں نکال سکتا ۔

(جولائی / ۱۹۹۸ء)

اشیاء اور انسانوں کے دام

جب سے پرسار بھارتی بورڈ بنا ہے تب سے دور درشن کی خبروں میں بعض اوقات کسی موضوع پر لوگوں کے انٹرویو یا ان کے تبصرے بھی پیش کیئے جانے لگے ہیں۔ مثلاً کسی دن موسم بہت خراب ہو تو ماہرین موسمیات میں سے کسی کو بلاکر اس سے موسم کی خرابی کی وجہ پوچھی جاتی ہے۔ عام آدمی کی رائے بھی پوچھی جاتی ہے کہ وہ اس موسم میں کیسا محسوس کررہا ہے۔ پچھلے ہفتہ اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے بارے میں ایسا ہی ایک ردِّ عمل پیش کیا گیا تھا۔ ماہرین معاشیات تو وہ ہوتے ہیں جن کی دلچسپی عوام کی معیشت میں کم اور ملک کی معیشت میں زیادہ ہوتی ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بڑھتی بھی ہیں تو سمجھتے ہیں کہ اس سے ملک کی معیشت مستحکم ہورہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے آج تک اپنی گھریلو معیشت کو بہتر بنانے کے لئے کبھی کسی ماہر معاشیات سے مشورہ طلب نہیں کیا حالانکہ ملک کے بعض مقتدر ماہرین معاشیات سے ہماری شناسائی ہے۔ چنانچہ اس مباحثہ میں بھی ماہرین معاشیات نے یوں اظہار خیال کیا جیسے اشیاء کی قیمتوں کا بڑھنا ایک فال نیک ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو دیگر ممالک میں اشیاء کی رائج الوقت قیمتوں کا تقابل اپنے ہاں کی قیمتوں سے کرتے ہوئے تاجروں کو بہکانے کی کوشش کی کہ میاں اپنی اشیاء کی قیمتیں کچھ اور بڑھالو۔ دیکھو دنیا میں کیا ہورہا ہے اور تم کیا کررہے ہو۔ ملک کے ماہرین معاشیات سے تو خیر ہمیں کوئی امید نہیں ہے کہ وہ عوام کی مشکلات کو کبھی سمجھ پائیں گے۔ البتہ اس مباحثہ میں جن عام آدمیوں کی رائے پوچھی گئی انہوں نے بہت کھری کھری سنائی۔ ایک عام آدمی کا رویہ تو کچھ ایسا تھا جیسے رائے دینے سے پہلے دور درشن کے نمائندے سے کہنا

یہ چاہتا ہو۔ "بھیا میں رائے تو دونگا لیکن پہلے مجھے کھانا تو کھلادو تاکہ رائے دینے کے قابل بن سکوں۔ خدا کی قسم دو دنوں سے بھوکا ہوں"۔ ایک اور عام آدمی کا رویّہ کچھ اتنا جارحانہ تھا کہ لگتا تھا وہ رائے دینے کے بجائے دور درشن کے نمائندہ پر حملہ کرنے کا اردہ رکھتا ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے رائے دینے سے اشیاء کی قیمتیں تو کم نہیں ہونگیں۔ پھر ایسی رائے دینے کا کیا فائدہ۔ اس عام آدمی کے ردّ عمل کو دور درشن کے نمائندہ نے دور ہی سے جاننے کی کوشش کی اور صحیح وسلامت وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن سب سے دلچسپ رد عمل ہمیں اس خاتون کا لگا جو ایک موٹر سے باہر نکل رہی تھی کہ اچانک دوردرشن کے نمائندہ نے اسے جاپکڑا۔ دوردرشن کی ٹیم اور کیمرہ مین کو دیکھ کر خاتون نے پہلے تو اپنے بال ٹھیک کیے ہونٹوں پر غالباً لپ اسٹک کا تازہ لیپ بھی لگایا۔ پھر مسکرانے لگی تو دوردرشن کے نمائندہ نے اس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "محترمہ یہ بتلائیے کہ اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" اس پر موصوفہ نے نہایت بے نیازی کے ساتھ جواب دیا "میں کیا جانوں، کہ ان دنوں چیزوں کے دام کیا ہیں کیونکہ چیزیں تو بازار سے میرا نوکر لے کر آتا ہے۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ان کے کیا دام ہیں۔ ایسی چھوٹی موٹی اور فضول باتوں میں دخل دینے کے لئے میرے پاس وقت ہی کہاں ہے" دوردرشن کا نمائندہ اس غیر متوقع جواب سے سٹپٹا گیا اور اس نے فوراً کیمرہ کا سوئچ آف کردیا۔ مگر اس بات سے ہمیں بڑی کوفت ہوئی۔ اس لیے کہ یہ خاتون بالکل سچ بات کہہ رہی تھی اور دوردرشن نے اچانک اس کی بات کو دبادیا اور عوام تک ان کی آواز پہنچنے نہیں دی۔ کم از کم پرسار بھارتی بورڈ کے بننے کے بعد تو دوردرشن پر اس طرح کی کوئی پابندی نہیں عائد ہونی چاہیے تھی۔ عوام کو پورا حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنی آواز چاہے وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو عوام تک پہنچا سکیں۔ ہمیں اس وقت ایمرجنسی کے دنوں کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک نوجوان کسی ہوٹل میں بیٹھ کر دوسرے نوجوان سے ہندوستان کے سیاسی حالات کی برائی کررہا تھا۔ پولیس کے ایک داروغہ نے یہ بات سن لی تو اسے پکڑ لیا اور تھانے میں لیجا کر یہ کہتے

ہوئے اس کی پٹائی شروع کردی کہ ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے ملک کی حکومت کی برائی کرتا ہے۔ شرم کی بات ہے۔ اس پر نوجوان نے صفائی دینے کی خاطر کہا "حضور! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو اصل میں امریکہ کی حکومت کی برائی کررہا تھا۔ اپنے ملک کی حکومت کی نہیں" اس پر داروغہ نے اس کے گال پر ایک زور دار طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا "پھر جھوٹ بولتا ہے۔ کیا تو مجھے بیوقوف سمجھتا ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ کونسی حکومت نکمی اور ناکارہ ہے" دیکھا جائے تو مذکورہ خاتون نے دور درشن کے نمائندہ سے جو بات کہی تھی وہ اپنے طور پر سچ تھی۔ بے چاری کو جب پتہ ہی نہیں کہ بازار میں اشیاء کے کیا بھاو ہیں تو وہ اس بارے میں کیا کہتی۔ مگر دور درشن کا نمائندہ اس کی یہ سچی بات سننا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس معاملہ میں کس کا نکماپن ہے۔ اس لئے اس نے بات چیت کو بیچ میں ہی روک دیا۔ آپ اس خاتون کی بات کرتے ہیں بھیّا خود ہماری مثال لیجیے کہ ہمیں بھی یہ نہیں معلوم کہ بازار میں ان دنوں اشیاء کے کیا دام ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمیں صرف سگریٹ کے داموں کا پتہ ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ پیاز کا کیا بھاو ہے۔ یہی حال مرچ، مونگ پھلی کے تیل، مصالحوں اور ادرک لہسن کا ہے۔ ہمیں کیا پتہ کہ ان چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں۔ جس کو ہو جان ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں۔ ہم تو بازار سے اردو شاعر کے اس مصرعہ کی طرح گزرتے ہیں

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

جب آپکی جیب میں پیسہ ہی نہ ہو تو خریدار کیسے بن پائیں گے۔ ہمارا کوئی نوکر تو ہے نہیں کہ وہ بازار سے چیزیں خرید کر لایا کرے اور ہم اپنی فطری شرافت اور بے نیازی کے باعث اس سے چیزوں کے دام نہ پوچھیں۔ دور درشن پر اپنے بے نیازانہ ردعمل کا اظہار کرنے والی خاتون نے تو یہ کام اپنے نوکر کو سونپ رکھا ہے کیونکہ اللہ نے اسے یہ توفیق عطا فرمائی ہے اور ہم نے ملک کے ماہرین معاشیات کی حرکتوں کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری اپنی اہلیہ کو سونپ رکھی ہے اور ماشااللہ وہ اس فرض سے اس خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہورہی ہیں

اور دکانداروں سے چیزوں کے دام پر اتنی مدلّل بحث کرتی ہیں کہ اکثر دکاندار تو انہیں دیکھ کر ہی اپنی دکانیں بند کرنے لگ جاتے ہیں۔ یوں بھی چیزوں کے بڑھتے ہوئے داموں کا مقابلہ ہر آدمی اپنے اپنے انداز سے کرتا ہے۔

ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ چیزوں کے داموں کے بڑھنے کے باوجود اس ملک میں اب بھی بعض لوگ ایسے ہیں (بشمول ہمارے) جنھیں بازار کا حال بالکل نہیں معلوم۔ وجہ ہر ایک کی جداگانہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دوردرشن کے نمائندے داموں کے بارے میں ردعمل جاننے کیلئے یا تو ماہرین معاشیات کے پاس جاتے ہیں یا پھر بالکل ہی عام آدمی کا رُخ کرتے ہیں۔ پہلی بار ایک پیٹ بھری خاتون اس کام کے لیے انھیں ملی تھی تو اس کی آواز عوام تک پہنچنے نہ دی۔ بہرحال ہم نے اپنے قارئین کی سہولت کے لئے اپنے طور پر ایسے ہی بعض افراد کے ردعمل جمع کیے ہیں جن کے چند نمونے ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں۔

○ •میں چیزوں کے داموں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ میں نے اس کام کے لئے ایک باورچی رکھ چھوڑا ہے۔ اس باورچی نے میرے ہاں کام کرنے سے پہلے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر اس سے صرف کھانا پکانے کا کام لیا جائے گا تو وہ ماہانہ پانچ سو روپے تنخواہ لے گا اور اگر بازار سے سوداسلف لانے کی ذمہ داری بھی اس کی ہوگی تو ماہانہ دوسو روپے میں بھی کام کرنے کو تیار ہے ایسا ایماندار باورچی جو اتنی کم تنخواہ میں کھانا بھی پکائے اور بازار سے سودا سلف بھی لے آئے آج کے زمانہ میں کہاں ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں صرف کھانا کھانے سے دلچسپی رکھتی ہوں اور چیزوں کے داموں کے چکر میں نہیں پھنستی۔

○ •آپ چیزوں کے بڑھتے ہوئے داموں کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ چیزوں کے دام ضرور بڑھ رہے ہیں لیکن ایک اچھی بات یہ ہے کہ جہاں چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں وہیں انسان کی قیمت بھی دن بہ دن گھٹتی جارہی ہے۔ جب تک انسان کی قیمت کم ہوتی رہے گی تب تک مجھے چیزوں کے داموں کے بڑھنے کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ بھیّا میں تو ایک تاجر ہوں

وہی چیز خریدتا ہوں جو سستی مل جاتی ہے ۔ چنانچہ میں چیزیں نہیں خریدتا سستے داموں میں بکنے والے انسانوں کو خرید لیتا ہوں۔ میں چونکہ ٹھیکہ دار ہوں اس لئے اس عہدیدار کو ہی خرید لیتا ہوں جو مجھے ٹھیکے الاٹ کرتا رہتا ہے ۔ پھر اس ٹھیکے سے اتنا کما لیتا ہوں کہ مجھے چیزوں کے بڑھتے ہوئے داموں کی شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ۔ یہ بات یاد رکھیے کہ آپ کو کوئی انسان سستے داموں میں مل جائے تو پھر آپ دنیا کی کوئی بھی مہنگی چیز خرید سکتے ہیں ۔ جب تک اس ملک میں انسانوں کی قیمت گھٹتی رہے گی تب تک مجھے چیزوں کے داموں کے بڑھنے کی کوئی پرواہ نہیں ہے ۔"

○ "اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے بارے میں میری رائے جان کر آپ اپنا اور میرا دونوں کا وقت کیوں برباد کر رہے ہیں ۔ بھیا ! میں تو اپنے کاروبار کے سلسلہ میں زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتا ہوں اور وہاں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام کرتا ہوں ۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بیرونی ملکوں میں آلو ۔ پیاز ۔ گوبھی ۔ چاول وغیرہ کے کیا دام ہیں ۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے ملک میں ان چیزوں کے دام پوچھتا پھرونگا ۔ البتہ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ مختلف ملکوں کی فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بیروں کو دی جانے والی ٹپ کی کیا شرحیں ہیں ۔ یوں بھی ٹپ کے معاملہ میں میرا یہ اصول ہے کہ چاہے چار ڈالر کی آئے تو چائے لانے والے بیرے کو پانچ ڈالر کی ٹپ دیتا ہوں ۔ جب تک داڑھی سے مونچھیں بڑی نظر نہ آئیں تب تک مجھے مزہ نہیں آتا ۔"

○ "میں ایک سوشیل ورکر ہوں ۔ دن بھر قوم کی خدمت میں مصروف رہتی ہوں ۔ صبح ایک کلب میں ہوتی ہوں تو شام کسی اور کلب میں گزارتی ہوں ۔ ابھی کسی جلسہ میں تقریر کر رہی ہوتی ہوں تو ایک گھنٹہ بعد کسی آرٹسٹ کی تصویروں کی نمائش میں فیتہ کاٹ رہی ہوتی ہوں ۔ گویا میرے وقت کا ایک ایک لمحہ قوم کی خدمت کے لیے وقف ہوتا ہے ۔ مجھے تو بازار جانے کی فرصت ہی نہیں ملتی ۔ میں کیسے جان سکتی ہوں کہ پیاز کا کیا بھاو ہے ۔ ویسے آپ نے اس چیز کا دام پوچھا ہے تو یہ بتائیے کہ پیاز کسی پیڑ پر لگتی ہے یا اسے کسی کارخانہ میں بنایا جاتا ہے ۔

آپ یقین نہیں کریں گے۔ ایک بار سری نگر میں سیب کا پیڑ دیکھا تو یہ جان کر دنگ رہ گئی کہ سیب درخت پر لگتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ سیبوں کا بھی کوئی کارخانہ ہوتا ہے۔ تبھی تو یہ اتنے میٹھے ہوتے ہیں۔ آپ جن چیزوں کے داموں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں میں ان کے بارے میں یہ تک نہیں جانتی کہ یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں۔ ان کے دام جان کر میں اپنا وہ وقت کیوں برباد کروں جو قوم کی خدمت میں صرف ہو سکتا ہے۔"

(۲۸/ ڈسمبر ۱۹۹۷ء)

بل کلنٹن کو نیند کیوں آتی ہے؟

امریکہ کی بوسٹن یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کے پروفیسر ولیم انطونی کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف The Art of Napping یعنی "فن قیلولہ" اسی مہینہ شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے نیند کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بطور خاص "قیلولہ" کے فوائد کو اجاگر کیا ہے۔ قیلولہ اس مختصر مگر بے قاعدہ نیند کو کہتے ہیں جو آدمی دن کے وقت کام کے بیچ لے لیتا ہے۔ قیلولہ کو عام طور پر جھپکی بھی کہتے ہیں۔ ولیم انطونی نے یقیناً یہ اہم کام کئی راتیں جاگ کر کیا ہوگا کیونکہ ایسے کام نیند کی حالت میں تو نہیں کئے جاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ کئی نامور ہستیاں "قیلولہ" کی عادی رہی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جب لندن پر جرمن طیارے بم برسانے میں مصروف رہتے تھے تو وزیر اعظم برطانیہ سرونسٹن چرچل "قیلولہ" کر رہے ہوتے تھے۔ نیند سے جاگنے کے بعد ہی انہیں بتایا جاتا تھا کہ جرمن طیاروں نے کتنی تباہی مچائی ہے۔ بسااوقات وہ تباہی کا حال جاننے کے بعد پھر "قیلولہ" میں چلے جاتے تھے۔ ولیم انطونی کا کہنا ہے کہ تھامس ایڈیسن نے جب برقی بلب ایجاد کیا تو انسان کی نیند خطرہ میں پڑ گئی کیونکہ برقی بلب کی روشنی میں وہ دیر تک جاگنے کا عادی ہوگیا۔ لیکن خود تھامس ایڈیسن کا یہ حال تھا کہ موقع ملتے ہی "جھپکی" لینے کو ضروری سمجھتا تھا۔ برقی بلب کے ایجاد ہونے سے پہلے ایک عام آدمی دس گھنٹے کی نیند لیتا تھا لیکن برقی بلب کی ایجاد کے بعد اب اسے صرف چھ اور سات گھنٹے کی نیند میسر آتی ہے۔ فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ امریکہ کے موجودہ صدر بل کلنٹن جب سے پچاس برس کے ہوئے ہیں تب سے وہ بھی "قیلولہ" کو ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے "قیلولوں"

کو سرکاری راز بنائے رکھنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ ولیم انطونی نے کہا ہے کہ امریکی قوم چونکہ کام کرنے اور پیداوار بڑھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے اس لئے اپنے "قیلولہ" کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اکثر امریکی چوری چھپے قیلولہ کر لیتے ہیں اور لوگوں کو اس سے واقف نہیں کراتے۔ بھلا اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔

ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتے کہ ہم ولیم انطونی کی اس معرکتہ الآرا تصنیف کے بارے میں کچھ اظہار خیال کریں کیونکہ ہمارا تعلق صحافت اور وہ بھی اردو صحافت اور شعر و ادب سے رہا ہے۔ جس آدمی کی راتیں اخباروں کے دفتروں، ادبی محفلوں اور مشاعروں وغیرہ میں گذرتی ہوں اسے بھلا نیند سے کیا مطلب۔ اطمینان کی نیند تو وہ ایک بار ہی سوتا ہے اور ایسے سوتا ہے کہ پھر حشر کے دن ہی جاگتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ "قیلولہ" کیا ہوتا ہے۔ ابھی کچھ برس پہلے تک ہم "قیلولہ" کو "عصرانہ" "ظہرانہ" اور "عشائیہ" قسم کی چیز سمجھتے تھے۔ جب بھی ہمیں کسی کے بارے میں بتایا جاتا کہ موصوف قیلولہ کر رہے ہیں تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ موصوف ضرور کچھ کھا رہے ہیں۔ مگر جب ہمارا علی گڑھ آنا جانا زیادہ ہونے لگا تو تب ہمیں پتہ چلا کہ "قیلولہ" کس کو کہتے ہیں اور اس کے کیا آداب ہوتے ہیں (اس کا ذکر بعد میں آئے گا)۔ فاضل مصنف نے کہا ہے کہ امریکہ کے صدر بل کلنٹن بھی "قیلولہ" کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارا کہنا ہے یہ کہ آپ صرف صدر امریکہ کی نیند کے بارے میں ہی کیوں کہتے ہیں ہمارا خیال تو یہ ہے کہ نیند ہر امریکی کا پیدائشی حق ہے اور سونا امریکیوں کو ہی زیب دیتا ہے کیونکہ یہ امریکہ ہی ہے جس نے کئی ملکوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ برسوں اس نے "ویت نام" کو سونے نہیں دیا، سوویت یونین کو سونے نہیں دیا، جاپانیوں کو سونے نہیں دیا، اور تو اور ہم جیسے غریب ہندوستانیوں کو آج بھی چین سے سونے نہیں دیتا۔ جب امریکیوں ہی نے جاگتے رہنے کا کام دنیا کے پسماندہ ممالک کو سونپ رکھا ہے تو بھلا وہ کیوں مفت میں جاگتے رہیں اور پھر بل کلنٹن تو صدر امریکہ ہیں۔ وہ صرف قیلولہ کیوں کرتے ہیں۔ انہیں تو

گھوڑے بیچ کر سوجانا چاہیے۔ نیند، قیلولہ اور جھپکی وغیرہ سے بظاہر ہمارا کوئی شخصی تعلق نہیں ہے لیکن ہم ایسے لوگوں کے درمیان ضرور رہتے ہیں جو ان باتوں میں نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ ہماری وجہ سے ان کی نیند میں خلل بھی پڑتا رہتا ہے۔ اگرچہ ہماری زبان میں کہاوت مشہور ہے کہ جو سوئے گا وہ کھوئے گا لیکن اس کے باوجود ہم نے ہمیشہ لوگوں کو سوتے ہوئے اور پھر جاگ کر کچھ نہ کچھ پاتے ہوئے ہی دیکھا۔ ہمارے بیشتر سرکاری دفتر تو آرام گاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرکاری دفتروں کے خوابیدہ ماحول میں آپ کو عملہ کے زیادہ تر لوگ "جھپکی" لیتے ہوئے ہی ملیں گے۔

ایک سرکاری افسر نے اپنے ماتحت کو بلا کر پوچھا "آج تم دیر سے دفتر کیوں آئے؟" اس پر کلرک نے ڈرتے ڈرتے کہا "حضور! آج میں غلطی سے دیر تک سوتا رہا"۔ اس پر افسر نے کہا "اچھا تو تم دفتر کے علاوہ گھر میں بھی سو جاتے ہو"۔ ہمیں اس وقت ایک اور کلرک کی یاد آگئی جس نے اپنے افسر کو چھٹی کی درخواست بھیجتے ہوئے لکھا "حضور! برسوں بعد آج میری صحت کچھ بہتر نظر آرہی ہے۔ اسی لئے آج میں زندگی سے کچھ لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ لہذا مجھے ایک دن کی رخصت بیماری نہیں بلکہ "رخصت صحت مندی" دی جائے۔ گویا دفتروں میں کام کرنے والا عملہ دفتر کو "آرام گاہ" کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ایسے ماحول میں سونا نہ صرف ضروری ہوجاتا ہے بلکہ اسے ایک نصب العین کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

رہی بات سونے اور قیلولہ کی تو ہمارے سابق وزیر اعظم مسٹر دیوے گوڑا نے بھی سونے کے معاملہ میں خاصا نام کمایا اور محض ان کی وجہ سے ہمیں اس کہاوت پر ایمان لانا پڑا کہ جو سوئے گا وہ کھوئے گا۔ کیونکہ دس مہینوں تک سونے کے بعد وہ پوری طرح جاگے تو پتہ چلا کہ وزارت عظمٰی کی کرسی ان کے نیچے سے نکل گئی ہے۔ تاہم اب بھی ہمیں اس کہاوت کی صداقت پر پورا یقین نہیں ہے کیونکہ ہم تو برسوں سے جاگ رہے ہیں اور زندگی میں کھونے کے سوائے کچھ نہیں پایا۔ ادیب ہونے کے ناتے ہم کچھ حاصل کرنے یا پانے کو ضروری نہیں

سمجھتے کیونکہ ہماری منطق ہی الٹی ہوتی ہے۔ ہم تو کھونے کو ہی پانا سمجھتے ہیں۔ حسنِ جہاں سوز کو دیکھ کر اپنے ہوش کھونے میں جو مزہ ہے وہ کچھ حاصل کرنے میں بالکل نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم بالکل نہیں سوتے۔ کبھی کبھار ضرور سو جاتے ہیں اور جب کبھی نیند نہیں آتی تو فلسفہ، ساختیات، پس ساختیات، مابعد جدیدیت وغیرہ جیسے موضوعات پر مضامین یا کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ ایسی زود اثر تحریریں ہوتی ہیں کہ دو چار سطروں کی خوراک لیتے ہی نیند آجاتی ہے۔ ایک بار ہمارے پاس ایسی کتابیں نہیں تھیں۔ رات کے تین بجے تھے اور ہمیں نیند نہیں آرہی تھی۔ ہم نے تنگ آکر ایک ڈاکٹر دوست کو فون کیا۔ ڈاکٹر نے گہری نیند سے جاگ کر فون کا ریسیور اٹھایا۔ پوچھا "کیا بات ہے؟"

ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب نیند نہیں آرہی ہے۔ کیا کروں؟" بولا "کچھ نہیں تم ریسیور کو یونہی پکڑے رہو۔ میں تمہیں لوری سناتا ہوں" یقین مانئے اسکی آواز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ لوری کی پہلی تان سنتے ہی ہماری آنکھ لگ گئی۔ چاہے کچھ بھی ہو ہم سونے کو اچھا نہیں سمجھتے کیونکہ ہمیں بچپن سے ہی یہ سکھایا گیا ہے کہ جاگتے رہنے میں ہی انسان کی بھلائی ہے۔ بچپن میں ایک گانا سنا تھا "تری گٹھری میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا" اس گانے پر اب تک عمل کرتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ہمارے پاس گٹھری ہی نہیں ہے تو چور کیا کر لے گا۔ اس ذہنی تربیت کی وجہ سے ہم سونے کو کوئی اچھی بات نہیں سمجھتے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو سدا مصروف رہتے ہیں۔ انکے گھر جب بھی فون کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ فلاں کام میں مصروف ہیں، فلاں میٹنگ میں مصروف ہیں وغیرہ۔

ایک دن ہم نے انکے گھر فون کیا تو ان کے بیٹے نے فون اٹھایا۔ ہم نے پوچھا "ڈیڈی کیا کر رہے ہیں؟" بیٹے نے جواب دیا "مصروف ہیں" ہم نے پوچھا "کس کام میں مصروف ہیں؟" جواب ملا "جی اسوقت تو سونے میں مصروف ہیں"۔ یہی وجہ ہیکہ ہمارے رہنماؤں اور مصلحینِ قوم کا سب سے اہم کام یہی رہا ہے کہ قوم کو بیدار کریں۔ قوم ذرا بھی جھپکی لینا چاہتی ہے تو رہنما اسے پھر سے بیدار کر دیتے ہیں۔ سر سید احمد خاں نے بہت عرصہ پہلے قوم کو

بیدار کیا تھا جس کے نتیجہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آج وہ قوم اس بیداری کا بدلہ "قیلولہ" کی شکل میں لے رہی ہے۔ چنانچہ علی گڑھ کے قیلولے کو وہی شہرت حاصل ہے جو آگرہ کے پیٹھے، بنارس کے پیڑے اور ناگپور کے سنگترے کو حاصل ہے۔ جب تک ہم نے علی گڑھ آنا جانا شروع نہیں کیا تھا تب تک ہمیں پتہ نہیں تھا کہ "قیلولہ" کس کو کہتے ہیں۔ اب نہ صرف پتہ چل گیا ہے بلکہ خود ہم بھی "قیلولہ" کے عادی ہو گئے ہیں۔ دوپہر کے وقت عموماً سارا علی گڑھ (کم از کم سر سید احمد خاں کا علی گڑھ) تو ضرور قیلولہ میں مصروف رہتا ہے۔ سر سید احمد خاں نے سوا سو سال پہلے جس قوم کو بیدار کیا تھا اس قوم نے اب اپنی بچی کھچی نیند کی تلافی کے لئے "قیلولہ" کو ایجاد کر لیا ہے۔

(یکم / جون ۱۹۹۷ء)

کابینہ بنانا

"پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا" یہ ایک بڑا پرانا مصرعہ ہے جو پرانے حکمرانوں کی سہولت کی خاطر شاعر نے کہہ رکھا تھا کہ بھیا حکومت کرنا چاہتے ہو تو پُل بناؤ ، چاہ بناؤ ، اور اگر ہوسکے تو مسجد اور تالاب بھی بناؤ ۔ یہ بات پرانے حکمرانوں کے لیے تھی جو کچھ نہ کچھ بنانے کو نہایت ضروری سمجھتے تھے ۔ دیکھا جائے تو پرانے حکمران بھی اس آسان سے مشورہ پر صدقِ دل سے عمل نہیں کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض عاقبت اندیش حکمران پُل اور تالاب بنانے کے بجائے اپنی زندگی میں ہی اپنے مقبرے بنوانے میں لگے رہتے تھے اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ ان میں بہ رضاور غبت دفن ہوا کرتے تھے ۔ خیر ہمیں پرانے حکمرانوں سے کیا لینا دینا ہے البتہ آج کے حکمرانوں کی بابت یہ ضرور جانتے ہیں کہ یہ نہ تو پُل بنا سکتے ہیں اور نہ ہی چاہ بناتے ہیں ۔ رہی مسجد کی بات تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ان دنوں مسجدیں بنانے کے نہیں گرانے کے کام آتی ہیں ۔ اور جو چاہ نہیں بنا سکتا وہ بھلا تالاب کیا بنائے گا ۔ اسی لئے آج کے حکمران اگر کوئی چیز بناتے ہیں تو وہ صرف کابینہ ہے اور کابینہ سازی بھی ان دنوں ظروف سازی کی طرح ایک صنعت بن گئی ہے ۔ ابھی اترپردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے چیف منسٹر کلیان سنگھ نے ایک جلسہ عام کو اپنی کابینہ بنادیا ہے ۔ اس میں 93 وزراء شامل ہیں ۔ اور یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ وہ اس کابینہ میں مزید توسیع کریں گے اور وزراء کے اسکور کو 110 تک لیجائیں گے ۔ ہم تو یہ انتظار کررہے تھے کہ کلیان سنگھ اپنی کابینہ میں مزید توسیع کریں گے تو کالم لکھیں گے ۔ لیکن وہ 93 کے اسکور پر یوں مرک گئے جیسے ہمارے بیشتر کرکٹ کھلاڑی سنچری

بنانے سے پہلے اچانک اپنے اسکور کو روک دیتے ہیں اور سنچری بنائے بغیر ہی آوٹ ہوجاتے ہیں۔ ہمیں تو یوں لگ رہا ہے جیسے کلیان سنگھ بھی ہمارے کرکٹ کھلاڑیوں کی تقلید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو کلیان سنگھ جی نے جو کابینہ بنائی ہے وہ اتنی بڑی ہے کہ ہمارے ہاں اچھی سی ادبی محفل میں بھی اتنے لوگ شریک نہیں ہوتے۔ یوں بھی اردو کی محفلیں ان دنوں ماضی کی ایماندار سرکاروں کی کابیناوں کی سائز کے برابر ہوگئی ہیں۔

کلیان سنگھ جی کی کنگ سائز کابینہ کو دیکھنے کے بعد ہمیں اب افسوس ہورہا ہے کہ بہت عرصہ پہلے ہم نے بلاوجہ اپنے کرم فرما آنجہانی ٹی انجیا سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش کی بنائی ہوئی کابینہ کا مذاق اڑایا تھا اور اس کے بارے میں طرح طرح کے لطیفے اختراع کئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ٹی انجیا جب آندھرا پردیش کے چیف منسٹر بنے تھے تو انہوں نے اپنی کابینہ میں غالباً ساٹھ، ستر وزرا کو شامل کیا تھا۔ اس پر سارے ملک میں ان کی بڑی لے دے ہوئی تھی اور لوگ محض اس ڈر سے ان سے ملتے ہوئے گھبرانے لگے تھے کہ وہ کہیں انہیں اپنی کابینہ کا وزیر نہ بنادیں۔ جس دن ان کی کابینہ کا اعلان ہوا تھا اس دن اتفاق سے ہم حیدرآباد میں تھے۔ وہ ہمارے پرانے کرم فرما اور اورینٹ ہوٹل کے پرانے حلقہ بگوشوں میں تھے۔ سوچا کہ انہیں چیف منسٹر بننے کی مبارکباد دینی چاہیے۔ ان دنوں وہ بیگم پیٹ کے گرین لینڈ گیسٹ ہاوس میں مقیم تھے۔ ہم نے ایک آٹو رکشا والے سے کہا "میاں کرایہ کروگے؟" پوچھا "کہاں چلنا ہے؟" ہم نے کہا "چیف منسٹر کی رہائش گاہ گرین لینڈ گیسٹ ہاوس چلنا ہے" رکشا والے نے کہا حضور آپ جہاں کہیں وہاں چلنے کو تیار ہوں لیکن گیسٹ ہاوس ہرگز نہیں جاونگا" ہم نے پوچھا "وہ کیوں؟" بولا "سنا ہے انجیا صاحب لوگوں کو دھڑا دھڑ وزیر بنارہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان کی نظر مجھ پر پڑگئی اور انہوں نے مجھے اپنی کابینہ میں شامل کرلیا تو میں کہیں کا نہیں رہونگا۔ وزارت تو گاجر کی سیٹی ہوتی ہے جسے تو کوئی بھی کسی بھی وقت توڑ کر کھاسکتا ہے۔ خدانخواستہ ایک بار وزیر بن گیا تو بعد میں آٹو رکشا چلانے کے قابل بھی نہیں رہونگا۔ محنت کی کمائی کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔

لہذا آپ اس کام کے لئے کسی اور آٹو رکشا والے کو پکڑیں تو مناسب ہے " بعد میں ہم نے یہ واقعہ سید رحمت علی کو سنادیا جو ان دنوں پارلیمنٹ کے رکن تھے ۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ رحمت علی صاحب پیٹ کے اتنے کچّے نکلیں گے ۔ انہوں نے یہ بات انجیا صاحب کو بتا دی ۔ دو چار دن بعد ہم انجیا صاحب سے ملے تو انہوں نے ہمیں الگ لے جاکر پوچھا " وہ آٹو رکشا والا کون تھا جو تمہیں گرین لینڈ گیسٹ ہاوس لے کر نہیں آیا تھا تم نے اس کا نام اور آٹو رکشا نمبر ضرور نوٹ کیا ہوگا " ہم نے پوچھا " اگر ہم نام اور نمبر نوٹ کر لیتے تو کیا آپ اسے وزیر بنادیتے " بولے " یہ مذاق کی بات نہیں ہے ۔ ان آٹو رکشا والوں کا دماغ بہت خراب ہوتا جارہا ہے اگر تم اس کا نام اور آٹو رکشا نمبر نوٹ کرلیتے تو میں اس کا چالان کروا دیتا تاکہ وہ آئندہ دوسری سواریوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے ۔ "

یہ بھی ان ہی دنوں کی بات ہے کہ جب وزیروں میں قلمدانوں کی تقسیم کی نوبت آئی تو پتہ چلا کہ قلمدان تو کم ہیں اور وزیر زیادہ ہوگئے ہیں ۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے نئے قلمدان اختراع کرنے کی بات ہونے لگی تو کسی نے تجویز پیش کی کہ یہ جو وزارت برائے ہینڈلوم Handloom ہے تو اس کا قلمدان ایک وزیر کے پاس رکھنے کی کیا ضرورت ہے ۔ کیوں نہ اس وزارت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے ۔ Hand کا قلمدان ایک وزیر کو دیا جائے اور Loom کا قلمدان کسی دوسرے وزیر کو دیا جائے ۔ بہر حال ایسی ہی کئی باتیں انجیا صاحب کی کابینہ کے بارے میں ہوئی تھیں ۔ مگر اب جو کلیان سنگھ نے 93 وزراء کی کابینہ بنائی ہے تو ہمیں دکھ ہو رہا ہے کہ ہم نے خواہ مخواہ ہی اپنے ایک کرم فرما کا مذاق اڑایا تھا ۔ ان کی کابینہ تو اتر پردیش کی کابینہ کے مقابلہ میں بہت چھوٹی تھی ۔ پتہ چلا ہے کہ اتنے سارے وزیروں کے بیٹھنے کے لئے اتر پردیش سکریٹریٹ میں کمروں کا بندو بست کرنا دشوار ہوگیا ہے ۔ کئی سرکاری عہدیداروں کو زبر دستی ان کے کمروں سے نکالا جارہا ہے ۔ تاکہ ان کے کمروں میں وزیروں کو بٹھایا جاسکے ۔ کلرک گھبرائے گھبرائے پھر رہے ہیں کہ کہیں ان کی ٹوٹی پھوٹی میز پر کسی وزیر کو لاکر نہ بٹھا دیا جائے ۔ کسی نے بتایا کہ کلیان سنگھ کی کابینہ کا جو پہلا اجلاس ہوا تو اس میں بعض وزیروں کو

بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی ۔ بے چاروں نے کھڑے کھڑے کابینہ کے اجلاس میں شرکت کی ۔ حلف برداری کی رسم میں ایک گورنر کے ذریعہ اتنے سارے وزیروں کو حلف دلوانا بھی ناممکن نظر آنے لگا۔ اسی لئے سب وزیروں کو قطار میں اس طرح کھڑا کیا گیا جس طرح اسکولوں میں بچوں کو صبح کی دعائیہ تقریب میں کھڑا کیا جاتا ہے ۔ یہ بات وزیروں کی شان کے خلاف ہے کہ ان کے ساتھ طالب علموں کا سا سلوک کیا جائے۔ اسی لئے مناسب یہی لگتا ہے کہ مستقبل میں حلف برداری کی رسم ہی سرے سے ختم کردی جائے ۔ یوں بھی ہمارے آج کے وزیر اس بات پر کہاں عمل کرتے ہیں جس کے کرنے کی قسم وہ سب کے سامنے کھاتے ہیں یہ تو محض ایک تکلف ہی ہے۔ اگر کسی وجہ سے حلف برداری کی رسم کو ترک نہیں کیا جا سکتا تو پھر یہ کیا جائے کہ ریاست میں دو سے زیادہ گورنر بھی متعین کئے جائیں تاکہ وہ اطمینان قلب کے ساتھ حلف برداری کی رسم انجام دے سکیں ۔ جب کابینہ اتنی بڑی ہو سکتی ہے تو کسی ریاست کے گورنر بھی ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں ۔ یہ سب طلب اور رسد کا پرانا معاشی اصول ہے۔

یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اتر پردیش کے ایک تازہ وزیر نے پچھلی کابینہ کے ایک وزیر کے سابقہ کمرہ پر لگی ہوئی تختی اپنے ہاتھ سے نکال دی اور اس کی جگہ اپنے نام کی تختی لگا دی ۔ پھر اس وزیر کے عملہ سے کہا کہ وہ کوئی اور مناسب کمرہ تلاش کرلیں ہم تو یہیں بیٹھیں گے ۔ ہم تو عام زندگی میں بھی اپنی رہائش کا مسئلہ اسی طرح حل کرتے آئے ہیں ۔ ہمیں اس پر کوئی تعجب بھی نہیں ہے کیونکہ معلوم ہوا ہے کہ اتر پردیش کی کابینہ میں ایک درجن سے زیادہ مجرمین کو بھی شامل کیا گیا ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن پولیس والوں کو کسی اور سلسلہ میں ان وزیروں کی تلاش تھی ۔ اب انہیں ان وزیروں کا محافظ بنا دیا گیا ہے جب قوم کے محافظ ہی ایسے ہوں تو پھر پولیس والوں پر الزام دھرنا بھی کیا معنی رکھتا ہے ۔ جیسا راجہ ہوتا ہے پرجا بھی تو ویسی ہی ہوتی ہے ۔

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ ہماری سیاست میں جب مجرمین کا اثر بڑھتا جارہا ہے تو ان مجرمین کی موجودگی کو کیوں نہ تسلیم کیا جائے بلکہ جس طرح پسماندہ

طبقات اور خواتین وغیرہ کے لئے کابینہ میں نشستیں محفوظ ہوتی ہیں تو کیوں نہ مجرمین کے لئے بھی نشستوں کے تحفظ کا بندوبست کیا جائے۔ قلمدانوں کی قلت جب اتنی زیادہ ہو تو کیوں نہ ایک وزارت برائے فروغ جرائم بھی تشکیل دی جائے۔ یہ وزراء اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر عام مجرمین کو ایسے راستے بتا سکتے ہیں کہ کس طرح کوئی جرم کرنے کے بعد گرفتار ہونے سے بچا جائے اور پھر وزارت کی کرسی حاصل کی جائے کیونکہ گرفتاری سے بچنے کا سب سے شریفانہ طریقہ ان دنوں یہی رہ گیا ہے کہ آدمی وزیر بن جائے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کئی وزیروں کو اب تک موٹریں بھی فراہم نہیں کی گئی ہیں۔ نتیجہ میں بے چارے دوسروں کی گاڑیوں میں گھوم رہے ہیں یا تین چار وزیر مل کر ایک ہی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ ایک وزیر کے بارے میں تو یہاں تک سنا ہے کہ انہیں موٹر تو نہیں ملی ہے البتہ مستقبل میں ملنے والی موٹر پر لگایا جانے والا جھنڈا ضرور دیدیا گیا ہے تاکہ جب بھی موٹر آئے تو یہ جھنڈا وہاں لگا دیا جائے۔ اس جھنڈے کو موٹر کے آنے کے انتظار میں بیکار رکھنا مناسب نہیں ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ جب بھی وزیر موصوف باہر نکلیں تو اپنے پرائیویٹ سکریٹری کے ہاتھ میں یہ جھنڈا دیدیا کریں تاکہ وہ ان کے آگے چلتا رہے۔ اس طرح لوگوں کو یہ تو معلوم ہو گا کہ پیچھے ایک وزیر آرہا ہے۔ اتر پردیش میں مخلوط حکومتوں کے چلن کی وجہ سے وہاں پہلے ہی سے اچھے خاصے قلمدان ہائے وزارت تشکیل پا چکے ہیں۔ مایاوتی سرکار میں ایک وزیر کے پاس تو سیلابوں پر قابو پانے کا قلمدان وزارت Department of Flood Control موجود تھا۔ بد قسمتی سے مایاوتی کے دور حکومت میں اتر پردیش کے دریاؤں میں کوئی سیلاب ہی نہیں آیا۔ نتیجہ میں بے چارا یہ وزیر سیلاب کے آنے کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ سیلاب تو نہیں آیا لیکن ایک ایسا سیاسی سیلاب آیا کہ اس کی وزارت کو ہی بہا کر لے گیا۔ غرض اتر پردیش میں جس طرح سیاسی تجربے ان دنوں ہونے لگے ہیں اس کے باعث ریاست اتر پردیش ہماری جمہوریت کی ایک لیباریٹری بن چکی ہے جس میں آئے دن ناتجربہ کار سیاستدانوں کے ہاتھوں خطرناک تجربے کئے جا رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کلیان سنگھ کی اس لیباریٹری میں دھماکہ کب ہوتا ہے۔

(۹/ نومبر/ ۱۹۹۷ء)

دیش کدھر جارہا ہے

ایک بہت پرانے دوست کل راستہ میں اچانک مل گئے ۔ پہلے تو رسمی باتیں ہوئیں ۔ پھر انہوں نے ہم سے پوچھا " یار ذرا یہ تو بتاؤ کہ ہمارا دیش کدھر جارہا ہے ؟ " بجائے اس کے کہ ان کے اس آسان سے سوال کا جواب دیدیتے الٹا ہم نے ان سے پوچھ لیا " پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم کدھر جارہے ہو ؟ "

ہمارے اس سوال پر ہمیں اس آدمی کی یاد آگئی جس کے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کٹی ہوئی تھیں ۔ کسی نے اس سے انگلیوں کے کٹ جانے کا سبب پوچھا تو بولا " ایک بار میں نے اپنے گھوڑے کے دانتوں کی تعداد کو جاننے کی خاطر اس کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈالا تھا ۔ ابھی میں دانتوں کو گن ہی رہا تھا کہ اچانک گھوڑے کو خیال آیا کہ کیوں نہ وہ بھی میری انگلیوں کو گن لے ۔ لہٰذا اس نے اپنا منہ اچانک بند کردیا اور میری انگلیاں اس کے منہ میں رہ گئیں "

بہر حال ہمارے اس غیر متوقع سوال پر ہمارے دوست سٹپٹا گئے ۔ کچھ سوچا پھر بولے " بات دراصل یہ ہے کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں ۔ پھر ان دنوں بچوں کے امتحانات بھی چل رہے ہیں ۔ سوچا کہ گھر میں نہیں رہونگا تو بچوں کو شاید میرے کمرہ میں پڑھنے کی سہولت مل جائے ۔ اسی خیال سے گھر سے نکلا ہوں ۔ سوچتا ہوں کچھ دیر کافی ہاؤس میں گزاروں ۔ پھر کسی لائبریری میں جاکر بیٹھ جاؤں گا ۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم کدھر جارہے ہو ؟ " ہم نے کہا " میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے ۔ گھر سے تو باہر نکل آیا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کدھر جاؤں ۔ تمہاری طرح شاید کافی ہاؤس چلا جاؤں ورنہ ہوسکتا ہے یہیں کھڑے کھڑے بازار کی رونق کو دیکھتا رہ جاؤں ۔ یوں سمجھو کہ میں کہیں جانے کے

خیال سے گھر سے باہر نہیں نکلا ہوں بلکہ کہیں نہ جانے کے ارادہ سے باہر نکل آیا ہوں۔ ہمارے دوست امیر قزلباش کا شعر ہے۔

تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو
کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے

نہ تو مجھے اپنے بارے میں پتہ ہے کہ کدھر جانا ہے اور نہ ہی تم جانتے ہو کہ تمہیں کدھر جانا ہے۔ ایسے میں تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ بتاؤ دیش کدھر کو جارہا ہے۔ جب ہمیں ہی یہ پتہ نہیں کہ ہم کدھر جارہے ہیں تو یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ دیش کدھر کو جارہا ہے۔ جا بھی رہا ہے یا نہیں یا اپنی جگہ چپ چاپ کھڑا ہوگیا ہے۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ دیش بھی کافی ہاوس جانے کے بارے میں سوچ رہا ہو" ہمارے اس جواب سے ہمارے دوست کچھ مطمئن سے ہوگئے۔ پھر بولے "ایسی بات ہے تو چلو ہم بھی کافی ہاوس چلتے ہیں"۔ اس کے بعد ہم دونوں نے بڑی دیر تک کافی ہاوس میں خاصا وقت گذارا۔ رخصت ہوتے وقت نہ تو ہمارے دوست نے پوچھا کہ ہم اس کے بعد کہاں جارہے ہیں اور نہ ہی ہم نے ان سے پوچھا کہ وہ اس کے بعد کہاں جارہے ہیں؟۔ کیونکہ ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کون کدھر کو جارہا ہے۔ یہی حال اپنے دیش کا ہے"۔ بیس پچیس برس پہلے تک تو ہمیں پتہ تھا کہ ہمارا دیش کہیں نہ کہیں جارہا ہے۔ ہمارے رہنما اسے جدھر لے جانا چاہتے تھے وہ چلا جاتا تھا۔ اب رہنماؤں کو خود پتہ نہیں کہ وہ خود کدھر جارہے ہیں اور دیش کدھر کو جارہا ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ دیش کہیں بھی نہیں جارہا ہے۔ دنیا کے نقشہ میں تو وہ وہیں موجود ہے۔ پھر جب سے اس میں لٹکتی پارلیمنٹس HUNG PARLIAMENTS بننے لگی ہیں تب سے تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہوگیا ہے پہلے تو پارلیمنٹ انگریزی میں "ہنگ" بنتی ہے پھر بعد میں ہندی میں "بھنگ" ہوجاتی ہے اور یوں ہماری جمہوریت "ہنگ" اور "بھنگ" کے بیچ لٹکنے لگی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہم ہندوستانیوں کی زندگی خود ایک عرصہ سے معلق چلی آرہی ہے۔ خیر شخصی طور پر ہمیں تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہمارا تعلق متوسط طبقہ سے ہے اور متوسط

طبقہ وہ طبقہ ہوتا ہے جو امیر اور غریب کے درمیان پنڈولم کی مانند لٹکتا رہتا ہے۔ کبھی امیر طبقہ کی طرف جاتا ہے اور کبھی غریب طبقہ اسے اپنی جانب کھینچ لیتا ہے اور یونہی لٹکتے لٹکتے یہ طبقہ اس جہان فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ ہمیں تو خیر اب لٹکنے کی اچھی خاصی پریکٹس ہو چکی ہے۔ جو آدمی پچھلی چھ دہائیوں سے لٹکتا چلا آرہا ہو اس کے لٹکنے کی مہارت کے بارے میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے۔ یوں بھی زندگی کے سرکس میں ہم نے لٹکنے کے سوائے کوئی اور کام نہیں کیا ہے۔ اب اگر اس ملک میں لٹکنے والی پارلیمنٹیں بننے لگی ہیں تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے ایک بزرگ دوست ہیں جن کی جائیداد کا مقدمہ پچھلے پچاس برسوں سے عدالت میں لٹکا ہوا ہے۔ جب انہوں نے یہ مقدمہ لڑنا شروع کیا تھا تو ماشاءاللہ اس وقت ان کی عمر بیس برس تھی۔ اب ستر برس کے ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں انھوں نے نہ صرف شادی کی بلکہ چھ بچے بھی اس امید میں پیدا کیے کہ شاید مقدمہ کا فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے۔ یہی نہیں بعد میں انھوں نے اس مقدمہ کی آس میں اپنے بیٹوں کی شادیاں بھی کیں اور ان بیٹوں نے ماشاءاللہ حسب استطاعت اپنے بچے پیدا کرلیے۔ گویا اس مقدمہ کی ڈور سے پہلے تو ہمارے دوست ہی لٹکا کرتے تھے اب پچیس تیس افراد خاندان اس مقدمہ کی ڈور سے لٹکے ہوئے ہیں۔ لٹکنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ہم اپنے ان بزرگ دوست سے ملنے گئے تو دیکھا کہ موصوف اپنے فرزند اکبر کو اپنے سامنے بٹھائے مقدمہ کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے، بھیا! زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ کسی بھی وقت بلاوا آسکتا ہے۔ اس لئے مقدمہ کی ذمہ داری اپنے بیٹے کو سونپ رہا ہوں کہ بعد میں وہ لڑتا رہے۔ ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ اب ان کے بڑے بیٹے کی لٹکنے کی باری ہے۔ لٹکنے اور متواتر لٹکنے کی یہ مثال تو ہمارے سامنے کی ہے۔ جو لوگ سرکاری دفتروں کے اسرار و رموز سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں دفتروں میں فائلیں کھولی ہی اس لئے جاتی ہیں کہ معاملوں کو لٹکایا جائے۔ فائیل ایک بار کھلتی ہے تو پھر بند ہونے کا نام نہیں لیتی۔ ہمارے ایک اور دوست کا طلاق کا مقدمہ پچھلے تیس برسوں سے

عدالت میں زیر دوراں ہے میاں اور بیوی دونوں نے نہ جانے اپنی کتنی ہی توانائیاں اس مقدمہ کے پیچھے صرف کردیں ۔ دونوں الگ الگ رہتے ہیں لیکن پچھلے ہفتہ ہمارے دوست نے ایک دن آئینہ میں اپنے آپ کو تفصیل سے دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ جس مقصد کے لئے انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تھا وہ مقصد ہی فوت ہواجارہا ہے ۔ پرسوں ملے تو ہم سے کہنے لگے " بھیاّ زندگی کے تیس برس تو میں نے طلاق کے مقدمہ میں لٹکنے میں ہی گزار دیئے اب سوچتا ہوں کہ کیوں نہ اپنی بیوی کو گھر لے آؤں تاکہ اپنی زندگی کے باقی پانچ چھ برس اس کے ساتھ ہنسی خوشی گزار سکوں " جس ملک میں لٹکنے کو ہی بنیادی اہمیت حاصل ہو وہ ملک بھلا آگے کس طرح جاسکتا ہے ۔ یوں بھی دنیا کے نقشہ میں ہمارے ملک کا جغرافیائی محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ لگتا ہے کسی دھوبی نے اپنا کوئی کپڑا سوکھنے کے لیے الگنی سے لٹکا دیا ہے ۔ جب ملک ہی لٹک رہا ہوتو ہم کس شمار قطار میں ہیں ۔ ہم اپنی روز مرہ زندگی کی سرگرمیوں کا ہی جائزہ لیتے ہیں تواحساس ہوتا ہے کہ روزآنہ ہمارا زیادہ تر وقت یونہی لٹکنے میں بیت جاتا ہے ۔ صبح اٹھتے ہی دودھ کے ڈپو کی قطار میں لٹکنے کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں ۔ وہاں سے آتے ہیں تو خود اپنے ہی گھر کے باتھ روم کی قطار میں لٹکنے لگ جاتے ہیں ۔ بس کی قطار ، راشن کی قطار ، لفٹ کی قطار ، سینما گھر کی قطار غرض سارا دن ایک قطار سے نکل کر دوسری قطار میں جاتے رہتے ہیں اور اتنی ساری قطاروں سے گزرنے کے بعد جب آدمی کے اس دنیا سے جانے کا وقت آتا ہے تو اس کی نعش تک کو قبرستان میں " مردوں کی قطار " میں لے جا کر رکھ دیا جاتا ہے ۔ اسی لیے جب لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ ملک کدھر کو جارہا ہے تو ہمیں ہنسی آجاتی ہے ۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا ملک کہیں بھی نہیں جارہا ہے ۔ اگر وہ کہیں جارہا ہوتا تو ہم بھی اس کے ساتھ چلے جاتے ۔ ہم تو برسوں سے معلق کھڑے ہوئے ہیں ۔ آزادی کے بعد ہم عرصہ تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ہمارا ملک ضرور کہیں نہ کہیں جارہا ہے ۔ کچھ دن تو یہ جاتا بھی رہا مگر اب پتہ بھی نہیں چلتا کہ چل بھی رہا ہے یا نہیں ۔ آپ نے بالوں سے بھرا ہوا پومیرین کتا ضرور دیکھا ہوگا ۔

یہ بالوں سے اتنا ڈھکا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے سر اور اس کی دم کے محل وقوع کا پتہ چلانا دشوار ہے ۔ جب تک یہ چلنے نہ لگے تب تک آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کدھر کو جائیگا ۔ ہمارے ملک کی حالت بھی ایسی ہی ہوگئی ہے ۔ پارلیمنٹیں بن رہی ہے اور ٹوٹ رہی ہیں ۔ پہلے بڑی سیاسی پارٹیوں کی اہمیت تھی اب وہ بھی جاتی رہی کیونکہ آزاد امیدوار سیاسی پارٹیوں سے زیادہ اہم بنتے جا رہے ہیں ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہماچل پردیش میں وہاں کی سرکار کا سارا دارومدار ایک آزاد امیدوار کے کندھوں پر ہے اور آزاد امیدوار وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں کبھی پیش قیاسی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کب کدھر کو چلا جائے گا ۔ اس لیے ملک کے شہریوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ یہ جاننے میں اپنا وقت بالکل برباد نہ کریں کہ ملک کدھر جارہا ہے ۔ البتہ یہ ضرور جاننے کی کوشش کریں کہ وہ خود کدھر جارہے ہیں ۔

(۱۵ /مارچ ۱۹۹۸ء)

ایجنڈے میں کیا ہے ۔

ہم ایک ثقافتی تنظیم کے رکن ہیں جس کی مجلس عاملہ کے اجلاس سال میں دو تین مرتبہ منعقد ہوتے ہیں ۔ پچھلے ہفتہ جب ہم اس کے اجلاس میں شرکت کے لئے پہنچے اور ایک کارکن سے میٹنگ کے ایجنڈے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا " حضور ! آپ بھی کیسی بات کرتے ہیں ۔ہماری تنظیم ایک ثقافتی ادارہ ہے ۔ ہم تعمیری کام کرتے ہیں۔ کوئی تخریبی کام تو کرتے نہیں کہ اس کے لیئے کسی ایجنڈے کی ضرورت پیش آئے ۔ اس لئے ہم نے طے کیا ہے کہ آئندہ سے ہمارے اجلاس کسی ایجنڈے کے بغیر ہی منعقد ہوا کریں " ۔ کارکن کے اس بیان پر ہمیں تھوڑی سی حیرت تو ضرور ہوئی لیکن جب ہم نے اس کی بات پر سنجیدگی سے غور کیا تو احساس ہوا کہ ان دنوں ایجنڈے کا لفظ سچ مچ بُرے معنوں میں ہی استعمال ہونے لگا ہے ۔ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے ۔ پچھلے دنوں دو اشخاص میں کسی بات پر لڑائی ہوئی ۔ گالی گلوج اور ہاتھا پائی کی نوبت آگئی تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کرکے دونوں کو الگ کیا ۔ پھر بھی ایک شخص نے جاتے جاتے دوسرے شخص کو دھمکی دی کہ " بیٹا ! یاد رکھنا آج سے تم میرے ایجنڈے میں شامل ہوگئے ہو " ۔ دوسرے نے کہا " کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں ۔ یہ نہ سمجھو کہ میرے پاس ایجنڈہ نہیں ہے ۔ وقت آنے پر تمہیں میرے ایجنڈے کا پتہ چل جائے گا ۔ ؟ "

ادھر جب سے بھارتیہ جنتا پارٹی نے مسجدوں کے معاملہ میں ایک ایجنڈا بنا کر کام کرنا شروع کیا ہے تب سے بیچارے ایجنڈے کے معنی و مفہوم ہی بدل گئے ہیں ۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب اخباروں میں ایجنڈے کا لفظ نہ دکھائی پڑتا ہو

میرا کالم

کوئی کہتا ہے کاشی اور متھرا ہمارے ایجنڈے میں شامل نہیں ہیں۔ دوسرا کہتا ہے "واہ! یہ کیا بات ہوئی۔ کاشی اور متھرا تو ہمارے ایجنڈے میں پہلے سے شامل ہیں۔ بھیا! ہمارا ایجنڈا تو بہت بڑا ہے اور ہم نے اسے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ اسے ہم یوں آسانی سے منہدم نہ ہونے دیں گے۔"

ہمارے ایک مفلوک الحال، پریشان حال اور خستہ حال دوست ہیں (ہمارے دوستوں کی اکثریت ایسی ہی ہے) پچھلے ساٹھ برسوں سے کرایہ کے مکانوں میں رہتے آئے ہیں۔ کبھی اپنا ذاتی مکان نہ بنواسکے۔ اب مکانوں کے بڑھتے ہوئے کرایوں اور مکان مالکوں کے بڑھتے ہوئے ظلم و ستم کے ہاتھوں مجبور ہو کر پرسوں ہمارے پاس یہ فریاد کرتے ہوئے آئے کہ "بھیا! زندگی سے عاجز آچکا ہوں۔ ان دنوں سیاسی پارٹیوں کے نت نئے ایجنڈے بن رہے ہیں۔ کسی سیاسی پارٹی کے ایجنڈے میں میرے لئے ایک واجبی سے مکان کی تعمیر کا مسئلہ بھی شامل کروادو" ہم نے کہا "میاں! ہوش کے ناخن لو۔ تم نے ایجنڈے کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ ایجنڈا عمارتوں کو گرانے کے لئے بنتا ہے۔ عمارتوں کو تعمیر کرنے کے لیئے نہیں۔ بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ شکر کرو کہ تمہارا کوئی گھر نہیں ہے۔ زندگی کے ساٹھ برس تو تم نے ذاتی گھر کے بغیر گزار دیئے۔ کچھ برس اور صبر کر لو تو جنت کے کسی گوشہ میں تمہارے لیے کوئی نہ کوئی جگہ تو مل ہی جائے گی۔ زندگی میں تم نے جو کچھ مصائب جھیلے ہیں اس کا اجر تو تمہیں کہیں نہ کہیں ملے گا ہی۔ پھر کسی کا ذاتی گھر ہو تو یہ اچھی بات بھی نہیں ہے۔ کل کے دن کسی نے اسے گرادیا تو۔ بہتر یہی ہے کہ اس دنیا سے اس طرح جاؤ جیسے سکندر گیا تھا یعنی دونوں ہاتھ خالی۔ ہمارے خستہ حال دوست ہماری بات سے مطمئن ہو کر چلے گئے۔ اس لیئے کہ آدمی سمجھدار ہیں اور ساٹھ برسوں کی کٹھن زندگی گزارنے کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں۔ آدمی کے پاس بھلے ہی ذاتی مکان نہ ہو زندگی گزارنے کا ذاتی تجربہ ہو تو تب بھی زندگی آرام سے گزر جاتی ہے۔ غالب نے ایسی ہی کیفیت سے گذرنے کے بعد کہا تھا۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اب تک تو سیاسی پارٹیاں صرف عمارتوں کو ہی منہدم کررہی ہیں ۔ ہمیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ سارے ملک کو ہی توڑ پھوڑ کر نہ رکھ دیں ۔

مشکل یہ ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے ایجنڈے میں عام آدمی کے ایجنڈے کو شامل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ۔ غریبی کو ہٹانے کے ایجنڈے پر برسوں سے عمل ہورہا ہے اور ماشاء اللہ اب تک کئی غریب اس ملک سے ہٹائے جاچکے ہیں ۔ بات بھی صحیح ہے ۔ اگر اس دُنیا سے غریبوں کو ہی ہٹادیا جائے تو غربت اپنے آپ ہی ہٹ جائے گی ۔ کل ہماری ملاقات ملک کے ایک اہم اور سینیئر سیاسی رہنما سے ہوئی تھی ۔ باتوں باتوں میں امریکہ کے صدر بل کلنٹن کا ذکر آگیا ۔ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے " توبہ ! توبہ ! ذرا صدر امریکہ کی حالت تو دیکھو ۔ ان کے کیسے کیسے گھناؤنے جنسی اسکنڈل سامنے آرہے ہیں ۔ تم تو ہمیشہ ہمارے خلاف رہتے ہو ۔ مانا کہ ہمارے پاس چارہ گھٹالہ ہے ۔ جین حوالہ اسکنڈل ہے ، بوفورس کا اسکینڈل بھی ہمارے ایجنڈے کا حصہ بن گیا ہے ۔ لیکن ہمارے ہاں کم از کم جنسی اسکینڈل تو نہیں ہیں ۔ ہمارا ملک ایسے گھناؤنے اسکینڈلوں سے تو پاک ہے " ۔ بار بار اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے جاتے تھے اور اپنے منہ سے چھی ، چھی ، چھی ۔ کی آوازیں نکالتے جاتے تھے ۔ کہنے لگے " ہمارے اسکینڈلوں میں تو کئی لوگ شامل ہوتے ہیں ۔ جو بھی اسکینڈل کرتے ہیں سب سے ساز باز کرنے کے بعد ہی کرتے ہیں ۔ اسکینڈلوں میں بھی ہم اپنی تہذیب کا خیال رکھتے ہیں کہ جو بھی کھاؤ مل بانٹ کر کھاؤ ۔ جب کہ بل کلنٹن کے جنسی اسکینڈلس میں دوشیزائیں تو کئی شامل ہیں لیکن ان اسکینڈلوں کا فائدہ اٹھانے والے صرف وہ اکیلے ہیں ۔ خود غرضی کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ کیا تم نے ان دوشیزاؤں کی تصویریں دیکھی ہیں جن سے بل کلنٹن کے اسکینڈلس وابستہ رہے ہیں ۔ ؟ نہیں دیکھی ہیں تو میرے گھر آکر دیکھ جاؤ ۔ میں نے تم جیسوں کی سہولت کے لئے سب کی تصویریں کاٹ کر الگ سے نکال رکھی ہیں " اتنا کہنے کے بعد ان کے منہ سے رال سی ٹپکنے لگی ۔

ہم نے کہا " بل کلنٹن کے جنسی اسکینڈلوں کے تو ہم بھی خلاف ہیں ۔ یہ

اور بات ہے کہ اتنا " چھی چھی چھی " نہیں کرتے جتنا کہ آپ کر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی مانتے ہیں کہ کم از کم ہمارے سینیئر سیاسی رہنما ایسے اسکینڈلوں میں ملوث نہیں ہیں کیونکہ ہمارے اکثر رہنما جنھیں اصولاً قبروں میں پاؤں لٹکا کر بیٹھے رہنا چاہیے وہ اقتدار کی کرسیوں پر پاؤں لٹکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ انہیں اپنے اقتدار کو بچائے رکھنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تو جنسی اسکینڈلوں کی طرف کیا دھیان دیں گے ۔ پھر ایسے اسکینڈلوں میں ملوث ہونے کے لئے آدمی میں بعض ضروری صلاحیتیں اور اہلیتیں درکار ہوتی ہیں جو ہمارے سینیئر سیاسی رہنماؤں میں پائی نہیں جاتی ہیں"۔ بس ہماری اتنی سی بات پر بپھر گئے اور ہمارے کردار پر اوچھے حملے کرنے لگے کہ تم بھی بل کلنٹن کے ہم نوا اور ہم مشرب معلوم ہوتے ہو ۔ لگتا ہے کسی زمانہ میں تمہارے ایجنڈے میں بھی بعض دوشیزائیں شامل رہی ہوں ۔

اب ہم انہیں کیا جواب دیتے ۔ انہیں کیسے سمجھاتے کہ ہر آدمی کے پاس ایسا چھوٹا موٹا ایجنڈا ضرور ہوتا ہے ۔ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے ۔ تیس چالیس برس پہلے اس معاملہ میں ہمارا بھی ایک شریفانہ ایجنڈا رہا ہے جو اتنا شریف اور پاک ایجنڈا تھا کہ اس میں شامل دو ایک دوشیزاؤں کو کبھی پتہ ہی نہ چل سکا کہ وہ ہمارے ایجنڈے میں شامل رہی ہیں ۔ اس لئے کہ اس ایجنڈے سے وابستہ ہمارے کئی اور ذیلی ایجنڈے بھی ہوا کرتے تھے ۔ جن میں ہم کئی کام انجام دیا کرتے تھے ۔ ایک ایجنڈے میں آہیں بھرتے تھے ۔ دوسرا ایجنڈا معشوق کی یاد میں رات کو تارے گننے کا ہوتا تھا (بلا مبالغہ ان دنوں ایک ہی نشست میں تین چار ہزار تارے تو ضرور گن لیتے تھے) ۔ تیسرے ایجنڈے میں بادصبا سے باتیں ہوتی تھیں ۔ اس سے کہا جاتا تھا کہ وہ ہمارے پیغام لے کر معشوق تک جائے ۔ بادصبا کی عدم کارکردگی سے مایوس ہو جاتے تھے تو ہمارے پاس ایک اور ایجنڈا تھا جس میں ہم نے بلبل ، پپیہے ، کوئل اور حتیٰ کہ کوّوں کو تک پال رکھا تھا جن سے کہا جاتا تھا کہ وہ ہمارے دل کی کیفیت معشوق سے بیان کریں ۔ اب آپ سے کیا چھپائیں (عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ہمارے پاس چھپانے کے لئے اب کچھ رہ ہی نہیں گیا ہے) جن محترمہ کو ہم نے تیس برس پہلے اپنے ایجنڈے

میں شامل رکھا تھا ان سے کچھ عرصہ پہلے ایک بیرونی ملک میں ملاقات ہوئی تو ہم نے مذاق مذاق میں ان پر یہ انکشاف کیا کہ ماضی بعید میں وہ ہمارے ایجنڈے میں شامل رہ چکی ہیں۔ بولیں " سچ ! اس وقت کیوں نہیں بتایا ؟ "۔ ہم نے کہا بتایا تو تھا۔ باد صبا کو کئی بار آپ کے پاس بھیجا۔ ساون کے بادلوں سے بھی گزارش کی کہ آپ کو بتائیں کہ آپ ہمارے ایجنڈے میں شامل ہیں۔ تاروں اور چاند کے علاوہ پرندوں کو بھی قاصد بنایا۔ اب یہ ان کا نکما پن ہے کہ آپ کو بروقت نہیں بتایا"۔ شرما کر بولیں "اب تم سے کیا چھپانا۔ تم بھی کسی زمانہ میں میرے ایجنڈے میں شامل رہے ہو مگر کیا کروں میرے ساتھ بھی بادصبا نے دھوکہ کیا۔ میرے بھیجے ہوئے ساون کے بادل بھی تم پر برسے بنا ہی چلے گئے۔ میں نے جس اچھی سی کوئل کو تم تک پیغام پہنچانے کیلئے کہا تھا۔ اس نے غالباً اس کوئلے سے دوستی کرلی جس کے ذریعہ تم نے میرے لئے اپنا پیغام روانہ کیا تھا اس زمانہ میں پرندوں کے اسکینڈل زیادہ اور انسانوں کے اسکینڈل کم ہوا کرتے تھے"۔

صاحبو ! بات ہم نے سیاسی پارٹیوں کے ایجنڈوں سے شروع کی تھی جو ہمارے بے ضرر سے ایجنڈوں پر آکر ختم ہورہی ہے۔ آپ چاہے کچھ بھی کہیں ہم جیسے ناداروں اور کم سوادوں کے ایجنڈوں میں بس ایسی ہی کچھ بے ضرر اور معصوم سی باتیں ہوتی ہیں لیکن کوئی بھی ہمارے ایجنڈے کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ لہٰذا عام آدمی سے ہماری گزارش ہے کہ نہ صرف روٹی کپڑا اور مکان کو اپنے ایجنڈے میں سے خارج کردے بلکہ ہو سکے تو ایجنڈے کو ہی اپنے ایجنڈے میں سے نکال دے۔ ایجنڈا کوئی اچھی چیز تھوڑا ہی ہے۔ (یکم/فروری ۱۹۹۸ء)

نقش قدم پر کیوں چلیں

ایک رسالہ میں ایک ایسے روشن خیال نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا ہے۔ جو پچھلے کئی برسوں سے یورپ اور امریکہ میں مقیم ہے۔ نوجوان نے اس مراسلہ میں اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں ایک بنیادی سوال یہ اٹھایا ہے کہ برطانیہ میں نئی نسل سے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ چرچل یا ملکہ وکٹوریہ کے نقش قدم پر چلے۔ فرانس میں کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی نے نوجوان نسل کو نپولین یا چارلس ڈیگال کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کی ہو۔ امریکہ میں کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ نوجوانوں کو جارج واشنگٹن یا ابراہام لنکن کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کرے۔ دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ جب بھی کسی گزرے ہوئے رہنما کا یوم پیدائش یا یوم وفات چھٹی کے ساتھ منایا جاتا ہے تو نوجوانوں کو لازماً یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس رہنما کے نقش قدم پر ضرور چلیں۔ چاہے اس رہنما کو گزرے ہوئے کئی سو برس ہی کیوں نہ بیتے ہوں۔ گویا پہلے تو نقش قدم تلاش کریں اور اگر یہ خوش قسمتی سے مل جائیں تو ان پر چلنے لگیں۔ مراسلہ نگار کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی نوجوان نسل کے ساتھ یہ سراسر زیادتی ہے۔ نوجوان نسل جدھر جانا چاہتی ہے اسے جانے دیں۔ خواہ مخواہ اسے الٹے سیدھے راستے دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر نسل اپنا راستہ آپ بناتی ہے۔

مراسلہ نگار کا کہنا اپنی جگہ بالکل درست ہے اور اسکی شکایت بھی بجا ہے۔ بلاشبہ یورپ اور امریکہ میں نوجوانوں سے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مغربی ممالک میں صفائی کا انتظام بہت اچھا ہوتا ہے اور وہاں کی میونسپل کمیٹیاں اپنے ذمہ کا کام بحسن وخوبی انجام دیتی ہیں۔ وہاں پر بزرگوں کے نقش قدم کو تلاش کرنا بہت مشکل

ہوتا ہے ۔ جبکہ ہمارے ہاں بزرگوں کے نقش قدم کو بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھنے کی برسوں پرانی روایت موجود ہے ۔چنانچہ راستوں پر کوڑے کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور ان کے نیچے بزرگوں کے نقش قدم بھی محفوظ رہتے ہیں۔ آپ حیرت کریں گے کہ پچھلے دنوں پورے پندرہ برسوں بعد ہمیں اپنے آبائی قصبہ میں جانے کا موقع ملا تھا اور ہمیں خود اپنے پندرہ برس پرانے نقش قدم بھی محفوظ مل گئے تھے ۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے خود اپنے نقش قدم پر چلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ بڑھتی ہوئی عمر نے ہمارے راستے بدل دیئے تھے اور ہماری منزل بھی تبدیل ہوگئی تھی ۔ جب ہم خود اپنے نقش قدم پر نہیں چل سکے تو لوگوں کے نقش قدم پر کیسے چل سکتے ہیں ۔مراسلہ نگار کو اس ضمن میں بلا وجہ غم وغصہ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے ۔ اگر کوئی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کو کہتا ہے تو ایسی باتیں سن کر خاموش ہو جانا چاہیے یہ کوئی ضروری تھوڑا ہی ہے کہ آپ بزرگوں کے نقش قدم پر ضرور چلیں ۔ ہمارے ہاں بہت سی باتیں رسماً بھی کہی جاتی ہیں اور ان کے کہنے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ۔ دن میں اگر دس دوست راستے میں ہمیں مل جاتے ہیں تو ہم ان کی خیریت ضرور پوچھ لیتے ہیں۔ دوست اگر خیریت سے نہ ہوں تو تب بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ خیریت سے ہیں ۔ اگر خدا نخواستہ کوئی دوست غلطی سے کہہ دیتا ہے کہ وہ خیریت سے نہیں ہے اور پچھلے کئی دنوں سے اسے بخار آرہا ہے اور کھانسی بھی رہنے لگی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ اپنے سارے کام چھوڑ کر دوست کو اپنے ساتھ اسپتال لے جائیں اور جب تک وہ پوری طرح صحت مند نہ ہو جائے تب تک اس کے ساتھ رہیں اور اس کی دیکھ بھال کریں ۔ اگر خدانخواستہ ایسی صورتحال پیدا ہو جائے تو ہم بھی اپنے لئے ایک اچھی سی بیماری کا انتخاب کر لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہی بیماری اختیار کرلیتے ہیں جس میں ہمارا دوست مبتلا ہوتا ہے اور اس طرح ہماری گلو خلاصی ہو جاتی ہے ۔ یوں لگتا ہے کہ مراسلہ نگار مغرب میں رہنے کے بعد ہمارے معاشرے کی روایات سے بے بہرہ ہوگیا ہے ۔ یاد آتا ہے کہ بچپن میں ہمارے استاد نے ہمیں تلقین کی تھی کہ ہم ہمیشہ سچ بولیں ۔

چاہے ہمیں کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے ۔ اس ضمن میں انہوں نے سقراط کا حوالہ بھی دیا تھا کہ کس طرح سقراط نے سچائی کی خاطر خوشی خوشی زہر کا پیالہ پی لیا تھا۔ پھر ہمیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ہم سقراط کے نقش قدم پر چلیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں زہر کا پیالہ پی لینے کے خیال سے ہم خوفزدہ سے ہوگئے اور ہم نے معصومیت میں اپنے استاد سے پوچھ لیا تھا " صاحب کیا آپ ہمیں اس شخص کے نقش قدم کی نشاندہی نہیں کر سکتے جس نے سقراط کو زہر کا پیالہ دیا تھا تاکہ ہم فی الحال اسی کے نقش قدم پر چلیں ۔ ہم نے تو ابھی دنیا بھی نہیں دیکھی ہے ۔ ابھی سے زہر کا پیالہ پی لیں تو دنیا کو کیسے دیکھیں گے ۔ امتحان میں فیل کیسے ہونگے ۔ بیروزگاری کے مزے کیسے لوٹیں گے وغیرہ وغیرہ۔ آپ سقراط کی بات کرتے ہیں ہمیں تو ہر بڑے آدمی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے زہر کے پیالے اور بندوق کی گولی کا خیال آتا ہے ۔

مراسلہ نگار کو اصل میں یہ خوش فہمی ہے کہ ہماری نوجوان نسل کو جب کہا جاتا ہے کہ وہ بزرگوں کے نقش قدم پر چلے تو وہ فوراً چلنا شروع کردیتی ہے ۔ بات ایسی نہیں ہے ۔ ہمارے موجودہ رہنما تک جب بزرگوں کے نقش قدم پر نہیں چلتے تو نئی نسل کہاں سے چلے گی ۔ پھر مغرب کی نوجوان نسل کو بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین اس لئے نہیں کی جاتی کہ مغرب کے اکثر رہنما موٹروں میں سفر کرتے ہیں ۔ ہمارے رہنماؤں کی طرح " پدیاترا " نہیں کرتے۔ سرونسٹن چرچل کے نقش قدم بھی اگر آپ ڈھونڈ نا چاہیں تو یہ نقش قدم ان کے گھر اور انکے دفتر نمبر 10، ڈاوننگ اسٹریٹ کے آس پاس ہی مل سکتے ہیں ۔ ان پر کوئی چلے تو آخر کب تک چلے اور کہاں تک چلے ۔ خوب یاد آیا کہ اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار آنجہانی کرشن چندر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہمیشہ ٹیکسیوں میں سفر کرتے تھے ۔ بہت پاس میں بھی جانا ہوتا تو فوراً فون کر کے ٹیکسی منگوا لیتے تھے ۔ سنا ہے کہ ایک بار انھوں نے اپنے بیڈروم سے باتھ روم تک جانے کا ارادہ کیا تو بے خیالی میں فوراً ٹیکسی منگوالی ۔ کرشن چندر ہمارے محبوب افسانہ نگار تو تھے ہی ہمارے کرم فرما بھی

تھے۔ ہم ان کے نقش قدم پر چلنا تو چاہتے ہیں لیکن ہمیں یہ نقش قدم کیسے ملیں گے۔

بات دراصل یہ ہے کہ نقش قدم کا تصور پرانے زمانے کے ان سچے رہنماؤں کی دین ہے۔ جو جب چلتے تھے تو ان کے پیچھے عوام بھی چلتے تھے۔ ایسے رہنماؤں پر کبھی رہزنوں کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ عوام ان کی رہنمائی میں چپ چاپ چلتے ہی چلے جاتے تھے۔ اور اکثر صورتوں میں منزل پر بھی پہنچ جاتے تھے۔ پرانے زمانے کے رہنما سچ مچ قیادت کرتے تھے۔ اس لئے لوگوں کو ان کے نقش قدم کی ضرورت بھی پیش آتی تھی۔ جب کہ آج کا رہنما اپنا کوئی نقش قدم چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اسے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ عوام اس کے نقش قدم ڈھونڈتے ڈھونڈتے کہیں خود اس تک نہ پہنچ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام آج کے رہنما کے پیچھے چلتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ رہنما کی قیادت میں چل نہیں رہے ہیں بلکہ رہنما کا تعاقب کر رہے ہیں۔ کسی کا تعاقب کرنا اور کسی کی قیادت میں پیچھے چلنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ آپ نے اس لیڈی اسٹینو گرافر کا قصہ تو سنا ہوگا جو ایک دن دیر سے دفتر آئی تو اس کے عہدیدار نے دیر سے دفتر آنے کا سبب پوچھا۔ اس پر لڑکی نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا "سر! میں دیر سے دفتر آنے پر مجبور ہوگئی تھی کیونکہ آج جو نوجوان میرا تعاقب کر رہا تھا وہ بہت آہستہ چل رہا تھا۔ نتیجہ میں مجھے بھی آہستہ چلنا پڑا"۔ دیکھا جائے تو قیادت کا یہ ایک نیا زاویہ ہے۔ ماضی میں بھی اکثر یہ ہوتا تھا کہ قوم بہت زیادہ نکمی اور ناکارہ ہوتی تھی تو رہنما کو قدم قدم پر رک جانا پڑتا تھا اور قوم کو للکارنا پڑتا تھا۔ تب کہیں قوم رہنما کے پیچھے چل پڑتی تھی۔ جب کہ آج کا رہنما قوم کے انتظار میں رکنے کو ضروری نہیں جانتا۔ وہ تو دو چار برس کے اندر ہی اپنی "رہنمائی" کے جوہر دکھا کر اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اسے بعض اوقات عدالتوں کے چکر ضرور لگانے پڑتے ہیں اور اکثر صورتوں میں وہ رہنمائی سے باعزت بری بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے رہنما کے اگر نقش قدم ہوتے بھی ہیں تو وہ انہیں زمین پر نہیں چھوڑتا۔ پرانے زمانے کے رہنماؤں کے نقش قدم ضرور ہوتے تھے لیکن

آج کسی کو ایسے نقش قدم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے ایسے رہنماؤں کو سال میں دو ایک مرتبہ یاد کرلیتے ہیں اور اس کام کے لئے اس دن سرکاری چھٹی بھی دی جاتی ہے۔ پھر بھی لوگ انھیں یاد کرنے کی بجائے "پکنک" منانے کو ضروری گردانتے ہیں۔

آخر میں نوجوان مراسلہ نگار سے ہماری عرض یہ ہے کہ وہ رہنماؤں کے نقش قدم پر چلنے کے چکّر میں نہ پڑے۔ وہ جب ان نقش قدم کو چھوڑ کر مغربی ملکوں میں چلاگیا تھا تو اب اسے ان کی فکر کیوں لاحق ہورہی ہے۔ اگر کسی وجہ سے اسے یہ خوش فہمی یا غلط فہمی ہے کہ ہماری نوجوان نسل اپنے رہنماؤں کے نقش قدم پر چل رہی ہے تو وہ اسے دور کرلے۔ اس ملک میں اب کون کدھر کو جارہا ہے اس کا اندازہ نہ رہنما کو ہے اور نہ ہی عوام کو ہے۔ نہ پرانی نسل کو ہے اور نہ نئی نسل کو۔

(۱۰/ مئی ۱۹۹۸ء)

ایک چیف منسٹر کی سبق آموز زندگی

خبر آئی ہے کہ بہار کے اسکولوں میں آٹھویں جماعت میں جو نصابی کتاب پڑھائی جارہی ہے ، اس میں بہار کے چیف منسٹر لالو پرساد یادو کی زندگی پر مبنی ایک سبق شامل ہے جس میں بچّوں کو اپنی ریاست کے چیف منسٹر کے کارناموں سے واقف کرایا گیا ہے ۔ اپوزیشن والے اس پر کہاں خاموش رہنے والے تھے ۔ سو انہوں نے اعتراض کیا ۔ اس کے جواب میں بہار کے وزیر تعلیم نے وضاحت پیش کی کہ لالو پرساد یادو کی زندگی چونکہ خود سبق آموز ہے اسی لئے اس سبق کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے ۔ لالو پرساد یادو ایک غریب گھرانہ میں پیدا ہوئے اور اپنی محنت سے ترقی کرتے کرتے وہ چیف منسٹر کے عہدہ تک پہنچ گئے ۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ عام آدمی بھی اگر چاہے تو وہ " راجہ " بن سکتا ہے ۔

لالو پرساد کی زندگی پر مبنی " سبق " کی ایک نصابی کتاب میں شمولیت پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ شخصی طور پر ہم لالو پرساد جی کے مداحوں میں سے ہیں اور وہ بلا شبہ ایک اچھے چیف منسٹر ہیں لیکن جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح ہماری ریاستوں کے چیف منسٹر بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے ۔ اب اگر ہر ریاست کے چیف منسٹر کی زندگی پر مبنی اسباق کو نصابی کتابوں میں شامل کیا جائے تو صورتحال نہایت بھیانک ہوجائے گی ۔ ہم نے ایک خیالی چیف منسٹر کو ذہن میں رکھ کر نصابی کتب کے لئے ایک مثالی سبق تیار کیا ہے ۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

" بچو ! آج ہم جو سبق پڑھنے جارہے ہیں وہ ہماری ریاست کے ہر دلعزیز رہنما ، عوام کے ہمدرد ، غریبوں کے مسیحا ، سرمایہ داروں کے سرپرست ، اسمگلروں

اور تاجروں کے ہی خواہ یعنی ہمارے چیف منسٹر کے بارے میں ہے۔ لہذا باادب باملاحظہ ہوشیار۔ اپنی جیب پاکٹ سے خبردار۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ کوئی بچہ اپنی نشست سے اٹھ کر کلاس سے باہر نہ جانے پائے۔ سبق کے ختم ہونے تک شریر بچے اپنی شرارتوں کو قابو میں رکھیں کیونکہ کلاس روم کے باہر پولیس تعینات ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسکول کی چھٹی کے بعد انہیں اپنے گھر جانے کی بجائے پولیس تھانہ میں جانے کی ضرورت پیش آجائے۔ اکبر اعظم، اشوک اعظم اور سکندر اعظم کے بارے میں جب سبق پڑھائے جائیں تو تب شرارت کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں کیونکہ یہ حکمران کب کے مرچکے ہیں اور اقتدار کی کرسی پر براجمان نہیں ہیں۔ یاد رکھو آج ہم جس ہستی کے بارے میں سبق پڑھنے جارہے ہیں وہ ہمارے موجودہ حکمران ہیں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں جو کسی بھی گردن اور کسی بھی جیب تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر جگہ ان کی خفیہ پولیس پھیلی ہوئی ہے۔ لہذا اب دھیان سے سبق سنو۔!

بچو! ہمارے ہر دلعزیز چیف منسٹر کا جنم ایک غریب گھرانہ میں ہوا۔ یہ گھرانہ اتنا غریب تھا کہ یہاں کوئی بھی سمجھدار بچہ پیدا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہمارے چیف منسٹر کو بچپن ہی سے نئے نئے چیلنج کو قبول کرنے میں مزہ آتا تھا۔ لہذا انہوں نے ایک چیلنج کے طور پر ہی اس غریب گھرانہ میں پیدا ہونے کا فیصلہ کرلیا ورنہ وہ چاہتے تو کسی کھاتے پیتے گھرانہ میں بھی پیدا ہوسکتے تھے۔ ہونہار بروا کے پات چکنے چکنے تو ہوتے ہی ہیں۔ لیکن ان کے پات اتنے چکنے تھے کہ ان پر سے ہر بات پھسل جاتی تھی۔ ابھی ان کی عمر 11 سال ہی کی تھی کہ ایک جیوتشی نے ان کا ہاتھ دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھ کی لکیروں میں تو جیوتشی کو بظاہر کچھ بھی نظر نہیں آیا البتہ ان کا ہاتھ دیکھنے کے بعد بیچارے جیوتشی کے سیدھے ہاتھ کی انگلی میں سے ایک انگوٹھی غائب ہوگئی تھی۔ لاکھ تلاش کیا لیکن انگوٹھی نہیں ملی۔ اسی بناء پر جیوتشی نے پیش گوئی کردی تھی کہ یہ بچہ بڑا ہوکر بڑا آدمی بنے گا۔ ان کے ماں باپ نے بڑے آدمی کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ یہ بچہ ضرور کسی دفتر میں کلرک لگ جائے گا (اس زمانہ میں بڑا آدمی بننے کی معراج یہی ہوتی تھی) ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ان کا

بچہ بڑا ہو کر اتنا بڑا آدمی بن جائے گا کہ بڑے بڑے آدمی اس کے سامنے پانی بھرنے لگ جائیں گے۔ شروع میں ان کے ماں باپ نے اپنا پیٹ کاٹ کر انہیں تعلیم دلائی۔ لیکن خود دار اتنے تھے کہ پانچویں جماعت کے بعد اپنے ماں باپ کو اپنا پیٹ کاٹنے سے یکسر منع کر دیا کیونکہ اسکول میں ان کا رعب و دبدبہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسکول کے پرنسپل نے ان سے گھبرا کر ان کی فیس معاف کر دی۔ نصابی کتابوں کا مسئلہ یوں حل ہو جاتا تھا کہ کسی بھی ساتھی طالب علم کی کتاب اٹھا کر اپنے بستے میں رکھ لیتے تھے۔ طلباء میں وہ اتنے مقبول اور ہر دلعزیز تھے کہ کوئی بھی طالب علم ان کی اس حرکت پر اعتراض نہ کرتا تھا بلکہ بعض طلباء تو ایسے بھی تھے جو انھیں دیکھتے ہی احتراماً اپنے بستے چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ چھٹی جماعت میں اگرچہ ان کی مونچھیں نہیں نکل آئی تھیں لیکن پھر بھی اپنی خیالی مونچھوں پر فرضی تاؤ دیا کرتے تھے۔ ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے وہ ریاست کے ممتاز اسٹوڈنٹ لیڈر بن گئے تھے۔ جب جی چاہتا ہڑتالیں اور مظاہرے کروا دیتے تھے۔ قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ وہ طلباء کی خدمت کرنے کے بجائے اب سماج اور ملک کی خدمت کریں۔ چنانچہ ہائی اسکول میں ہی تعلیم کو خیرباد کہا اور اپنے مخصوص ساتھیوں کو لے کر سیاست کے میدان میں کچھ اس طرح کود پڑے کہ سیاست کا میدان لرز گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کیونکہ ان کی نظریں تو چیف منسٹر کی کرسی پر لگی ہوئی تھیں۔ پلٹ کر دیکھنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے۔ سماج کے دو گروہوں میں کبھی کوئی اختلاف پیدا ہو جاتا تھا تو وہ ان کے بیچ کچھ اس ڈھنگ سے مصالحت کے فرائض انجام دیتے تھے کہ گروہوں کے اختلافات تو مزید بڑھ جاتے تھے لیکن دونوں گروہوں میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس سے ان کے سیاسی تدبر اور مدبرانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب وہ اسمبلی میں رکن بن کر داخل ہوئے تو اسمبلی کے سب سے کم عمر رکن تھے۔ تیس برس ہونے کو آئے تب سے اب تک وہ اسمبلی میں موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان تیس برسوں میں وہ سولہ پارٹیاں بدل چکے ہیں۔ تم پوچھو گے کہ ریاست میں پندرہ

پارٹیاں کہاں ہیں ۔ تمہیں ایسے ذہین سوال ضرور پوچھنے چاہیں ۔اس قصہ یہ ہے کہ وہ ایک ہی پارٹی سے آٹھ مرتبہ نکلے اور آٹھ مرتبہ واپس بھی آئے ۔ اس پارٹی سے ان کی اٹوٹ وفاداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہئے ۔ چنانچہ اسی پارٹی نے انہیں چیف منسٹر بھی بنایا ۔ ایک بار وہ چیف منسٹر بن گئے تو پھر چیف منسٹری کی کرسی پر یوں چپک کر بیٹھ گئے کہ بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتا کہ چیف منسٹر کہاں سے شروع ہورہے ہیں اور چیف منسٹر کی کرسی کہاں پر ختم ہو رہی ہے ۔ غرض دونوں ایک قلب دوجان ہوگئے ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہیں چیف منسٹر کی کرسی پر بیٹھنے کا گر آتا ہے ۔ ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہیں ہر رکن اسمبلی کے دام کا صحیح صحیح اندازہ ہے ۔ چنانچہ جب بھی ارکان اسمبلی کو خریدنے کی نوبت آتی ہے بالکل صحیح دام پیش کرتے ہیں ۔ ایک روپیہ کم اور نہ ایک روپیہ زیادہ ۔ بھاؤ تاؤ اور مول تول کے وہ قائل نہیں ہیں ۔ تجارت کا یہ گر بڑے بڑے بیوپاریوں کو بھی نہیں آتا ۔

ان کی رہنمائی میں ہماری ریاست نے کتنی ترقی کی ہے اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو جائے گا کہ ہمارے چیف منسٹر جس گھرانہ میں پیدا ہوئے تھے وہ اس ریاست کا غریب ترین گھرانہ تھا لیکن آج یہ ریاست کا سب سے مالدار گھرانہ ہے ۔ اسی لئے تو عوام انہیں غریبوں کا ہمدرد کہتے ہیں ۔

بچو! ہمارے چیف منسٹر اس ملک کے ان رہنماؤں میں سے ہیں جن کے کارنامے ان کے چیف منسٹر برقرار رہنے تک سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے ۔ یوں تو ہمارے چیف منسٹر کے اور بھی کئی کارنامے ہیں لیکن فی الحال اتنے ہی کارناموں کا بیان کافی ہے ۔ بچوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ تھوڑا لکھے کو کس طرح بہت جانا جاسکتا ہے ۔ اگلے انتخابات میں اگر یہ پھر چیف منسٹر بن گئے تو ہم زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کے کارنامے بیان کریں گے بلکہ ہوسکے تو الگ سے ایک کتاب ان کے بارے میں لکھیں گے ۔

(۱۹۹۰ء)

منسٹر کے بیٹے نے رشوت دی

یہ لطیفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ مرکزی وزیر توانائی مسٹر این کے پی سالوے کے فرزند نے دہلی کے محکمہ بجلی کے ملازمین سے اپنا کوئی چھوٹا سا کام کروانے کیلئے چار سو روپیوں کی رشوت دی۔ مسٹر سالوے کے فرزند دہلی کے وسنت وہار علاقہ میں رہتے ہیں اور پچھلے کچھ عرصہ سے انکے گھر میں لگے بجلی کے میٹر میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی جسکی وجہ سے بجلی کا بل زیادہ آنے لگا تھا۔ لہذا انہوں نے اپنا میٹر جلد از جلد تبدیل کروانے کی غرض سے محکمہ بجلی کے ملازمین کو چار سو روپیوں کی رشوت دی اور انکا کام بحسن و خوبی پورا ہوگیا۔

ہمارے سماج میں رشوت دینا اور لینا اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔ مسٹر سالولے کے فرزند نے محکمہ بجلی کے ملازمین کو رشوت دی تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کیونکہ ایسے کاموں کیلئے ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور دوسری طرف محکمہ بجلی کے ملازمین نے رشوت لی تو یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن اس معاملہ میں ایک غیر معمولی بات یہ ہوگئی کہ پچھلے ہفتہ مسٹر سالوے کے فرزند نے یونہی باتوں باتوں میں اپنے والد بزرگوار سے اس رشوت کا ذکر کردیا۔ اس پر مسٹر سالوے آگ بگولہ ہوگئے۔ اور اپنے بیٹے سے پوچھا "تم نے انہیں بتایا نہیں کہ تم مرکزی وزیر توانائی کے بیٹے ہو؟" اس پر مسٹر سالوے کے فرزند نے کہا "وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے اور اس لیے انھوں نے آپ کا احترام کرتے ہوئے رشوت کی رقم میں رعایت کردی تھی۔ جہاں انہیں دو ہزار روپئے کی رشوت ملنی چاہیئے تھی وہاں انہوں نے مجھ سے صرف چار سو روپئے وصول کئے۔ اگر میں آپکا بیٹا نہ ہوتا تو مجھے بھی عام آدمی کی طرح دو ہزار روپئے دینے پڑتے۔ یہ تو محکمہ

بجلی کے ملازمین کی ایمانداری، دیانت داری اور فرض شناسی ہے کہ انھوں نے آپ کا اس درجہ کا احترام کیا کہ مجھ سے رشوت کی رقم بھی کم لی اور کام بھی فوراً کر دیا۔
ہمیں مسٹر سالوے کے فرزند سے شکایت ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ ہی اس رشوت کا ذکر سالوے صاحب سے کر دیا۔ دن بھر میں آپ سینکڑوں کام کرتے ہیں اور ایسے کاموں کی اطلاع آپ اپنے والد بزرگوار کو تھوڑی دیتے ہیں۔ ہماری ہی مثال لیجئے کہ ہم ہر روز صبح اٹھتے ہی دانتوں کو برش کرتے ہیں اور بالوں میں کنگھا کرتے ہیں۔ پھر چائے بھی پیتے ہیں لیکن ہم نے آج تک ازراہ سعادت مندی ان کاموں کی اطلاع اپنے والد کو نہیں دی۔ ایسے کام معمولات زندگی کہلاتے ہیں۔ بفضلِ تعالیٰ رشوت دینے اور لینے کا عمل بھی اب ایسا ہی ہے جیسے آپ نے دانتوں کو برش کرلیا یا بالوں میں کنگھی کرلی۔ ایسے کام "خبر" نہیں بن سکتے کہ ان سے ہر کس و ناکس کو واقف کرایا جائے۔ ہمیں احساس ہے کہ مرکزی وزیر توانائی مسٹر این کے پی سالوے کو اس بات سے یقیناً دکھ پہنچا ہوگا کہ انکے بیٹے نے رشوت دی۔ عام آدمی رشوت دے تو کوئی بات نہیں لیکن ایک وزیر اور وہ بھی محکمہ توانائی کے وزیر کے بیٹے کو نہیں دینی چاہیے۔ تاہم اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بجلی کا محکمہ صرف برقی توانائی سے نہیں چلتا بلکہ اس میں "توانائی" پیسے اور رشوت سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک کسی کا ہاتھ گرم نہ کیجئے تب تک بجلی نہیں جل پاتی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ ان دنوں جو ملازم رشوت نہیں لیتا اسکی دماغی صحت کے بارے میں شبہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے دوست حمایت اللہ اکثر ایک لطیفہ سناتے ہیں کہ ایک صاحب کی دو بیٹیاں تھیں اور انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں دھوم دھام سے کیں۔ ایک دن ان کے ایک دوست نے ان کی دونوں بیٹیوں کا حال چال پوچھا کہ کیسی ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اس پر ان صاحب نے کہا "بڑی بیٹی تو بہت مزے میں ہے۔ سونے سے لدی ہوئی ہے۔ گھر پر گاڑی ہے۔ غرض اللہ کا دیا سب کچھ ہے البتہ دوسری بیٹی کا حال بہت خراب ہے۔ بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی ہے" دوست نے پوچھا "تمہارے دونوں داماد کیا کرتے ہیں۔؟" ان صاحب نے کہا اتفاق سے دونوں داماد انکم ٹیکس کے انسپکٹر ہیں۔ دوست نے کہا "یہ کوئی

بات ہوئی کہ دونوں داماد انکم ٹیکس کے انسپکٹر ہیں اور ان میں سے ایک کی حالت اچھی ہے اور دوسرے کی حالت خراب۔" ان صاحب نے کہا" بات دراصل یہ ہے کہ ایک داماد رشوت لیتا ہے اور دوسرا داماد رشوت نہیں لیتا" اس پر دوست نے کہا" میاں اس میں قصور تمہارا ہی ہے۔ شادی سے پہلے تمہیں اچھی طرح تحقیق کر لینی چاہیے تھی کہ دونوں داماد رشوت لیتے ہیں یا نہیں۔ جب ایک داماد رشوت نہیں لیتا تو تم نے اس سے اپنی بیٹی کا رشتہ پکا ہی کیوں کیا تھا"

جب رشوت ہمارے سماج کا لازمی حصہ بن جائے تو اسے لعنت کے طور پر نہیں بلکہ ایک نعمت کے طور پر قبول کر لینا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں بچہ بچہ تک رشوت لینے اور دینے میں یقین کرنے لگا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا بچہ نہایت خوبصورت اور ذہین ہے۔ ایک دن اسکی ذہانت سے متاثر ہو کر ہم نے اسے پیار کرنا چاہا تو اس نے ہمیں پیار کرنے سے منع کر دیا۔ ہم نے اسے لالچ دینے کی خاطر کہا" اگر تم ہمیں پیار کرنے دو تو ہم تمہیں دو روپے دیں گے۔" اس پر بچہ نے مزید ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا" معاف کیجیے۔ میں صرف ارنڈی کا تیل پینے کے دو روپے ڈیڈی سے لیتا ہوں۔ آپ مجھے پیار کریں تو اس کا معاوضہ کم سے کم دس روپے تو ہونا ہی چاہیے۔"

ذرا غور فرمائیے کہ جب ایک بچہ نے تک رشوت لینے کے نرخ مقرر کر رکھے ہیں تو پھر سرکاری ملازمین تو سرکاری ملازمین ہیں۔ انکے نرخ تو یقیناً زیادہ ہونگے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک ریاست میں برسوں تک ایک سیاسی پارٹی برسر اقتدار رہی لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ انتخابات میں اسکو شکست ہوگئی۔ دوسری پارٹی کی سرکار بنی اور اس نے جیسے تیسے اپنی پانچ سالہ معیاد پوری کرلی۔ لیکن جب پھر عام انتخابات ہوئے تو پہلی پارٹی کو پھر سے اقتدار حاصل ہوگیا۔ ہم نے ایک تاجر سے دوسری پارٹی کے ہارجانے اور پہلی پارٹی کے پھر سے اقتدار پر آجانے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا" حضور! پہلی پارٹی برسوں اس ریاست میں برسر اقتدار رہی اور اسکے دور میں ہر کام کروانے کے لیے رشوت کے نرخ مقرر ہوگئے تھے۔ کوئی ایجنسی لینی ہو تو اسکا اتنا نرخ تھا۔ شراب کے ٹھیکے کا یہ نرخ تھا۔ گیس کی ایجنسی

سستے روپیوں میں مل جاتی تھی۔ فلاں کام کا یہ ریٹ ہے۔ دوسری پارٹی کی جو سرکار بنی تو ایک عرصہ تک ہمیں یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ سرکار رشوت لیتی بھی ہے یا نہیں۔ پھر جب رشوت کا سلسلہ شروع ہوا تو اسکے نرخ میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ ہم تو تاجر آدمی ہیں۔ کام سے مطلب رکھتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اس غیر یقینی صورتحال سے بہتر تو یہی ہے کہ پرانی سرکار کو ہی دوبارہ برسر اقتدار لایا جائے تاکہ رشوت کے نرخ میں کوئی گھپلا نہ ہو۔"

جب ساری قوم کا مزاج ہی رشوت لینے اور دینے کے خمیر سے اٹھا ہو تو ایسے میں ایسی شکایتیں کرنے کا کیا فائدہ۔ ایک اور بات یہ عرض کرتے چلیں کہ ہم نے آج تک کسی کو کوئی رشوت نہیں دی اور نہ رشوت لی۔ اس لئے نہیں لی کہ ہم نے ہمیشہ ایسے عہدوں پر کام کیا جہاں رشوت لینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن جہاں ہمیں رشوت دینا چاہئے تھا وہاں بھی ہم انجان ہی بنے رہے۔ نتیجہ میں آج ہم جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں اسے اور تو سب کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن زندگی نہیں کہا جاسکتا۔ یوں بھی ہم جیسوں کے لئے یہ دنیا اب رہنے کے قابل نہیں رہی ہے۔

آخر میں این کے پی سالوے صاحب کے فرزند سے ہماری گزارش یہ ہے کہ مستقبل میں اگر وہ ایسا کوئی کام کریں تو اس کی اطلاع اپنے والد بزرگوار کو نہ دیا کریں۔ سعادتمند اولاد وہی ہوتی ہے جو اپنے والدین کو ذہنی صدموں سے دور رکھے۔ سالوے صاحب توانائی کے وزیر ہیں اور وہ ملک میں توانائی پیدا کرنے کے سو سو جتن کر رہے ہیں۔ ایسی چھوٹی موٹی باتیں ان کے علم میں لاکر ان کی توانائی کو ضائع نہ ہونے دیں۔

(۱۹/ نومبر/ ۱۹۹۵ء)

پچاس برس۔ ملک کے اور اپنے

ملک نے بالآخر اپنی آزادی کے پچاس برس مکمل کر لئے ۔ بڑی دھوم اور گہما گہمی رہی ۔ ہر کس و ناکس نے اس موقعہ پر کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا بلکہ جن کے پاس کوئی خیال تک نہیں تھا انہوں نے بھی اظہار کیا اور ان لوگوں سے بہتر اظہار خیال کیا جن کے پاس واقعی خیال تھا ۔ پرسوں ایک صاحب نے ہم سے کہا کہ میاں جب ہر کوئی آزادی کے بارے میں بول رہا تھا تو تم منہ میں گھنگنیاں ڈالے کیوں خاموش رہے جب کہ تم تو ویسے ہی کسی کے بھی پھٹے میں اپنی ٹانگ اڑانے کے عادی رہے ہو ۔ ان صاحب کا اعتراض بالکل بجا ہے اور اس سلسلہ میں ہماری عرض یہ ہے کہ ہم تو اس وقت اظہار خیال کرنا چاہتے تھے جب ملک واقعی اپنی آزادی کے پچاس برس مکمل کرلے ۔ دراصل ہمارے اندر تشکیک کا مادہ کچھ اتنا زیادہ ہے کہ جب تک کوئی کام مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک ہم اظہار خیال نہیں کرتے ۔ پھر جب سے ہم کرکٹ میچ دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں ہم اس وقت تک کسی کھلاڑی کے نصف سنچری بنانے پر خوش ہو کر تالیاں نہیں بجاتے جب تک وہ 49 رنوں کے بعد سچ مچ پچاس رن نہ بنالے ۔ بسا اوقات ہم نے بعض کھلاڑیوں کو عین 49 ویں رن کے بعد آوٹ ہوتے دیکھا ہے ۔ مانا کہ کرکٹ کے کھلاڑی کی نصف سنچری اور کسی ملک کی نصف صدی میں بڑا فرق ہوتا ہے لیکن ہمارا ملک اپنی آزادی کے پچاسویں برس میں جس دور سے گزر رہا ہے وہاں کسی شہری کا ایک دن بھی خیر و خوبی اور عزت و نیک نامی کے ساتھ گزر جائے تو اس ایک دن کے گزر جانے کو بھی سیلیبریٹ کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ جہاں برسوں کے گزرنے پر اتنی خوشی نہ ہو جتنی کہ ایک دن کے خیر و خوبی کے ساتھ گزر جانے پر ہو وہاں خوشی اور مسرت کے پیمانے ہی بدل جاتے

ہیں۔ پھر وقت تو ایک اضافی شے ہے۔ بعض اوقات آدمی ایک لمحہ میں ایک صدی کی زندگی جی لیتا ہے اور بسا اوقات صدیاں بیت جاتی ہیں لیکن فرد اور قوموں کی زندگی میں وہ لمحہ نہیں آتا جسے آنا چاہئے۔ اسی وجہ سے ہم نے آزادی کی گولڈن جوبلی کے سلسلہ میں چپ سادھ رکھی تھی۔ پھر ملک کی جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں ہم پہلے بھی کہیں عرض کر چکے ہیں کہ جب ملک آزادی کی جدوجہد سے گذر رہا تھا تو اس وقت ہماری عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات والا مقولہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ بخدا اس کم سنی میں بھی ہم میں حب الوطنی اور قوم پرستی کا جذبہ اتنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا (کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ جذبہ اس عمر میں زیادہ بھرا ہوا ہوتا ہے) کہ ملک کی جدوجہد آزادی میں کود پڑنے کو بے تاب رہتے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ ہمارے چھ بڑے بھائی پہلے ہی سے کسی نہ کسی طرح ملک کی جدوجہد آزادی میں حصہ لے رہے تھے۔ والدین نے ہمیں سمجھایا کہ میاں اگر تم بھی جدوجہد آزادی میں حصہ لینے لگے تو گھر کا سودا سلف کون لے آئے گا۔ اگرچہ اس زمانہ میں بجلی اور ٹیلی فون کے بل وغیرہ جمع کرنے کا بکھیڑا تو نہیں تھا لیکن پھر بھی کئی دوسرے ضروری کام ایسے تھے جن کی انجام دہی کے لئے ہمارا گھر پر رہنا ضروری تھا۔ جیسے پانی بھرنا، گیہوں پسوانا، مٹی کا تیل لانا وغیرہ۔ اگر ہم یہ ضروری کام انجام نہ دیتے تو ہمارے چھ بڑے بھائی جدوجہد آزادی میں کس طرح حصہ لیتے اور اگر یہ حصہ نہ لیتے تو ملک کیسے آزاد ہوتا۔ گویا گھریلو کام کاج انجام دیتے ہوئے بھی ہم نے بالواسطہ طور پر اس ملک کی جدوجہد آزادی میں اپنا ہاتھ بٹایا تھا جس پر ہمیں آج بھی فخر ہے۔ دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی عمریں ملک کی آزادی کے وقت ہم سے بھی زیادہ تھیں بلکہ بعض نے تو جدوجہد آزادی میں حصہ بھی لیا تھا لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں کسی اظہار خیال کو اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ کہیں لوگوں کو ان کی اصلی عمریں نہ معلوم ہو جائیں۔ ہمیں اس وقت اپنے ایک مرحوم دوست یاد آگئے جو سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے باوجود نہایت پابندی کے ساتھ اپنی دوسری بیوی سے یہ کہہ کر گھر سے نکلتے تھے کہ وہ دفتر جا رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں ریٹائر ہوئے پانچ چھ برس بیت چکے تھے۔ ایک دن ہم یونہی انکے گھر پہنچے تو ان کی

دوسری بیوی نے بتایا کہ وہ تو دفتر گئے ہوئے ہیں۔ جب ہم نے انکی بیوی کو بتایا کہ انہیں تو ریٹائر ہوئے کئی برس بیت چکے ہیں۔ اب کیسا دفتر اور کہاں کا دفتر تو ہمارے دوست اس بات پر کئی برس تک ہم سے خفا رہے کہ ہم نے جان بوجھ کر ان کی بیوی کے آگے ان کی اصلی عمر کا بھانڈہ پھوڑ دیا تھا۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ ان کی دوسری بیوی اس وقت تک انہیں چالیس پینتالیس برس کا ہی سمجھتی آئی تھیں۔

اس معاملہ میں خواتین کے رویہ سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ ایک محترمہ کو ہم پچھلے ساٹھ برسوں سے جانتے ہیں بلکہ ہمیں یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ 15 اگست 1947ء کو جب ملک آزاد ہوا تھا تو اس دن انہوں نے ہمارے بالوں میں کنگھی کی تھی اور ہمارے کپڑے بھی بدلوائے تھے۔ ان سے ہم نے پرسوں یونہی پوچھ لیا کہ ملک کی آزادی کے وقت ان کے کیا احساسات تھے تو وہ اچانک خفا ہوگئیں اور بولیں "تمہیں شرم نہیں آتی ایسے سوالات کرتے ہوئے۔ ملک جب آزاد ہوا تھا میں اس دنیا میں موجود ہی کہاں تھی کہ آزادی کے بارے میں میرے دل میں جذبات و احساسات پیدا ہوتے۔ تم تو نہایت خطرناک آدمی ہو۔ اچھے بھلے لوگوں کی عمریں بڑھانے پر تلے ہوئے ہو"۔ اس خفگی کے آگے بھلا ہم ان سے اور کیا بحث کرتے کیسے بتاتے کہ 15 اگست 1947ء کی صبح کو انہوں نے ہمارے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ یادش بخیر! اس بات پر ہمیں مسز ساکورادا یاد آگئیں جن سے سترہ برس پہلے ٹوکیو میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہماری مترجم تھیں۔ ہماری انگریزی کو جاپانی میں منتقل کرتی تھیں اور دوسروں کی جاپانی کو انگریزی میں منتقل کر کے ہم تک پہنچا دیتی تھیں۔ جاپانی نہایت عمر چور ہوتے ہیں۔ ان کی عمروں کا پتہ چلانے کے لئے ہم جیسوں کو کئی عمریں چاہئیں۔ اس حسین اور شائستہ خاتون کی رفاقت میں ہم نے ٹوکیو میں پورے پینتیس دن گزارے تھے۔ انتیس تیس برس کی لگتی تھیں۔ پہلے تو ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ موصوفہ غیر شادی شدہ ہیں۔ خیر ایک دن خود ہی بتایا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ اس پر ہم نے ان کی عمر پوچھی تو ہنس کر بولیں "مہذب مرد خواتین کی عمریں نہیں پوچھا کرتے"۔ (پتہ نہیں انہیں یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی تھی کہ ہم مہذب انسان ہیں) چلو مان لیا کہ ہم مہذب آدمی ہیں۔ لیکن اتنے بھی مہذب

نہیں کہ کسی خاتون کی اصلی عمر جاننے کا بیڑہ اٹھالیں تو اس مہم میں ناکام ہو جائیں۔ ایک دن ہم ان کے ہمراہ ٹوکیو کے فیشن ایبل علاقہ گنزہ کی سیر کررہے تھے کہ دوسری جنگ عظیم کا ذکر چھڑ گیا۔ ہماری رگ شرارت پھڑکی تو ہم نے مسز ساکورادا سے اچانک پوچھ لیا " یہ بتایئے دوسری جنگ عظیم میں آپ کہاں تھیں؟ " بے ساختہ بولیں " میں تو یہیں ٹوکیو میں تھی "۔ اتنا کہہ کر وہ اچانک رک گئیں۔ پہلے تو اپنی خمدار ابرووں کو جنبش دی۔ غلافی آنکھوں کو ترچھا کیا اور اپنے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کو سجا کر بولیں "آپ نہایت شریر آدمی ہیں۔ آپ نے اصل میں یہ سوال دوسری جنگ عظیم کے سلسلہ میں نہیں کیا تھا بلکہ اس سوال کے ذریعہ آپ میری عمر جاننا چاہتے تھے۔ پھر بھی آپ نے جس مہذب ڈھنگ سے میری عمر معلوم کی ہے اس سے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہندوستانی بھی جاپانیوں کی طرح ہی بے حد مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں "۔

قارئین کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ ٹوکیو کی آخری شام کو مسز ساکورادا نے ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلایا تو ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان کے گھر میں ان ہی کی عمر کی ان کی ایک نواسی بھی موجود تھی جو ان سے بس دو ایک برس چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر ہم نے ان کی عمر جاننے کی کوشش نہیں کی۔ مسز ساکورادا اب نہ جانے کہاں ہوں۔ وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ پچھلے سترہ برسوں میں تو ان کی عمر اور بھی کم ہو گئی ہوگی۔ اب اگر مسز ساکورادا جیسی خواتین اپنی عمریں چھپاتی ہیں تو انہیں یہ زیب دیتا ہے۔ ہماری خواتین کی طرح نہیں کہ منہ میں تو سارے مصنوعی دانت چمک رہے ہیں اور اوپر سے یہ دعویٰ کہ ملک کی آزادی کے وقت وہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ بہر حال جو قارئین اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم نے اپنی اصلی عمر کو چھپانے کی غرض سے ملک کی آزادی کے بارے میں کوئی اظہار خیال نہیں کیا تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنی غلط فہمی دور کرلیں۔

اصل قصہ یہ ہے کہ ہم ماہ و سال کی گردش کو بالکل ہی دوسری نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ ہو سکتا ہے ملک کو آزادی کے پچاس برس میسر آئے ہوں لیکن جب ہم اپنی جھولی میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو چند بے جان لمحوں کے سوا کچھ

بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ اس ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے ایک ہی گھپلے یا اسکینڈل میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ سارا ملک چار پانچ صدیوں میں بھی اتنی ترقی نہیں کرسکتا۔ فرد کی شخصی ترقی اور ملک کی اجتماعی ترقی میں جو فرق ہمیں نظر آتا ہے اس کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ملک نے پچھلے پچاس برسوں میں واقعی ترقی کی ہے تو پھر ہم جیسے پیچھے کیوں رہ گئے۔ اگر مٹھی بھر افراد نے اس ملک سے بھی کہیں زیادہ ترقی کرلی ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر ملک ترقی کی اس دوڑ میں پیچھے کیوں رہ گیا۔ ایسے ہی تضادات کی وجہ سے ہم نے ملک کی آزادی کے بارے میں کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا۔ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔ اگر ملک کی آزادی کے پچاس برسوں میں سے ترقی کے دو ایک برس بھی ہمیں میسر آجاتے تو ہمیں بھی پتہ چلتا کہ ملک آزاد ہوگیا ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ آپ ملک کی آزادی کے پچاس برسوں کی بات کرتے ہیں۔ ہمیں تو اس ملک کے بعض دور دراز مقامات میں ایسے لوگ بھی نظر آئے جن پر سے اب تک ہڑپاو موہنجوداڑو اور اشوک اعظم کے ادوار بھی نہیں گزرے ہیں۔

رہی آزادی کے دنوں کو یاد کرنے کی بات تو ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ 15۔ اگست 1947ء کو ہم عثمان آباد میں تھے جو سابق ریاست حیدرآباد کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ خاموش اور پر سکون۔ اس خوابیدہ ماحول میں پتہ ہی نہیں چلا کہ ملک کب آزاد ہوگیا۔ ہماری عمر گیارہ برس کی تھی۔ ہمیں اس وقت تو کچھ کچھ پتہ ضرور تھا کہ آزادی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن آج آزادی کی پچاسویں سالگرہ مناتے ہوئے ہمیں آزادی کا مطلب بالکل سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ یہی تو ان پچاس برسوں کی دین ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ آزادی کے ایک سال بعد ہی ہم نے چنچولی میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماموں کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ پھر اس کے کچھ دنوں بعد عثمان آباد میں جابجا انسانی نعشوں کے ڈھانچے دیکھے تھے اور اجڑے ہوئے گھروں کی ویرانی دیکھی تھی۔ اب اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم آزادی کے دنوں کو یاد کریں تو کیا یاد کریں۔ کس بات کو یاد رکھیں اور کس بات کو بھول جائیں۔ لہذا یہی وجہ ہے کہ ہم نے ایک لمبی چپ سادہ رکھی ہے۔ اتنے ستم اٹھائے ہیں اور اتنے دکھ جھیلے ہیں کہ اب ہنسنے ہنسانے کے سوائے ہمیں کوئی اور کام نہیں آتا۔

(۲۴/ اگست ۱۹۹۷ء)

کچھ معافی مانگنے کے بارے میں

معافی مانگنے کو ایک ایسی انسانی صفت مانا گیا ہے جسے اپنے اندر پیدا کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے یہ صفت انسانی ہونے کے باوجود ماورائی سے لگتی ہے۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے آج تک کسی سے معافی مانگی بھی ہو تو شاید ہی کبھی صدق دل سے مانگی ہو۔ کیوں کہ معافی کوئی قرض تو ہے نہیں کہ آدمی مانگنے پر آئے تو مانگتا ہی چلا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ بچپن میں اگر ہم نے اپنے کسی ہم جماعت کے ساتھ زیادتی کی اور استاد نے آنکھیں اور چھڑی دونوں دکھا کر ہم سے منت سماجت کی کہ ہم اس سے معافی مانگ لیں تو ہم نے تب بھی "معاف کردیجئے" کا جملہ یوں ادا کیا جیسے ہمارے اکثر دولھا حضرات عقد کے وقت "قبول کیا" کا جملہ ادا کرتے ہیں۔ مگر یہ معاملہ صرف ہمارے بچپن تک محدود تھا کیوں کہ بعد میں ہم نے زندگی کچھ اس طرح گزاری کہ کسی سے معافی مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ ایسی زندگی کو عموماً گھاٹے کا سودا کہتے ہیں جس کی سزا ہم اب تک بھگت رہے ہیں۔

آج معافی مانگنے اور معافی منگوانے کا خیال ہمیں اچانک نہیں آیا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دنوں معافی مانگنے کی وبا اچانک ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست ہمارے پاس آئے اور نہایت شرمندگی اور خفت کے ساتھ کہنے لگے "آج میں تم سے ایک بات کے لئے بصد خلوص معافی مانگنے آیا ہوں۔" ہم نے کہا "تم سے ایسی کونسی خطا سرزد ہوئی تھی کہ تم ہم سے معافی مانگو؟" بولے "یہ خطا مجھ سے نہیں بلکہ میرے دادا جان سے سرزد ہوئی تھی۔" ہم نے کہا "ہم نے تو تمہارے دادا جان کی شکل تک نہیں دیکھی اور اگر بفرض محال دیکھی بھی ہو تو ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ تمہارے دادا جان نے ہمارے ساتھ کبھی کوئی ایسی زیادتی کی ہو جس۔

کی معافی تمھیں مانگنی پڑے۔" بولے "میرے دادا جان نے تمھارے ساتھ تو کوئی زیادتی نہیں کی تھی البتہ تمھارے داداجان کے ساتھ ضرور کی تھی۔" ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟" بولے "آج سے سو برس پہلے میرے دادا جان نے تمھارے دادا جان کی جائیداد دھوکے سے ہڑپ کرلی تھی۔ مجھے پرسوں ہی اس کا پتہ چلا۔ سوچا کہ تم سے معافی مانگ لوں۔ تم میرے اچھے دوست ہو۔ خدا کے لئے مجھے معاف کردو ورنہ میرا ضمیر تادم آخر ملامت کرتا رہے گا"۔ ہم نے کہا "یہ کیا بات ہوئی کہ تمھارے دادا جان میرے دادا جان کے ساتھ زیادتی کریں اور تم اس کی معافی مجھ سے مانگو اور پھر اگر تمھارے دادا جان نے کوئی غلطی کبھی کی تھی تو میں کون ہوتا ہوں انھیں معاف کرنے والا۔ پھر اہم بات یہ ہے کہ نہ تمھارے دادا زندہ ہیں اور نہ میرے۔ ایسے میں اس معافی کی کیا قانونی اور اخلاقی اہمیت باقی رہے گی۔" اس پر میرے دوست نے کہا "بھئی! معافی مانگنا تو بہت اچھی چیز ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کسی غلطی کے لئے معافی مانگ لے تو پھر اس میں یہ حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بار بار وہی غلطی کرتا چلاجائے۔ چاہے بعد میں وہ کوئی معافی نہ مانگے۔" ہم نے کہا "مگر سو برس پہلے جو غلطی تمھارے دادا سے سرزد ہوئی تھی اس کی معافی اب مجھ سے مانگ کر تم اپنے اندر کس بات کا حوصلہ پیدا کرنا چاہتے ہو۔" ہنس کر بولے "میں یہ چاہتا ہوں کہ میں بھی اپنے داداجان کے نقش قدم پر چل کر تمھاری جائیداد کا کچھ حصہ ہڑپ کرلوں تاکہ پھر آج سے پچاس ساٹھ سال بعد میرا پوتا تمھارے پوتے سے میری غلطی کی معافی مانگ لے۔ تاریخ اپنے آپ کو اسی طرح دہراتی رہتی ہے۔" ہم نے ہنس کر کہا "یہ معاملہ تاریخ کا نہیں جغرافیہ کا ہے۔ سو برس پہلے میرے دادا کی جائیداد کا جغرافیہ بہت بڑا تھا۔ اسے کسی نے ہڑپ کرلیا بھی تو کیا ہوا۔ میری موجودہ جائیداد کے جغرافیہ کا یہ عالم ہے کہ میرے لئے تو دو گز زمین بھی حاصل کرنا دشوار نظر آنے لگا ہے۔ ایسے میں تم کیا میری جائیداد کو ہڑپ کروگے اور تمھارا پوتا کیا میرے پوتے سے معافی مانگے گا۔" ہمارے دوست نے کہا "مگر میں تو آج تم سے معافی مانگ کر رہوں گا۔ تم نے دیکھا نہیں ابھی پچھلے ہفتہ جاپان کے وزیر اعظم نے پچاس برس پہلے لڑی گئی دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے جو زیادتیاں کی تھیں اور

مظالم ڈھائے تھے ان کے لئے ساری دنیا سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی اور دنیا نے اسے قبول بھی کرلیا ہے یہ اور بات ہے کہ کچھ اقوام نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ صرف معافی مانگنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا بلکہ جاپان کو اس نقصان کی پابجائی بھی کرنی چاہئے جو جاپان کی وجہ سے ان اقوام کو اٹھانا پڑا تھا۔ انگلی پکڑنے دو تو کلائی پکڑلینا اسی کو کہتے ہیں۔" ہمارے دوست کی بات نہایت معقول تھی۔

پتہ نہیں ادھر کیا بات ہوئی ہے کہ ان دنوں ہر کوئی معافی مانگنے پر تل گیا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے مہاراشٹر کے سابق چیف منسٹر شردپوار نے تین سال پہلے بابری مسجد کے گرائے جانے کے واقعہ کی معافی مانگی تھی۔ تلگودیشم کے رہنما این ٹی راماراؤ کی اہلیہ لکشمی پاروتی نے بھی ابھی چار پانچ دن پہلے کچھ اس انداز سے معافی مانگی تھی کہ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کس سے معافی مانگ رہی ہیں اور کیوں مانگ رہی ہیں۔ بہر حال معافی مانگنے کے اس متعدی مرض کا یہی حال رہا تو کیا عجب کہ قومیں ان خطاؤں کے لئے معافی مانگنا شروع کردیں جو ان سے ہزاروں برس پہلے سرزد ہوئی تھیں۔ اصولاً یونانیوں کو ہم ہندوستانیوں سے سکندر اعظم کے اس حملہ کے لئے معافی مانگنی چاہیے جو اس نے زمانہ ماقبل مسیح میں ہندوستان پر کیا تھا۔ دور کیوں جایئے خود ہمارے جیتے جی اس دنیا میں اتنا کچھ ہوا ہے کہ کئی قوموں کو ایک دوسرے سے معافی مانگنی چاہیے۔ روس کو افغانستان سے معافی مانگنی چاہیے کہ اس نے خواہ مخواہ ہی وہاں اپنی فوج جھونک دی تھی۔ امریکہ پر واجب ہے کہ وہ ویت نام سے معافی مانگے۔ دیکھا جائے تو امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جو معافی مانگنے کے معاملے میں اتنا خود کفیل اور تونگر ثابت ہوسکتا ہے کہ اگر وہ صدق دل سے معافی مانگنے پر اتر آئے تو امریکہ میں پیدا ہونے والی کئی نسلیں ساری عمر صرف معافی ہی مانگتی رہ جائیں کیوں کہ امریکہ اس اعتبار سے پہلا ملک ہے جس کی فوجوں نے آج تک اپنی سرزمین پر کوئی جنگ نہیں لڑی۔ جب بھی ان فوجوں کا جی جنگ لڑنے کو چاہا تو ساز و سامان لے کر دوسرے ملکوں کی طرف کوچ کر گئیں۔ ماضی بعید میں سرزد ہونے والی غلطیوں کی معافی مانگنے کی اس نئی ادا کے بارے میں ایک صاحب کا خیال ہے کہ یہ سب قرب قیامت کے آثار ہیں۔ انسان کو اب پتہ چل گیا ہے کہ دنیا جلد ہی

ختم ہونے والی ہے ۔ لہذا سب کو اپنی اپنی غلطیاں یاد آنے لگی ہیں اور وہ اپنے کئے کی معافی مانگ کر حتی الامکان معصوم اور بے گناہ حالت میں خدا کے حضور میں پہنچنا چاہتے ہیں ۔ سچ پوچھئے تو ہم نے قرب قیامت سے گھبرا کر کل اپنی بیوی سے اس بات کے لئے معافی مانگ لی ہے کہ آج سے لگ بھگ چالیس برس پہلے ہم نے اس سے شادی کرلی تھی ۔ یہ ایک ایسی خطا ہے جس کی سزا ہم دونوں ہی برسوں سے بھگتتے چلے آرہے ہیں ۔

کچھ بھی ہو ہم نے تو یہی دیکھا کہ آج تک کسی نے صدق دل سے معافی نہیں مانگی ۔ چاہے اس سے کتنی ہی بڑی خطائیں نہ سرزد ہوئی ہو ۔ بہت عرصہ پہلے ایک ملک کی پارلیمنٹ کے ارکان کے بارے میں ایک اخبار نے یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس پارلیمنٹ کے آدھے ارکان پاگل ہیں ۔ اس پر پارلیمنٹ میں خاصا ہنگامہ ہوا ۔ جب اس اخبار سے معافی مانگنے کے لئے کہا گیا تو اس نے دوسرے دن معذرت کے طور پر یہ جملہ لکھا " قارئین نوٹ فرمالیں کہ پارلیمنٹ کے آدھے ارکان پاگل نہیں ہیں " ۔ اب جو جاپان کے وزیر اعظم نے دوسری جنگ عظیم کی زیادتیوں کے لئے اقوام عالم سے معافی مانگی ہے تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ موصوف دوسری جنگ عظیم کے وقت غالباً پرائمری اسکول کے طالب علم رہے ہوں گے ۔ انہیں کیا معلوم کہ زیادتیاں کرنے والے اصل مجرم کون تھے ۔ لاکھوں لوگوں کی جانیں گئیں ۔ انسانیت کے سینہ پر یہ گھاؤ بدستور لگا رہتا تو اچھا تھا ۔ معافی کے ذریعہ اس گھاؤ پر مرہم رکھنے کی کیا ضرورت تھی ۔

(نومبر / ۱۹۹۵ ء)

ذکر پھر سیاست دانوں کا

ابن انشا نے بہت عرصہ پہلے لاہور کے تانگے والوں کے بارے میں کہیں لکھا تھا کہ ایک بار وہ لاہور کے اسٹیشن سے باہر نکلے تو ایک تانگے والے نے ان کا اٹیچی کیس یہ کہتے ہوئے لے لیا کہ مہربان میرے تانگہ کو رونق بخشیے دوسرے تانگہ والے نے ان کا بستر بند اچک لیا کہ حضرت وہاں کہاں جاتے ہیں۔ میں جو آپ کی خدمت کے لئے موجود ہوں۔ تیسرے نے یہی کہہ کر ان کا توشہ دان لے لیا، چوتھے نے ان کی صراحی اپنے تانگے میں رکھتے ہوئے کہا جناب "آپ کی سواری کے لئے میرا تانگہ حاضر ہے" بعد میں ابن انشا نے بڑی منت سماجت کر کے ان تانگے والوں سے اپنا سامان دوبارہ حاصل کیا اور پیدل چلے گئے۔ ابن انشا اپنی مزاح نگاری میں بہت زیادہ مبالغہ کے قائل نہیں تھے اس لئے معاملہ کو صراحی پر ہی روک دیا اور تانگے والوں کو مزید دست درازی کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ ہم ہوتے تو اس سلسلہ کو یوں آگے بڑھاتے کہ پانچویں تانگے والے نے اپنی گرانقدر خدمات پیش کرتے ہوئے ہماری عینک اتارلی۔ چھٹے نے ہمارا قلم سنبھال لیا۔ ساتویں نے ہماری جیب سے پرس نکال لیا کہ حضور! کرایہ تو منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد ہی لونگا لیکن تب تک پرس تو میرے پاس رہنے دیجیے۔ کچھ اور مبالغہ سے کام لیتے تو ہم تانگے والوں کی مدد سے اپنے کپڑے اتروا کر ننگے بھی ہو سکتے تھے۔

آج ہمیں ابن انشا مرحوم کی اس لئے یاد آگئی کہ جب سے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان ہوا ہے کئی سیاسی جماعتوں کی حالت ابن انشا کی سی ہوگئی ہے بلکہ پچھلے ہفتہ تک تو کانگریس پارٹی کے بارے میں یہ گمان ہونے لگا

تھا کہ جیسے ابھی ابھی لاہور کے اسٹیشن پر اتری ہے اور تانگے والوں کے نرغے میں ہے۔ جس کو جو بھی ملا اس پارٹی میں سے اٹھاکر لے گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سونیا گاندھی نے بر وقت مداخلت کی ورنہ تو لوگ کانگریس کے کپڑے بھی اتار لیتے۔ سیاسی پارٹیوں میں ان دنوں بڑی ٹوٹ پھوٹ جاری ہے اور سیاسی رہنما بلاتکلف ادھر سے ادھر جارہے ہیں۔ ہم نے بیسیوں مرتبہ پارٹیاں بدلنے والے رہنماؤں کا مذاق اڑایا ہے لیکن مذاق اڑانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ لہذا ہم تو اپنی حد پر رک گئے لیکن سیاسی پارٹیوں کو بالکل یہ پتہ نہیں چلا کہ پارٹیاں بدلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ تھک ہار کے ہم نے تو اپنا مذاق بند کردیا لیکن لیڈر لوگ پارٹیاں بدلتے بدلتے تھکنے کا نام نہیں لیتے۔ اب ان کا مذاق اڑائیں تو کیونکر اڑائیں اور کہاں تک اڑائیں یہ تو ہماری مزاح نگاری کے بس کے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کررہے ہیں کہ بڑے سے بڑا مزاح نگار بھی ان کی حرکتوں کو اپنی سوچ کے دائرہ میں نہیں لاسکتا۔

کسی زمانہ میں سیاسی رہنما کسی پارٹی کے نظریہ کی وجہ سے اس پارٹی میں رہتے تھے لیکن اب صورتحال بدل گئی ہے۔ اب ان کی حالت اس بنیے، کی سی ہوگئی ہے جس سے کسی نے پوچھا۔ میاں تم مرنے کے بعد دوزخ میں جانا پسند کروگے یا جنت میں؟" بنیے، نے کہا۔ حضور جہاں بھی چار پیسے کا فائدہ ہوگا وہاں چلا جاؤنگا۔ مجھے جنت اور دوزخ سے کیا لینا دینا ہے۔" کئی لیڈر برسوں سے نظریاتی اعتبار سے کسی ایسی سیاسی جماعت سے وابستہ تھے جو خود ان کی اور عوام کی نظر میں جنت کا درجہ رکھتی تھی لیکن اب وہ اسے چھوڑ کر دھڑا دھڑ ایسی جماعتوں میں بھی خوش خوش جانے لگے ہیں جو دوزخ سے کم نہیں ہیں۔ یہ جو دوزخ کی طرف ہمارے رہنماؤں کی دوڑ اچانک چالو ہوگئی ہے تو اس سے ہمیں تو یہی لگ رہا ہے کہ وہاں ان رہنماؤں کو فائدہ میں چار پیسے زیادہ مل رہے ہیں اسی لئے تو وہ جنت سے نکل کر دوزخ کی طرف جارہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ اب نظریہ اور عقیدہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب عقیدہ کے لئے لوگ اپنی جان کی بازی تک لگادیتے تھے۔ اب اپنی جان کے لیے اپنے عقیدہ کی بازی لگادیتے ہیں۔

ہمارے بھی کیسے عجیب وغریب رہنما ہیں ۔ جن کی تصویریں پولیس تھانوں میں لگنی چاہئیں ان کی تصویریں روزانہ لمبے چوڑے بیانات کے ساتھ اخباروں میں چھپنے لگی ہیں ۔ بے شرمی کی انتہا کا یہ عالم ہے کہ پارٹیاں بدلنے والے ۔ ایسے لیڈروں کو بڑے اہتمام کے ساتھ اخبار والوں اور ٹیلی ویژن کے کیمرہ مینوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ۔ خوشی میں لڈو بانٹے جاتے ہیں ۔ ایک دوسرے کو مبارک بادیاں دی جاتی ہیں ۔ ہم ہوتے تو ایسے لوگوں کو اخبار والوں کے سامنے پیش کرنے سے پہلے شہر میں منادی کراتے کہ بھائیو! اگر آپ نے آج تک کسی ضمیر فروش ، بے ایمان اور بے شرم آدمی کو نہیں دیکھا ہے تو آج شام فلاں وقت پر فلاں جگہ آجائیے ۔ وہیں آکر اس ضمیر فروش کو پارٹی بدلتے ہوئے دیکھ لیجیے ۔ پرانے زمانہ میں اکثر اوقات کسی خطرناک مجرم کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد اس کی نعش کو وہیں لٹکنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ عوام الناس عبرت حاصل کریں ۔ ہمارے موجودہ لیڈروں کو آپ بھلے ہی پھانسی پر نہ لٹکائیں انہیں صرف اتنا کہہ دیں کہ میاں ہم تمہیں اپنے علاقہ سے کھڑا نہیں کرنا چاہتے تاہم ہم تمہیں معقول معاوضہ دیں گے بشرطیکہ تم ایک ضمیر فروش اور بے شرم آدمی کے روپ میں شہر کے چوک میں مجسمہ کی حیثیت سے کھڑے ہوجاو ۔ یہ لیڈر یقینا الیکشن میں کھڑے ہونے کے بجائے ضمیر فروش آدمی کا مجسمہ بن کر کھڑے ہوجانے کو زیادہ ترجیح دیں گے کیونکہ اس میں چار پیسے زیادہ کا فائدہ ہے ۔ ایسے رہنما انتخابات میں جیت کر قانون ساز اداروں میں تو جاتے ہیں لیکن وہاں جاکر جو کچھ کرتے ہیں اس کا حال آپ ٹیلی ویژن پر اکثر دیکھتے رہتے ہیں ۔ پچھلے دنوں کی بات ہے ہم اپنے نواسے سے ناراض ہوئے اور غصہ میں اسے دوچار گالیاں دیں تو ہمارے نواسے نے ہم سے کہا "دیکھئے حضرت منہ سنبھال کے بات کیجیے ۔ میں گھر میں پارلیمانی زبان سننے کا عادی نہیں ہوں ۔ Un Parliamentary language میں آپ چاہے جتنی بھی گالیاں مجھے دیں ۔ میں برداشت کرلونگا لیکن پارلیمانی زبان ہرگز نہیں سنوں گا " پارلیمنٹ کو ہمارے آج کے ارکان پارلیمنٹ نے وہ حیثیت دیدی ہے کہ پچھلے دنوں ایک محفل میں ایک صاحب

نے ایک سابق رکن پارلیمنٹ کا تعارف ہم سے کراتے ہوئے کہا۔ "ان سے ملیئے یہ پارلیمنٹ کی دو معیاد کاٹ کر آئے ہیں" گویا معیاد کاٹ کے آنے اور سزا، کاٹ کے آنے میں اب کوئی فرق نہیں رہا وہ بے چارے دس برس پہلے پارلیمنٹ کے رکن تھے فوراً بول اٹھے "جناب میں حالیہ رکن پارلیمنٹ نہیں ہوں۔ میں تو دس برس پہلے پارلیمنٹ کا رکن تھا۔ اس لئے معیاد کاٹ کے آنے کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوتا"

سیاسی رہنماؤں کا کردار تو اب اتنا مشکوک ہوگیا ہے کہ پچھلے دنوں ایک رہنما بڑی تشہیر اور طمطراق کے ساتھ ایک پارٹی سے نکل کر دوسری پارٹی میں شریک ہوئے تھے۔ اخباروں میں تصویریں چھپیں۔ ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا کہ پارٹی میں ان کی شمولیت کی خوشی میں لڈو بانٹے جارہے ہیں۔ مگر دو دن بعد دیکھا کہ یہ رہنما پھر سے اپنی پرانی پارٹی میں واپس آگئے ہیں۔ پھر وہی سلسلہ ہوا کہ اخباروں میں تصویریں چھپیں اور بعد میں لڈو بانٹے گئے۔ کسی نے پوچھا کہ موصوف کے دوسری پارٹی میں جانے اور دو دن بعد پھر سے پرانی پارٹی میں واپس آنے کا کیا سبب تھا۔ اس پر کسی نے جواب دیا "موصوف اصل میں لڈو کھانا چاہتے تھے۔ پارٹی عقیدے اور نظریہ سے انہیں کیا مطلب"

اردو کا ایک بہت ہی خوبصورت اور مشہور شعر ہے۔

شائد مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

ایک منچلے نے اس شعر کے صرف ایک لفظ کو بدل کر اس شعر کی بڑی معنی خیز تحریف کی تھی۔

شائد مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

ہمارے سیاسی لیڈر کسی پارٹی سے نکل کر یہ نہیں سوچتے کہ ان کی پرانی پارٹی کے لوگ انہیں نکال کے پچھتا رہے ہونگے۔ وہ تو یہ سوچتے ہیں کہ انہیں نکال کے ان کی پرانی پارٹی کے لوگ کچھ کھانہ رہے ہوں۔ اسی لئے یہ

بسااوقات پھر سے اپنی پرانی پارٹی میں واپس آجاتے ہیں کیونکہ موجودہ سیاست میں کھانے کو ہی اب بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی ہے ۔

ہم نے آج سیاستدانوں کا ذکر ایک خاص مقصد سے کیا ہے ۔ آپ کو یہ آگاہ کرنے کے لئے کہ آپ اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ آنے والے انتخابات میں سیاسی لیڈر آپ سے ووٹ مانگنے کے لئے آئیں گے ۔ وہ تو اس بار آپ کے ووٹوں کی عصمت لوٹنے اور ان پر ڈاکہ ڈالنے کے ارادہ سے آرہے ہیں ۔ لہذا آپ اپنے ووٹ کی عصمت کو بچائے رکھنے کے جتن کریں تو اچھا ہوگا ۔

(۱۸ جنوری ۱۹۹۸ء)

تماشائے اہلِ قلم

سردار جعفری ، اردو ادب اور گیان پیٹھ انعام

- سردار جعفری ہندوستانی شہری نہیں ہیں۔
- سردار جعفری شاعر نہیں ہیں۔
- سردار جعفری نقاد نہیں ہیں۔
- سردار جعفری سیکولر نہیں ہیں۔
- سردار جعفری سچے انقلابی نہیں ہیں۔

پتہ نہیں سردار جعفری خود اپنے بارے میں لوگوں کے اس قسم کے خیالات اور تاثرات نہ جانے کب سے سنتے آ رہے ہیں۔ خود ہم نے لگ بھگ پچھلی نصف صدی میں ادبی محفلوں میں ان کے بارے میں لوگوں سے اکثر ایسی باتیں سنی ہیں۔ بڑے ادیبوں اور فنکاروں کے خلاف ایسی باتوں کی تردید تو عموماً آنے والا وقت ہی کرتا ہے اور ادب میں آنے والا وقت اپنے آنے میں خصوصاً بہت دیر لگا دیتا ہے۔ خود غالب کو اس کے دور میں پہچانا نہیں گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ آنے والے وقت نے مولانا حالی کے ہاتھوں میں اپنی ترازو تھما دی۔ غالب جب اس دنیا سے رخصت ہوا ہے تو اس کی شہرت یا بدنامی جو کچھ بھی تھی وہ کچھ ایسی تھی کہ جواری ہے ، شرابی ہے ، ڈومنی کے عشق میں گرفتار ہے ، سربراہان مملکت کی شان میں قصیدے کہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن غالب کے مرنے کے بعد جب ادب میں اس کے جینے کا وقت آیا تو احساس ہوا کہ غالب تو ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کا سب سے مہذب ، شائستہ اور شریف انسان تھا۔ منٹو کو بھی اپنی مختصر سی زندگی میں ایسی ہی باتوں کا سامنا کرنا پڑا چونکہ ادب میں "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" والا سودا نہیں چلتا اس لئے ادب کے اکثر فیصلوں کو وقت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

پچھلے ہفتہ جب سردار جعفری کو ہندوستان کے سب سے معتبر ایوارڈ "گیان پیٹھ" کے ملنے کی اطلاع آئی تو سردار جعفری کے ایک پرستار کی حیثیت سے ہمیں اس بات کی خوشی ہوئی کہ ہندوستانی ادب کے لئے ان کی دین کے بارے میں فیصلہ کرنے والا وقت خود ان کی زندگی میں ہی چلا آیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے لئے انہیں جدوجہد، سنگھرشوں اور آزمائشوں سے بھر پور 85 برس کی زندگی گذارنی پڑی۔ سردار جعفری اپنی بات پر اڑنے، ڈٹے رہنے اور قائم رہنے کے لئے بڑی شہرت تو رکھتے ہی ہیں لیکن ہمیں ان کے اس قدر ضدی ہونے کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ آنے والے وقت کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے آنے پر مجبور کر دیں گے۔

بلاشبہ سردار جعفری ہمارے ادب کی سب سے فعال، متحرک، توانا مگر ساتھ ہی ساتھ متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ ان کے مخالفین تو انہیں نزاعی شخصیت مانتے ہی رہے ہیں۔ ان کے مداح اور چاہنے والے بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ تین برس پہلے ممبئی کے انتظامیہ نے انہیں ایک نوٹس جاری کرکے کہا تھا کہ وہ اپنے ہندوستانی شہری ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔ ہم نے اس پر ایک کالم لکھا تھا جس میں ہم نے ان سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا کہ جعفری صاحب کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ شمس الرحمن فاروقی انہیں شاعر نہیں مانتے اور باقر مہدی انہیں نقاد اور دانشور نہیں مانتے اور اب تو حد ہو گئی کہ ممبئی کا انتظامیہ انہیں ہندوستانی شہری بھی ماننے کو تیار نہیں ہے۔ آخر وہ کہاں تک اپنے ہندوستانی شہری ہونے، شاعر ہونے اور ناقد ہونے کے دستاویزی ثبوت فراہم کرتے رہیں گے۔ (نزاعی ہونے کی واقعی یہ ایک انتہاء ہے)۔ بابری مسجد جب تک گری تھی تو ہندی اور انگریزی کے اخبارات بربنائے مصلحت اسے "متنازعہ ڈھانچہ" لکھا کرتے تھے۔ ایک بار ہم نے مذاق مذاق میں دوستوں کی ایک محفل میں کہا تھا کہ جعفری صاحب بھی اردو ادب کا ایسا ہی ایک "متنازعہ ڈھانچہ" ہیں۔

اب جب کہ انہیں ملک کا اعلیٰ ترین ادبی انعام مل چکا ہے تو ہمیں

یقین ہیکہ اب جعفری صاحب کو اپنے طور پر اپنے ہندوستانی شہری ہونے ، شاعر ، ناقد اور سیکولر ہونے کے دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی ۔ (ابھی پچھلے مہینہ مہاراشٹرا اردو اکیڈمی نے ان پر فرقہ پرست ہونے کا الزام عائد کرتے ہوئے اپنا انعام دینے سے انکار کیا تھا) ۔ سردار جعفری نے اس صدی کے پہلے دہے کے تین برس بعد اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں اور اب بیسویں صدی کے ختم ہونے میں صرف تین برس باقی رہ گئے ہیں ۔ گویا پوری بیسویں صدی کے لگ بھگ سارے اہم واقعات اور حوادث کو انہوں نے برصغیر کے تناظر میں پورے ہوش و حواس اور فہم و ادراک کے ساتھ جھیلا ہے ۔ بیسویں صدی انسانی تاریخ میں ایک سنگین اور عجیب و غریب تضادات والی صدی کے لحاظ سے ادب میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی ۔ دو عظیم جنگیں اس صدی میں سردار جعفری کی آنکھوں کے سامنے لڑی گئیں ۔ نو آبادیاتی نظام کے پرخچے اڑگئے ۔ برصغیر آزاد ہوا ، سائنس نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ انسان خلاء کی وسعتوں پر قابض ہونے اور دسترس رکھنے کے خواب دیکھنے لگا ۔ " انقلاب روس " بھی اس صدی میں آیا اور اسی صدی میں سوویت یونین کا شیرازہ بھی بکھر گیا ۔ بیسویں صدی نے انسانیت کو کئی نئے خواب دیئے اور اسی صدی میں یہ خواب چکنا چور بھی ہوگئے ۔ اس صدی میں پیدا ہونا اور پیدا ہوکر پل پل ایک حساس آدمی کی طرح زندہ رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے ۔ سردار جعفری نے اس پر آشوب صدی میں زندگی جی ہے اور ایسی بھرپور زندگی جی ہے کہ ان کے جینے پر رشک آتا ہے ۔ کتنے شعلے تھے جو وقت کی دھار پر جلتے جلتے بجھ گئے یا مدھم پڑ گئے لیکن سردار جعفری نے اس صدی کے ایک ایک پل کے ساتھ جینا نہیں چھوڑا ۔ اصل میں سردار جعفری نے ادب سے اپنے سروکار کو کچھ ایسا مستحکم اور اٹوٹ بنالیا کہ بھلے ہی کوئی انہیں شاعر ، ادیب اور دانشور نہ مانے پھر بھی انہوں نے ادب اور سراسر ادب کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا ، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا بنالیا ۔ ادب سے ایسا والہانہ سروکار شائد ہی اردو کے کسی اور ادیب کی زندگی میں نظر آئے ، یہ ضرور ہے کہ زندگی اور اپنے مخالفین سے نبرد آزما ہوتے وقت انہیں پینترے بدلنے

پڑے ۔ انہوں نے پینترے ضرور بدلے لیکن تھک ہار کر نہیں بیٹھ گئے ۔ یوں بھی آدمی جب سنگھرش کرتا ہے تو پینترے تو بدلتا ہی ہے اور پینترے بدلنے کو مصلحت پسندی نہیں کہتے ۔ وہ اصل میں ہمہ وقتی ادیب ہیں ۔ ہماری طرح جزوقتی ادیب نہیں ہیں جنہیں ادب لکھنے کے ساتھ ساتھ بجلی ، پانی اور ٹیلی فون کے بل جمع کرنے پڑتے ہیں ۔ بال بچوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے ، سودا سلف بھی لانا پڑتا ہے ۔ کبھی کبھی بال بھی بنوانے پڑتے ہیں اور کبھی کبھی مجبوری میں ادبی محفلوں میں بھی جانا پڑتا ہے ۔

پچھلے چالیس برسوں میں ہم نے جب بھی سردار جعفری کو دیکھا ادب اور سماج کی کسی نہ کسی گتھی کو سلجھانے یا بعض اوقات سلجھی ہوئی گتھی کو پھر سے الجھانے میں مصروف پایا ۔ ان کی شخصیت کی جہتیں بھی کئی ہیں ۔ کہانی کار ہیں (سردار جعفری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا) شاعر ہیں ، ناقد ہیں ، بے مثال مقرر ہیں ، دانشور ہیں ، سیاست سے بھی گہرا واسطہ رہا ہے ۔ گویا ایک چومکھی شخصیت ہیں ، جہاں وہ حافظ ، رومی ، غالب ، اقبال ، کبیر اور ٹیگور کے شیدا ہیں وہیں ایلیا اہرن برگ ، لوئی اراگاں اور پابلو نرودا کے عاشق ہیں ، مارکس اور انیگلز سے ان کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے ایک دوست اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر مارکس اور اینگلز سردار جعفری سے پہلے پیدا نہ ہوئے ہوتے تو سردار جعفری کو کچھ اپنے کام بھی کرنے کا موقعہ مل جاتا ۔ اب تو ان کی زندگی کا بڑا حصہ ان دونوں کی مدافعت میں ہی گذر جاتا ہے ۔ یوں بھی سردار جعفری کے نزاعی ہونے میں خود ان کا اتنا ہاتھ نہیں ہے جتنا کہ مارکس اور اینگلز کا ہے ۔ سردار جعفری نہ صرف عالمی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ہندوستانی زبانوں کے ادب سے بھی کما حقہ واقف ہیں ۔ وہ اردو کی ان دو تین ادبی شخصیتوں میں سے ہیں جن کی شناسائی ہندوستانی زبانوں کے سارے ادیبوں اور فنکاروں سے ہے ۔ سردار جعفری اگرچہ مشاعروں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے ہیں لیکن ہم انہیں "مذاکروں" میں سننا زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ وہ کسی بھی موضوع پر جب بولتے ہیں تو کچھ اس طرح بولتے ہیں کہ سننے والوں کو اپنے ساتھ بہاکر لے جاتے ہیں ۔

بات سے بات نکلتی ہوئی، منطق کے سرے تلاش کرتی ہوئی، آگہی کی راہوں پر چلتی ہوئی کہیں رکتی ہوئی، گاہ گاہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوئی، پھر سرپٹ دوڑتی ہوئی، تاریخ اور مذاہب عالم کے حوالے دیتی ہوئی، فلسفہ کو اپنی آغوش میں سمیٹتی ہوئی، دانش کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہوئی۔ ان کی باتوں سے آپ کو اختلاف بھی ہو تو آپ ان کی جادو بیانی کے سحر میں ڈوب کر بہت دور تک چلے جائیں گے۔ (ہمیں تو بعض اوقات ان کی تقریر کو سننے کے بعد اپنے گھر واپس جانا بھی دشوار نظر آیا) سردار جعفری نے نہ صرف اس صدی کی سوچ کو اپنے اندر سمو لیا ہے بلکہ اس صدی کی سوچ کی تشکیل میں بھی حتی المقدور اپنا حصہ ادا کیا ہے۔

سردار جعفری کی ایک شاہکار نظم ہے "میرا سفر" اس نظم کو مایہ ناز رقاصہ شوبھنا نارائن نے نہایت خوبصورت ڈھنگ سے کتھک رقص میں بھی پیش کیا ہے۔ دو ایک بار خود جعفری صاحب کے ساتھ ہم نے یہ پروگرام دیکھا ہے اور اس کے بارے میں اپنے کالم میں لکھا بھی ہے۔ سردار جعفری نے اس نظم میں بنیادی خیال یہ پیش کیا ہے کہ زندگی ایک ایسا تسلسل ہے جس میں زندگی چولے بدل بدل کر وقت کے کینوس پر پھر سے نمودار اور غائب ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح وقت اور نسل انسانی کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ سردار جعفری کی اس طویل نظم کے کچھ مصرعے کسی تسلسل کے بغیر ملاحظہ فرمائیے۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

بہت عرصہ پہلے ممبئی کی ایک ادبی محفل میں سردار جعفری یہ نظم سنا رہے تھے ۔ اتفاق سے ہم اس محفل میں ممبئی کی ایک ایسی ادبی ہستی کے ساتھ گئے تھے جنہیں موقعہ بے موقعہ سردار جعفری کو چھیڑنے میں بڑا مزہ آتا ہے اور وہ تفنن طبع کے طور پر جعفری صاحب کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتے رہتے ہیں ۔ سردار جعفری نے جب یہ مصرعے پڑھے جن میں وہ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں پھر آئیں گے ، بچوں کے دہن سے بولیں گے اور پھول بن کر دنیا کو دیکھیں گے تو موصوف نے بے ساختہ کہا " یار ! کیا کہا ؟ یہ پھر آئیں گے ! پھر بولیں گے ، اب تک انہوں نے کچھ کم بولا ہے جو آگے بھی بولیں گے "

ہم نے کہا " حضور " ! انہیں پھر آنے دیجئے اور بولنے دیجئے ، آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ آپ تو اس وقت ہوں گے نہیں " ۔

قہقہہ مار کر بولے " یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تو پھول بن کر آئیں اور میں کانٹا بن کر ان کے ساتھ نہ آؤں ، یار ! یہی تو زندگی کا تسلسل ہے جسے بہر حال جاری رہنا چاہیئے " ۔

غرض سردار جعفری نہ صرف اردو ادب بلکہ ہندوستانی ادب کی ایک نہایت معتبر ہستی ہیں اور انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ کا ملنا نہ صرف ان کے لئے بلکہ اردو زبان کے لئے بھی ایک بڑے اعزاز کی بات ہے ۔ سردار جعفری کے پرستار کی حیثیت سے ہم انہیں مبارکباد دیتے ہیں ۔

ہم نے یہ کالم لکھنا ختم ہی کیا تھا کہ اچانک " شگوفہ " کے تازہ شمارہ میں مجاز کا ایک لطیفہ ہماری نظر سے گذرا ۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے

ایک دعوت میں اسرارالحق مجاز کی نقل و حرکت کو صاحب خانہ کا کمسن لیکن صحت مند بیٹا کئی منٹوں تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا ۔ پھر اچانک کچھ گنگنانے لگا ۔ اس پر کسی نے مجاز سے کہا " مجاز صاحب ! یہ بچہ بڑا ہو کر یا تو شاعر بنے گا یا " " یا سردار جعفری " مجاز نے کمال متانت سے اسی سانس میں جملہ پورا کر دیا ۔

(۲۵ / جنوری ۱۹۹۸ ء)

پروین شاکر کی یاد میں

پچھلے ہفتہ یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ برصغیر کی ممتاز شاعرہ اور دانشور پروین شاکر کا اسلام آباد سے قریب ایک سڑک حادثہ میں انتقال ہوگیا ۔ انتقال کے وقت پروین کی عمر صرف بیالیس (42) برس تھی ۔ اگرچہ پروین شاکر سے سترہ برس پہلے دلی میں ہماری تین چار ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر ان سے کچھ ایسا ذہنی، جذباتی، قلمی، علمی اور ادبی رشتہ بن گیا تھا کہ اس اطلاع کو پڑھ کر یکبارگی یوں لگا جیسے اس اطلاع کو پڑھنے سے پہلے تک دنیا جیسی تھی اب ویسی نہیں رہی ۔ بڑی دیر تک پروین شاکر کی سترہ برس پہلے کی من موہنی صورت آنکھوں میں گھومتی رہی ۔ ایک بے مثال خوبصورتی کا ایسا بھیانک انجام ہوگا کبھی سوچا بھی نہ تھا ۔ پروین کی خوبصورتی صرف ان کی شخصیت کے دلاویز خدو خال میں مضمر نہیں تھی بلکہ اس خوبصورتی میں ایک عجیب شائستگی، وقار، دبدبہ، رکھ رکھاؤ اور سلیقہ پوشیدہ تھا ۔ مارچ 1978ء کے اواخر میں دلی میں شنکر شاد کا جو مشاعرہ منعقد ہوا تھا اس میں شرکت کے لیئے پروین شاکر پہلی بار ہندوستان آئی تھیں ۔ ان سے ملاقات اور اس مشاعرہ کا حال ہم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا جو 2 اپریل 1978ء کو روزنامہ "سیاست" میں شائع ہوا تھا ۔ اس مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے ۔

" اس مشاعرہ کی سب سے اہم خصوصیت پاکستان کی نوخیز شاعرہ پروین شاکر کی شرکت تھی ۔ آیئے ذرا ان کے بارے میں تفصیل سے بات ہوجائے ۔ مشاعرہ سے دو دن پہلے ان سے کانسٹی ٹیوشن کلب کی ایک مخصوص بیٹھک میں ملاقات ہوئی تھی ۔ وہ پالم ایرپورٹ سے سیدھے کانسٹی ٹیوشن کلب آئی تھیں ۔ جب ہم سے تعارف کرایا گیا تو ہم نے جی ہی جی میں سوچا کہ ایسی دھان پان لڑکی

کیا شعر کہہ سکے گی۔ جب اس مخصوص بیٹھک میں ان کے کلام سنانے کی باری آئی تو ہم نے فرمائش کی کہ وہ ترنم سے کلام سنائیں۔ اس پر بولیں "معاف کیجیے میں ترنم سے محروم ہوں" (ہمیں اس جملہ پر سخت حیرت ہوئی کیونکہ ہماری اکثر شاعرات ترنم سے کلام نہیں سناتیں بلکہ اپنے کلام سے ترنم سناتی ہیں) سچ تو یہ ہے کہ پہلی بار ہم نے ایک خاتون شاعر کو تحت اللفظ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ پروین شاکر نے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا مطلع ہے۔

پابہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے میری زنجیر کون

غزل ختم ہوئی تو ہمارے شاعر دوست بشیر بدر نے کہا "محترمہ! آپ نے ایسی مردانہ غزل کہی ہے کہ ہمیں چوڑیاں پہن لینی چاہئیں۔" اس پر پروین نے کہا "ایسی بات ہے تو آپ کو ایک زنانہ غزل سناتی ہوں"۔ پھر پروین نے سچ مچ ایک زنانہ غزل سنائی اور یوں ہمارے دوست کے ہاتھوں میں سے چوڑیاں اتارلیں۔ محفل کے بعد پروین شاکر ہم سے انگریزی میں تبادلہ خیال کرنے لگیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کراچی کے عبداللہ کالج میں انگریزی پڑھاتی ہیں۔ انگریزی میں خاصی دیر تک تبادلہ خیال کرنے کے بعد جب ہم ان کے کلام پر داد دینے لگے تو ہمیں مجبوراً اردو میں بولنا پڑا۔ کیونکہ ہمیں "ماشاء اللہ" "سبحان اللہ" "خدا نظر بد سے بچائے" اور "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" کی انگریزی نہیں آتی۔ ہماری بے ساختہ داد کے جواب میں وہ سراپا انکسار بن گئیں۔ پروین شاکر کے بارے میں یہ جو احمد ندیم قاسمی نے کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے کہ پروین کی آواز کے زیر و بم میں روح عصر کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اردو شاعری میں ہر لحاظ سے یہ نئی آواز ہے۔"

بہر حال مشاعرہ میں جب پروین کی باری آئی تو وہ بڑی سادگی کے ساتھ مائیک پر آئیں اور اسی سادگی کے ساتھ مشاعرہ کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ ہم یہاں انکی غزل کے کچھ شعر پیش کررہے ہیں۔ جنھیں مشاعرہ میں بے حد پسند کیا گیا۔

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہوگئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفّاک ہوگئے

بادل کو کیا خبر تھی کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہوگئے
جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

مشاعرے کے دوسرے دن ہم گھر سے باہر نکلے تو پتہ چلا کہ دلی میں جدھر جائیے پروین شاکر کے چرچے ہیں۔ ہمیں مخدوم کا ایک شعر یاد آیا۔

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدوم
تذکرے رستوں میں، چرچے ہیں پری خانوں میں

1978ء کی ان ملاقاتوں کے بعد پروین سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر ہم دونوں کسی نے کسی طرح ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہے۔ پروین شاکر نے اپنا پہلا مجموعہ کلام "خوشبو" پاکستانی سفارت خانہ کے ایک عہدیدار کے ذریعہ ہمیں بھجوایا تھا۔ پروین شاکر کے دل میں ہمارے لئے خلوص کی جو فراوانی تھی اس سے کبھی کبھی الجھن بھی ہوتی تھی۔ ہم ٹھہرے مزاح نگار اور وہ ٹھہریں عصری اردو ادب کی منفرد لب و لہجہ والی اکلوتی شاعرہ۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس مرحوم کے لیئے ان کے دل میں بے پناہ عقیدت تھی۔ کہتی تھیں زمانہ طالب علمی میں جب میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تو جلیس صاحب نے جس طرح میری ہمت افزائی کی اسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ بزرگوں کی عزت کرنا انکے مزاج کا خاصہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی کا ذکر وہ نہایت عقیدت سے کرتی تھیں اور اپنا پہلا مجموعہ کلام "خوشبو" ان ہی کے نام معنون کیا تھا۔

پروین نے صرف بیالیس برس کی عمر پائی۔ لیکن اردو ادب میں یہ بیالیس برس ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ سچے اور کھرے نسوانی جذبات کا اظہار جس طرح پروین شاکر نے اپنی شاعری میں کیا اسکی نظیر اردو کی کسی شاعرہ کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ نہایت پڑھی لکھی خاتون تھیں اور دنیا کے بہترین ادب پر انکی گہری نظر تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے بے پناہ علم کے دائرہ کو کبھی اپنی مشرقی شائستگی کی حدود سے باہر نکلنے کا موقعہ نہیں دیا۔ قدرت نے پروین شاکر کو جو نسوانی بصیرت عطا کی تھی

وہی انکی شاعری کے منفرد لب و لہجہ کی امین تھی۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے "خوشبو"، "صد برگ" اور "خود کلامی" اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہیں۔ بیشک ہمارے ہاں اچھی شاعرات بھی رہی ہیں اور ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر نے اپنے شعروں میں وہی کہا جو ان کا محبوب سننا چاہتا ہے۔ وہ نہیں کہا جو بحیثیت خاتون وہ کہنا چاہتی ہیں۔ نسوانی جذبات کا ٹھیٹ اور شائستہ اظہار ہمیں صرف پروین شاکر کی شاعری میں ملتا ہے۔ محبت ایک ازلی جذبہ ہے۔ اس جذبہ کو ابتدائے آفرینش سے فنکاروں نے اپنی تخلیقات میں برتا، پرکھا اور پیش کیا ہے۔ لیکن یہ جذبہ جب پروین کی شاعری میں نکھرتا ہے تو اسکی چمک دمک سب سے مختلف اور منفرد دکھائی دیتی ہے۔ ہم یہ کالم لکھنے بیٹھے ہیں تو پروین کے بیسیوں شعر یاد آنے لگے ہیں۔

خوشبو کی ترتیب ۔ ہوا کے رقص میں ہے
میری نمو ۔ میرے ہی جیسے شخص میں ہے
میری اچھائی تو سب کو اچھی لگی
اسکے پیار کا مرکز میرے نقص میں ہے

ooo

تراش کر مرے بازو ۔ اڑان چھوڑ گیا
ہوا کے پاس برہنہ کمان چھوڑ گیا
رفاقتوں کا مری ۔ اسکو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا
جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

ooo

مری طلب تھی کہ ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا ۔ بھول گیا سوال بھی
گاہ قریب شاہ رگ ۔ گاہ بعید وہم و خواب
اسکی رفاقتوں میں رات ۔ ہجر بھی وصال بھی

ooo

بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
میں سمندر دیکھتی ہوں ، تم کنارہ دیکھنا

پروین جتنی خوبصورت غزلیں کہتی تھیں اتنی ہی کامیاب نظمیں بھی کہتی تھیں۔

پروین شاکر سے جب ہماری ملاقات ہوئی تھی وہ کراچی کے ایک کالج میں انگریزی کی لکچرر تھیں۔ بعد میں وہ پاکستان کی فارن سروس کیلئے منتخب ہوگئی تھیں۔ کراچی میں کلکٹر کسٹم بھی رہیں۔ 1989ء میں ہم پاکستان گئے تو وہ امریکہ میں کسی اہم عہدہ پر فائز تھیں۔ پروین نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے "سخن ور" کے عنوان کے تحت اردو کی ممتاز شخصیتوں کے انٹرویوز بھی لئے تھے۔ اردو ادب کی بڑی جتید شخصیتوں کو پروین شاکر کے ذہین سوالات کے آگے پسینہ میں شرابور ہوتے دیکھا ہے۔ پانچ چھ برس پہلے ایک دن اچانک پروین شاکر کا فون آیا کہ وہ دلی میں ہیں اور رنجیت ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اس وقت ہم گھر پر نہیں تھے۔ دن میں دو تین مرتبہ انہوں نے فون کیا۔ بعد میں ہم ملے تو ہمیشہ کی طرح اسی نرم گرم لہجہ میں ہمارا حال پوچھا۔ جب ہم نے بتایا کہ کچھ دیر بعد بمبئی جارہے ہیں تو بولیں "اب آپ پاکستان آئیے۔ انشاء اللہ آپ سے پاکستان میں ملاقات ہوگی۔" غالباً وہ دو تین دن دلی میں رہیں اور ہمارے دلی واپس آنے تک پاکستان جاچکی تھیں۔

ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہم آخری بار پروین شاکر کی آواز کو سن رہے ہیں۔

بہت عرصہ پہلے پروین نے "اسلام آباد" پر ایک نظم کہی تھی۔

ہلکی سرخ پہاڑی پر
دودھیا پھولوں کی چادر
کچھ ایسے بچھی تھی
جیسے پہلی رات کے بعد
دلہن کے آنچل سے جھڑنے والے ستارے
صبح کی سیج پر کھلے ہوئے ہوں

اور آج پروین اپنی ساری رعنائیوں، جلوہ سامانیوں، ذہانتوں، اور لطافتوں کے ساتھ دودھیا پھولوں کی چادر اوڑھ کر اس منظر کا حصہ بن چکی ہیں۔ (۸ / جنوری ۱۹۹۵ء)

یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی

جب آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہوں گے تو ادھر آپ کی زندگی میں نیا سال آچکا ہوگا (جو ہر سال آتا ہے) اور ادھر بمبئی میں بزرگ مزاح نگار یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی مکمل ہو رہی ہوگی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پل دو پل کی بات نہیں یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ اگر یوسف ناظم کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے اور کسی ٹسٹ میچ میں ان کی نصف سنچری مکمل ہوتی تو اسٹیڈیم میں موجود سارے تماشائی ایک ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور تالیوں کی گونج میں انھیں ان کے فن کی داد دیتے۔ لیکن ادب اور کرکٹ کے میدان میں داد دینے کے نہ صرف آداب مختلف ہیں بلکہ ان کے اصول بھی جدا گانہ ہیں۔ ادب کے میدان سے ادیب کو آوٹ کرنے کے لئے کسی بولر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اکثر ادیب تو اپنی وکٹیں خود گرا کر نہ صرف آوٹ ہو جاتے ہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے "فیڈ آوٹ" تک ہو جاتے ہیں۔ پچاس برس تک لگاتار اور مسلسل لکھنا کرکٹ کا کھیل نہیں ہے کہ آدھے دن میں نصف سنچری بنالی اور پھر "مین آف دی میچ" قرار پاکر داد وصول کرلی۔ پھر یوسف ناظم کا کمال یہ ہے کہ ان کا تخلیقی سفر ایک رخا نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ چوبکھا سفر ہے جس میں ادیب راستے بدل بدل کر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ کبھی شمال میں جارہا ہے تو کبھی جنوب میں۔ کبھی مغرب کی طرف گامزن ہے تو کبھی مشرق میں بڑھ رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی شعر کہہ رہا ہے تو کبھی ترجمے کررہا ہے۔ کبھی تنقید لکھ رہا تو کبھی مزاح لکھ رہا ہے۔ کبھی بچوں کی ماؤں کے لیے لکھ رہا ہے تو کبھی بچوں کے والدین کے لئے لکھ رہا ہے۔ (بلکہ بچوں کی ماؤں کے لئے بھی کبھی کبھی الگ سے لکھ دیتا ہے۔) ایسے چوکھے تخلیقی سفر کے لئے صرف

یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی

قلم اور کاغذ ہی کافی نہیں ہوتے ۔ بلکہ اس کے لئے ادیب کے پاس ایک اچھا ، مقوی اور پائے دار کلیجہ بھی ہونا چاہیئے ۔ (خدا کے فضل سے یوسف ناظم کے پاس یہ کلیجہ موجود ہے) یوسف ناظم جامعہ عثمانیہ کے اوّلین مزاح نگار ہیں ۔ جیسے مخدوم محی الدین اور سکندر علی وجد جامعہ عثمانیہ کے اوّلین شعراء رہے ہیں ۔ میں انہیں کبھی نہایت سنجیدگی کے ساتھ دکن کا " بابائے مزاح نگاری " کہتا ہوں تو ناراض سے ہوجاتے ہیں ۔ ویسے ان کی ناراضگی بے سبب بھی نہیں ہے ۔ کیونکہ وہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کا حشر خود اپنی چشم پاک باز سے دیکھ چکے ہیں ۔ (چشم گنہگار ان کے پاس نہیں ہے ۔ یہ تو ہم جیسے پاکبازوں کے حصہ میں آتی ہے ۔) یوں بھی بابائے مزاح نگاری کے لقب سے بزرگی چھلکتی ہے ۔ اور یوسف ناظم 73 برس کے ہوجانے کے باوجود بزرگی کی تہمت اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہیں ۔ (یہی وجہ ہے کہ وہ ابھی حال حال تک اپنے بالوں کو خضاب سے رنگتے رہے ہیں) وہ اب بھی نہ صرف نوجوانوں کی سی زندگی جیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو حرکتیں بھی نوجوانوں سی کرتے ہیں ۔ 73 برس کی عمر میں چودہ برس کی عمر والا قہقہہ لگاتے ہوئے میں نے یوسف ناظم کو ہی دیکھا ۔ اپنی باتوں پر مجھے کبھی ہنسی نہیں آتی ۔ یوسف ناظم اپنی ہی باتوں پر بے ساختہ ہنسنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی چست فقرہ ان کی نوک زبان پر ہوتا ہے اور فقرہ بھی ایسا جس سے بھلے ہی ان کی اپنی دِل آزاری ہوتی ہو تو ہو لیکن دوسرے کی دل آزاری نہ ہونے پائے ۔ وہ فقروں کے وزیر اعلیٰ نہیں بلکہ وزیر اعظم ہیں ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے ذہین اور دلچسپ فقروں کی مدد سے اپنے مضمون کا محل تعمیر کردیتے ہیں ۔ ان کا پورا مضمون جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے بیا کے گھونسلے کا خیال آجاتا ہے ۔ جس طرح بیا اِدھر اُدھر کے چھوٹے بڑے تنکے جمع کر کے ایک مضبوط گھونسلہ تعمیر کردیتی ہے اسی طرح یہ اپنے مضمون کا تانا بانا بنتے ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیا اپنے گھونسلے میں تنکوں سے ہٹ کر بریکٹوں کا استعمال نہیں کرتی (کیونکہ بیچاری بیا بریکٹوں کا استعمال جانتی ہی نہیں) جب کہ یوسف ناظم اپنے مضمون میں بریکٹوں کا

استعمال خوب کرتے ہیں ۔ وہ اپنی تحریر میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بے
تکان بریکٹ لگاتے چلے جاتے ہیں (ان کے مضامین میں بریکٹوں کی آمد ہوتی
ہے آورد نہیں) اردو کے سارے ادیبوں نے مل کر اپنی تحریروں میں اتنے
بریکٹ نہیں لگائے ہونگے جتنے اکیلے یوسف ناظم نے اپنی تحریروں میں لگائے
ہیں ۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں زیادہ تر افسانے ڈیش dashes کی مدد سے
لکھے جاتے تھے ۔ رومانی افسانوں کا دور آگیا تھا لیکن اخلاقی اقدار ابھی باقی تھیں ۔
لہٰذا افسانہ کے کسی خاص موڑ پر افسانہ نگار جب ڈیش لگاتا تھا تو رومان کے نازک
ترین اسرار و رموز خود بخود ہویدا ہوجاتے تھے ۔ ہیرو، اس ڈیش کی آڑ میں اپنی
ہیروئن سے بغل گیر ہوتا تھا اور اس ڈیش میں وہ وصل کی لذتوں سے ہم کنار ہوتا
تھا ۔ سماج نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ کھلے بندوں یہ پوچھ بیٹھتا کہ "چولی
کے پیچھے کیا ہے ؟" ۔ غرض اس زمانہ میں لفظوں میں اتنی ترسیل نہیں ہوتی تھی
جتنی کہ ڈیشوں میں ہوتی تھی ۔ افسانہ سو صفحوں کا ہوتا تھا تو اس میں لگ بھگ
پچاس صفحوں کے ڈیش استعمال ہوتے تھے ۔ ڈیشوں کی ایسی فضول خرچی کبھی
نہیں دیکھی تھی ۔ جب کاغذ کے دام بڑھنے لگے تو افسانوں کی رومانی فضاء خود بخود
کم ہوتی چلی گئی ۔ اور آج ڈیش ہمارے ادب سے تقریباً غائب ہوچکے ہیں ۔ (سماج
کی آنکھ کا پانی جو مرچکا ہے) اس خلا کو پر کرنے کے لئے یوسف ناظم نے بریکٹوں
کو زحمت دی ۔ وہ بریکٹوں کے بھلے ہی موجد نہ ہوں لیکن ان کے استعمال پر
انہیں جو قدرت حاصل ہے وہ کسی کے حصہ میں نہ آئی (میں نے اپنی تحریر میں
جب بھی بریکٹ لگانے کی کوشش کی میری تحریر بریکٹ سے باہر نکل آئی)

یوسف ناظم ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں بھرپور زندگی جینے کا سلیقہ آتا ہے
۔ وہ جامعہ عثمانیہ کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو مخدوم ، میر حسن ، شنکر جی ،
ظفر الحسن ، اشفاق حسین اور سکندر علی وجد کے فوراً بعد نمودار ہوئی تھی ۔ ان کے
اپنے ہم عصروں میں عابد علی خان ، خواجہ حمید الدین شاہد ، ہاشم علی اختر ، محبوب
حسین جگر ، میکش ، لطیف ساجد وغیرہ رہے ہیں ۔ لیکن یوسف ناظم نے اپنے ہم
عصروں کے سہارے ہی زندہ رہنے کو کافی نہیں سمجھا ۔ جامعہ عثمانیہ نے بعد میں

اردو کی جتنی نسلیں پیدا کیں ان سے انہوں نے نہایت دوستانہ مراسم قائم کئے۔ جن لوگوں نے عزیز قیسی، وحید اختر، شاذ تمکنت، قاضی سلیم اور انور معظم وغیرہ سے (جو ان سے بہت جونیر رہے ہیں۔) یوسف ناظم کی بے تکلفی دیکھی ہے۔ وہ اوّل الذکر اصحاب کو یوسف ناظم کا ہم مکتب سمجھتے ہیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ حد ہوگئی کہ بعض لوگ تو انھیں اب مزاح کار دولت رام کا بھی ہم مکتب سمجھنے لگے ہیں (اس بہانے دولت رام کو بھی مکتب میں جانے کی سعادت حاصل ہوگئی ہے) یوسف ناظم اصل میں جامعہ عثمانیہ کے فرزند ہی نہیں ہیں بلکہ جامعہ عثمانیہ کا ایک تسلسل بھی ہیں۔ حیدرآبادی تہذیب کی بقا کی علامت ہیں۔

یوسف ناظم نے آج سے پچاس برس پہلے غالباً شاعری سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاعری تو انہوں نے صرف "ضرورت شعری" کے تحت کی تھی، مگر اس لمبے تخلیقی سفر کے بعد اب یوسف ناظم کی سب سے بڑی اور اکیلی پہچان ایک منفرد مزاح نگار کی ہے۔ مزاح نگار کی حیثیت سے پہچانے اور جانے جاتے ہیں۔ اردو کے اچھوتے شاعر اور بے مثال مزاح نگار ابن انشا کا جب انتقال ہوا تو خلیل الرحمن اعظمی نے ان کی یاد میں ایک مضمون لکھتے ہوئے ایک جملہ اس طرح کا بھی لکھا تھا "افسوس کہ اردو کے ایک منفرد شاعر کو پاکستان کے اہلِ ادب نے اسے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے رخصت کیا"۔ خلیل الرحمان اعظمی مرحوم کے اس جملے پر میں نے ان سے خاصی بحث کی تھی اور بعد میں وہ ابن انشا کی مزاح نگار والی شناخت سے مطمئن ہوگئے تھے۔ ایک بار یوسف ناظم سے کسی نے کہا تھا "مزاح نگاری دوسرے درجہ کا ادب ہے۔" اس پر یوسف ناظم نے کہا تھا "اس لئے کہ اردو میں پہلے درجہ کا ادب لکھا ہی نہیں جاتا"

یوسف ناظم ہمارے کلاسیکی ادب کی بہترین روایات کے امین ہیں اور اگر مزاح نگاری دوسرے درجہ کا ادب ہے تو یوسف ناظم بلاشبہ اس دوسرے درجہ کے ادب کے پہلے درجہ کے ادیب ہیں۔ میں یوسف ناظم کو ان کے تخلیقی سفر کے پچاس سال مکمل ہونے پر سلام کرتا ہوں۔ (مجھے یقین ہے کہ اس کے

جواب میں وہ مجھے "وعلیکم السلام ضرور کہیں گے) آخر میں ایک بریکٹ اور برداشت کرلیں (یوسف ناظم پر کالم لکھنے کا ہی یہ فیضان ہے کہ اس کالم میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بریکٹ راہ پا گئے ہیں ۔ ذرا گن کر تو بتلائیے) ۔

(نومبر / ۱۹۹۲ء)

اردو پہ مرنا۔ اردو میں مرنا

دو ڈھائی مہینے پہلے اردو کے ممتاز عالم اور مستند محقق ڈاکٹر تار اچرن رستوگی کا گوہاٹی میں انتقال ہوگیا۔ اس پر اردو کے ایک اور بڑے عالم، محقق اور ہمارے دوست پروفیسر نثار احمد فاروقی سخت خفا ہیں، برہم ہیں، مشتعل ہیں، طیش میں ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ ان کا یہ شدید غصہ اس بات پر نہیں ہے کہ ڈاکٹر رستوگی کیوں انتقال کرگئے (مشیت ایزدی کے آگے کس کی چلی ہے) بلکہ ان کی خفگی اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کا انتقال فروری کے آخری ہفتے میں گوہاٹی میں ہوا، لیکن اردو دنیا کو ان کے اٹھ جانے کی اطلاع پورے دو مہینوں بعد ہوئی۔ وہ اس طرح کہ کلکتہ کے رسالہ "انشاء" کے اڈیٹر نے ڈاکٹر رستوگی کو کسی مسئلے پر دو چار ضروری خط لکھے تو ڈاک خانہ والوں نے تنگ آکر مدیر "انشاء" کو لکھا کہ قبلہ! مستقبل میں آپ اس پتہ پر خط لکھ کر اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کریں کیونکہ مکتوب الیہ فوت ہوچکا ہے۔

اتنی سی بات پر نثار احمد فاروقی ناراض ہوئے تو ناراض ہوتے ہی چلے گئے۔ یوسف ناظم نے بہت عرصہ پہلے باقر مہدی کے بارے میں لکھا تھا کہ "وہ علم کی اس بلندی پر ہیں جہاں خود علم کے پہنچنے میں ابھی دیر ہے"۔ یہی بات پروفیسر نثار احمد فاروقی پر بھی صادق آتی ہے۔ چنانچہ ان کے علم کی وجہ سے ہم ان کے غصے کو بھی برداشت کرلیتے ہیں۔ تاراچرن رستوگی کے گزر جانے پر ان کا غیظ و غضب سے بھرا ہوا ایک خط "ہماری زبان" میں شائع ہوا ہے جس کے کچھ اقتباسات ہم ذیل میں پیش کررہے ہیں۔

"مجھے اس خبر سے کتنا صدمہ ہوا اور کتنا دکھ پہنچا ہے بیان نہیں کرسکتا۔

مجھے خود کو اس زبان کے اہلِ قلم میں شمار کرنے سے شرم آتی ہے جو اپنے اتنے بڑے اسکالر کو اس طرح گمنامی اور بے کسی کے عالم میں مرنے دے اور جس کے خود ساختہ چودھری منظرنامہ بدلنے میں اور اپنی شہرت کو جمانے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ کیسے رنج کی بات ہے کہ ایک ایسا عالم ۸۰ سال کی عمر میں کینسر کے مرض میں مکمل تنہائی اور کسمپرسی میں انتقال کرجائے اور دو مہینے تک ادھر کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ ہندوستان کا کوئی بھانڈ اگر ٹمبکٹو میں بھی مرتا تو یہاں کے اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سب برہ کے گیت گارہے ہوتے۔ لعنت ہے اس سماج پر جہاں ایسے لوگوں کا یہ حشر دیکھنے کو ملے "

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کے انتقال کی خبر پڑھ کر ہمیں بھی دکھ ہوا۔ کیونکہ آنجہانی سے ہمارے بھی تھوڑے بہت مراسم تھے۔ یقیناً وہ بے نیاز آدمی اور ایک بڑے اسکالر تھے لیکن آج کے زمانے میں صرف بڑے اسکالر ہونے سے کیا ہوتا ہے؟۔ آج کے زمانے میں زندہ رہنے کے لئے بڑے اسکالر کے اندر ایک چھوٹے آدمی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یقین نہ آئے تو ہمارے نام نہاد بڑے اسکالروں کی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ بڑے آدمی کا چھوٹا پن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ فاروقی صاحب کو اصل غصہ اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر رستوگی کے انتقال کے پورے دو مہینوں بعد اردو والوں کو ان کے گزرنے کا علم ہوا۔ ان کا غصہ سر آنکھوں پر لیکن ہمیں یہ بتایئے کہ اگر ان کے گزر جانے کا علم اردو والوں کو بروقت ہو بھی جاتا تو وہ کیا کرلیتے؟۔ اب پروفیسر نثار احمد فاروقی کو کیسے سمجھائیں کہ آج کے اردو معاشرے میں زندہ رہنے کے لئے آدمی میں تھوڑی سی بے حسی اور کٹھورتا کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ہمیں دیکھئے

بارِ الم اٹھایا رنگ نشاط دیکھے
آئے نہیں ہیں یونہی اندازِ بے حسی کے

اردو میں اتنے برس تک لکھتے رہنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اردو کے ادیب کو بھلے ہی ادب تخلیق کرتے وقت تو ضرور حسّاس رہنا چاہیئے لیکن عملی زندگی میں بے حس بنے رہنا چاہیئے۔ اسی میں عافیت ہے۔ اردو معاشرہ

میں پہنچنے کی یہی تو باتیں ہیں ۔ تاراچرن رستوگی کا اردو والوں کو بتائے بغیر یا ان سے اجازت لیے بغیر دنیا سے گزر جانا کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ پندرہ سولہ برس پہلے اردو کے سب سے بڑے طنزنگار کنہیا لال کپور بھی اسی طرح دنیا سے چلے گئے تھے اور اردو والوں کو ان کے گزر جانے کے دو ہفتوں بعد خواجہ عبد الغفور مرحوم کی معرفت پتہ چلا تھا کہ اردو طنزنگاری کا قطب مینار گر گیا ۔ اس زمانے میں ہماری رگوں میں خون ذرا تیزی سے دوڑتا تھا اور ہم میں وہ بے حسی ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ماشاء اللہ آج ہمارے مزاج میں دکھائی دیتی ہے ۔ ہم نے بھی اس بات کا بڑا واویلا مچایا تھا ۔ پوری اردو دنیا کو جھنجھوڑا کہ لعنت ہے تم پر کہ اردو کا اتنا بڑا طنزنگار تم میں سے اٹھ گیا اور تمھیں اسکی خبر نہ ہو سکی ۔ اس وقت ہم بھی اس معاملے میں نثار احمد فاروقی بنے ہوئے تھے ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک دن عمیق حنفی مرحوم سے ہماری ملاقات ہوگئی تو انھوں نے ہو بہو ہم سے وہی سوال پوچھا تھا جو آج ہم نثار احمد فاروقی سے پوچھ رہے ہیں کہ میاں اگر تمھیں ان کے انتقال کی خبر بر وقت مل جاتی تو تم کیا کرلیتے ۔ کیا تم بھی مرجاتے ؟ اس پر اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے ۔ کنہیالال کپور بڑے طنزنگار تھے اور اس بہانے دنیا کو اچھی طرح سمجھتے تھے ۔ وہ مرگئے اور لوگوں کو بروقت پتا نہیں چلا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ وہ ان ادیبوں سے تو ہزار درجہ بہتر تھے جن کے انتقال کی خبر بروقت اخباروں میں چھپتی ہے تو پڑھنے والوں کو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ارے کمال ہے یہ تو اب تک زندہ تھے ۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ کب کے مرچکے ہیں کنہیالال کپور تو آخر وقت تک اپنے زندہ رہنے کا ثبوت دیتے رہے ۔ عمیق حنفی ہمارے ان دوستوں میں سے تھے جن کی باتیں سننے کے بعد دل کو قرار آجاتا تھا ۔ سو ہمیں بھی قرار آگیا ۔ اس کے بعد ہم نے کبھی بھی کسی ادیب کے قبل از وقت یا بعد از وقت مرنے کی شکایت نہیں کی ۔ یوں بھی اردو معاشرہ میں ان دنوں زندہ رہنا اور مرنا دونوں برابر ہیں ۔ ہمیں وہ پرانا لطیفہ یاد آیا کہ ایک بزرگ شکاری اپنے شکار کا کوئی قصہ سنا رہے تھے ۔ کہنے لگے ۔ میں جنگل سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک شیر نے مجھ پر حملہ کردیا ۔ اس وقت میری بندوق میں کارتوس بھی

نہیں تھے ۔ شیر بہرحال شیر ہوتا ہے ۔ اس نے مجھے پچھاڑ دیا اور میرے حلق پر اپنے نوکیلے دانت رکھ دیے ۔ پھر وہ میرا سارا خون پی گیا ۔" سننے والوں نے پوچھا " پھر کیا ہوا ؟" شکاری نے کہا " ہونا کیا تھا ۔ پھر میں مر گیا " سننے والوں نے کہا " حضرت یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ آپ تو ابھی زندہ ہیں ۔ اور اپنے مرنے کا قصہ سنا رہے ہیں " ۔ اس پر شکاری نے ایک سرد آہ بھری اور کہا " میاں یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔"

دیکھا جائے تو ان دنوں اردو کے بہت سے ادیب اور فنکار بھی مذکورہ شکاری کی طرح ہی زندہ ہیں ۔ یہ وہ لاشیں ہیں جنھیں اٹھانے والا کوئی نہیں مل رہا ہے ۔ یوں بھی ادیبوں اور فنکاروں کی موت کئی سطحوں پر ہوتی ہے ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے بعض ادیبوں کی طبعی موت تو واقع ہو جاتی ہے لیکن ان کی " ادبی موت " کبھی واقع نہیں ہوتی ۔ دوسری طرف اکثر ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی " ادبی موت " تو پہلے واقع ہو جاتی ہے لیکن " طبعی موت " بعد میں واقع ہوتی ہے ۔ ایسے ادیب اور فنکار خال خال ہی ہوتے ہیں جن کی " ادبی " اور " طبعی " موتیں ساتھ ساتھ ہی واقع ہوتی ہیں ۔

تاہم ہمارا خیال ہے کہ تاراچرن رستوگی کے انتقال سے ہمیں کچھ نہ کچھ سبق تو لینا ہی چاہیے ۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو چاہیے کہ ان کا آخری وقت قریب آتا دکھائی دے تو وہ اس کی اطلاع اپنے چاہنے والوں کو ضرور دیں ۔ دوسری طرف اردو کے بہی خواہوں کا بھی فرض ہے کہ اپنے ادیبوں اور شاعروں کی وقفے وقفے سے خبر لیتے رہیں ۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اردو ادیبوں اور شاعروں کا ایک " رجسٹر حاضری " رکھا جائے جس میں ان کے موجود ہونے کی ہر روز اطلاع درج کرائی جاتی رہے ۔ تاہم اتنا تو ہونا چاہیئے کہ کبھی کبھار ان کی حاضری لے لیا کریں ۔ ہماری مراد ہے خیریت پوچھ لیا کریں ۔ تاراچرن رستوگی کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ آخری عمر میں بالکل تنہا رہ گئے تھے اور گوہاٹی جیسے مقام پر رہتے تھے جہاں پر دور دور تک اردو بولنے والے نظر نہیں آتے ۔ اگر خدانخواستہ ہم بھی اپنی کتابیں اور کاغذ قلم لے کر مئی جون کے مہینے میں ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ کر بیٹھ جائیں

اور وہاں تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہوجائیں تو ہمارے موجود ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع پورے آٹھ دس مہینوں بعد اس وقت ملے گی جب کوئی جاپانی، جرمن یا برطانوی کوہ پیماؤں کی ٹیم ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے ارادے سے آئے گی۔

اردو ایک زمانے میں سارے ملک میں پائی جاتی تھی۔ لیکن اب جزیروں میں پائی جانے لگی ہے۔ مانا کہ اس کے کچھ جزیرے تو امریکہ اور یورپ میں بھی موجود ہیں لیکن اس بات سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ اردو معاشرے میں اب منظم ہونے کے آثار کم اور منتشر ہونے کے آثار زیادہ نمایاں ہونے لگے ہیں۔ ان حالات میں اردو والوں کو بڑے جتن کے ساتھ اپنی بقا کے علاوہ اپنی زبان کی بقا کے بارے میں بھی سوچنا چاہیئے۔ (۱۹۹۷ء)

کہانی کب ختم ہونی چاہیئے

ایک ادبی محفل میں ہم دیر سے پہنچے ۔ ایک افسانہ نگار نے اسی وقت اپنی کہانی ختم کی تھی اور اس پر بحث کا آغاز ہو چکا تھا ۔ افسانہ نگار پر ہر گوشہ سے لعن طعن ہو رہی تھی کہ اس نے کہانی کو اچانک کیوں ختم کردیا ۔ حالانکہ کہانی مزید جاری رہ سکتی تھی ۔ لوگوں نے جب کہانی کے اچانک ختم ہونے پر بہت شور مچایا تو افسانہ نگار نے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی کہ اس کے اندر اتنی ہی کہانی تھی جو باہر آسکتی تھی ۔ لوگ اس پر بھی مطمئن نہیں ہوئے اور اپنی جرح جاری رکھی تو بیچارے افسانہ نگار نے سٹپٹا کر ہتھیار ڈال دیے اور اعتراف کیا کہ "حضرات ! میں اس کہانی کو یہیں ختم کرنے پر مجبور تھا کیونکہ میں جس علاقہ میں رہتا ہوں وہاں بجلی کی " لوڈشیڈنگ " ہوتی رہتی ہے ۔ رات میں گیارہ بجے سے صبح تک میرے علاقہ میں بجلی بند رہتی ہے ۔ دس بجے رات تک کہانی میرے قابو میں نہیں آئی تھی ۔ پھر بھی میں لکھتا چلاگیا ۔ گیارہ بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے ۔ تب میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے مجھے اپنی کہانی کو ختم کردینا چاہیے ۔ وقت بہت کم تھا اسی لئے میں نے روشنی کے رہتے رہتے کہانی کے ہیرو اور ہیروئن دونوں کو ہلاک کردیا ۔ میں مجبور تھا "۔ ایک صاحب نے کہا " ہیرو اور ہیروئن کو رات کے گیارہ بجے سے پہلے ہلاک کرنے کی اتنی عجلت کیا تھی ۔ آپ چاہتے تو صبح میں اجالا ہونے کے بعد انھیں اطمینان قلب کے ساتھ بھی ہلاک کر سکتے تھے " ۔ افسانہ نگار نے کہا " بات دراصل یہ تھی کہ دوسرے دن صبح کی ٹرین سے میرے خسر صاحب الہ آباد سے آنے والے تھے ۔ گاڑی صبح چھ بجے آتی ہے ۔ مجھے اسٹیشن بھی جانا تھا " کسی نے کہا " گویا آپ نے

کہانی کب ختم ہونی چاہیے

اپنے خسر صاحب کی خاطر اپنی کہانی کے معصوم کرداروں کو ہلاک کردیا " ۔ " تو کیا میں اپنے خسر صاحب کو ہلاک کردیتا ؟ " افسانہ نگار نے پوچھا ۔ ایک صاحب بولے " ادب ایک سنجیدہ عمل ہے ۔ کوئی تخلیق یونہی نہیں پیدا ہوتی ۔ خونِ دل میں اپنی انگلیاں انگوٹھا سمیت ڈبونی پڑتی ہیں ۔ انگلیاں فگار ہوجاتی ہیں اور خامہ خونچکاں ہوجاتا ہے ۔ جنوں کی حکایت لکھنے میں تو ہاتھ تک قلم ہوجاتے ہیں ۔ بعض اوقات تخلیق کار خود مر جاتا ہے تو تب کہیں جا کر تخلیق پیدا ہوتی ہے ۔ جو فنکار اپنے خسر صاحب کے لئے اپنی کہانی کا خون کردے اسے افسانہ لکھنے کا کوئی حق نہیں ہے " ۔ ایک اور صاحب افسانہ نگار سے یوں مخاطب ہوئے " اپنی کہانی کے سلسلہ میں آپ اپنے خسر صاحب کا ذکر یوں کررہے ہیں جیسے ان کے آنے کے بعد آپ افسانہ لکھ ہی نہیں سکتے تھے ۔ ان کے آنے کے بعد بھی آپ اطمینان سے کہانی کے کرداروں کو ہلاک کرسکتے تھے ۔ "

افسانہ نگار نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا " آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ۔ میں نے اپنے خسر صاحب کو ہمیشہ اپنے ادب سے دور رکھا ہے ۔ ادب میری زندگی ہے ۔ ادب کے سامنے خسر کی کیا حیثیت ہے " ایک شریر صاحب نے کہا " ٹھیک ہے ہم اس کی اطلاع آپ کے خسر صاحب کو اب دے دیں گے " ۔

" ضرور دیجئے میں اپنے خسر صاحب سے نہیں ڈرتا " ۔ " پھر آپ نے ان کی آمد کے ڈر سے اپنی کہانی کے کرداروں کو کیوں ہلاک کردیا ؟ " ۔ افسانہ نگار بولا " آپ لوگ میری پوری بات سن ہی نہیں رہے ہیں ۔ اصل بات یہ تھی کہ میں نے ایک رسالہ کے ایڈیٹر کو اس دن صبح میں نو بجے اپنی کہانی دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ رسالہ کی آخری کاپی اسی دن جانے والی تھی ۔ رسالہ کے ایڈیٹر نے بطور خاص کاتب کو بلا رکھا تھا ۔ اگر میں اسے نو بجے تک کہانی نہ دیتا تو رسالہ کی اشاعت میں تاخیر ہوجاتی ۔ ظاہر ہے کہ اسٹیشن سے خسر صاحب کو ریسیو کر کے گھر لانے تک ساڑھے آٹھ بج گئے ۔ وہ بھی اس لئے کہ اس دن گاڑی لیٹ نہیں تھی ۔ اس لئے مجھے رات گیارہ بجے بجلی کے بند ہونے سے پہلے ہی ان کرداروں کو ہلاک کرنا

پڑا۔ یہ افسانہ نگار نہیں قاتل ہے قاتل۔ خطرناک مجرم ہے مجرم" کسی نے فقرہ کسا۔

افسانہ نگار پر چاروں طرف سے حملے ہونے لگے تو اس نے کہانی کے کاغذات سمیٹے اور ڈائس سے اتر کر جاتے جاتے کہا" آپ چاہے کچھ بھی سمجھیں۔ میں نے اپنی کہانی کے اختتام کے بارے میں کھلے دل سے ساری بات واضح کردی ہے۔ مجھے اس کے سوائے کچھ نہیں کہنا ہے" ۔ یہ کہہ کر افسانہ نگار چلا گیا اور محفل افراتفری میں ختم ہوگئی۔

اس محفل میں شرکت کرنے کا ایک فائدہ ہمیں یہ پہنچا ہے کہ اب ہم ادب اور زندگی کے نازک رشتہ کو سمجھنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ رہی کہانی کی بات تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ کوئی کہانی کار اپنی کہانی کو کہیں بھی ختم کردے زندگی کی کہانی کبھی ختم نہیں ہونے والی ہے۔ کروڑوں برس سے انسان کی کہانی روپ بدل بدل کر چلتی ہی چلی جارہی ہے ۔ اگر چہ ہر فرد خود اپنی جگہ ایک الگ کہانی ہے۔

افراد کی کہانیاں تو ختم ہو جاتی ہیں لیکن انسان کی کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی ۔ مگر جوں جوں ماہ و سال کی گردش بڑھتی جارہی ہے ۔ بعض کہانیاں ہمارے بیچ سے غائب ہوتی جارہی ہیں ۔ دو تین برس پہلے کی بات ہے ۔ چودھویں تاریخ کا صاف و شفاف چاند آسماں پر چمک رہا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم اپنے آنگن میں ایک پلنگ پر لیٹے اپنے نواسے کو جو اس وقت تیسری جماعت میں پڑھتا تھا ۔ ادھر ادھر کی کہانیاں سنارہے تھے ۔ ہمیں اچانک وہ پرانی کہانی یاد آگئی جس کے مطابق چاند میں ایک بڑھیا بیٹھی چرخہ چلارہی ہے ۔ اور آسمان پر یہ جو بادل کے ٹکڑے پھیلے ہوئے ہیں وہ اصل میں اس روئی کے گالے ہیں جو بڑھیا کے چرخہ سے نکلے ہیں۔ ہم نے کہانی سنانی شروع کی تو ہمارے نواسے نے ہمیں فوراً ٹوکتے ہوئے کہا" آپ بھی کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی کچھ برس پہلے تو نیل آرم اسٹرانگ وغیرہ چاند پر جا کر آئے ہیں۔ انھیں تو وہاں کوئی بڑھیا نہیں ملی ۔ وہاں تو کوئی زندگی ہی نہیں ہے۔ آپ کو اصل میں نیند نہیں آرہی ہے ۔ تبھی تو ایسی

بے تکی اور اوٹ پٹانگ کہانیاں سنا رہے ہیں ۔ آپ سوئیں نہ سوئیں ۔ میں تو سو رہا ہوں ۔ خدا حافظ"

اس رات ہمیں سچ مچ نیند نہیں آئی ۔ محض اس خیال سے کہ وہ بڑھیا جو صدیوں سے چاند میں چرخہ چلا رہی ہے اب اس کی کہانی ختم ہونے کو ہے ۔ اس دن سے چاند کی یہ بڑھیا ہمارے وجود میں کچھ زیادہ ہی چرخہ چلا رہی ہے ۔

(۲۶ / دسمبر ۱۹۹۳ء)

اردو یونیورسٹی اور سہرا بندی

پچھلے دنوں اردو کے ایک بہی خواہ کا ایک درد بھرا مراسلہ ہماری نظر سے گزرا ہے جس میں مراسلہ نگار نے حیدرآباد میں مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسٹی کے قیام کے حوالہ سے یہ شکایت کی ہے کہ اب جب کہ اس یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوگیا ہے تو مختلف اصحاب اور ادارے اس دعوی کے ساتھ میدان میں کود پڑے ہیں کہ اس یونیورسٹی کے قیام کا سہرا انکے سر باندھا جائے۔ مراسلہ نگار نے اس ضمن میں بعض اصحاب اور جماعتوں کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ پوچھا ہے کہ کیا اس یونیورسٹی کے قیام کا سہرا کسی کے سر باندھنا نہایت ضروری ہے اور اگر یہ عمل ضروری ہے تو پھر یہ سہرا کس کے سر باندھا جائے۔ مراسلہ نگار نے جس درد بھرے دل کے ساتھ یہ سوال پوچھا ہے اسکے پیچھے چھپے ہوئے جذبہ کی ہم دل و جان سے قدر کرتے ہیں اور اس مشکل کو حل کرنے کی خاطر اس نیک کام کے لیے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ ہم خود اپنا سر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ یوں بھی ہم نے زندگی میں صرف ایک ہی بار سہرا بندھوایا ہے۔ (مزید تین سہروں کے بندھوانے کی گنجائش اب بھی موجود ہے) سوچا کہ جہاں اردو یونیورسٹی کے قیام کا سہرا بندھوانے کے لیے اتنے سارے امیدواروں کے سر میدان میں موجود ہوں وہاں ہم اپنا سر بھی کیوں نہ پیش کردیں۔ اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائیں کیوں۔ مجنوں سے کسی نے بادشاہ کی جانشینی کے بارے میں پوچھا تھا کہ " میاں بتاؤ بادشاہ کے جانشین کی حیثیت سے کس کا دعوی ثابت ہوتا ہے؟ " اس پر مجنوں نے کہا " بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بادشاہت کی اصل حقدار تو میری لیلیٰ ہی ہے "۔ مجنوں

تو خیر پرانے زمانے کا عاشق تھا۔ لیلیٰ کے عشق میں اتنا ڈوب چکا تھا کہ بادشاہت پر خود اپنا حق جتانے کی جرات نہ کرسکا اور لیلیٰ کے حق میں دستبردار ہوگیا لیکن زمانہ اب بدل گیا ہے۔ ہر کوئی اتنی آسانی سے اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ خدانخواستہ مجنوں اگر آج زندہ ہوتا تو نہ صرف لیلیٰ کے حقوق کو سلب کرلیتا اور اسکی جائیداد بھی ہڑپ کرلیتا بلکہ کیا عجب ہے کہ اب تک اسے طلاق بھی دے چکا ہوتا۔ ماضی کے بہت سے عشق صرف اسلئے مشہور ہوئے کہ وہ آج کے زمانے میں وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو موجودہ ماحول میں اگر کوئی انصاف پسند انسان اردو یونیورسٹی کے قیام کا سہرا خود اردو زبان کے سر باندھنے کی کوشش کر بیٹھے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ یونیورسٹی کے قیام کا سہرا بندھوانے کے خواہشمند امیدوار کہیں اردو زبان کا ہی سر نہ قلم کردیں کیونکہ ان دنوں اردو کے بیشتر بہی خواہوں کا وطیرہ یہ ہے کہ اردو زبان کی ترقی ہو یا نہ ہو خود انکی شخصی ترقی ضرور ہونی چاہئے۔ بہر حال اب جب کہ ہم نے اردو یونیورسٹی کے قیام کیلئے اپنا سر پیش کردیا ہے تو اس میں کسی کو اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ اس دعوی کے معاملہ میں ہمارا یہ استدلال ہے کہ نوجوانی میں ہم نے ایک اردو یونیوسٹی سے گریجویشن کیا تھا اور ہمارا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی تھا۔ اگرچہ ہم سراپا عجز و انکسار ہیں لیکن پھر بھی ہمارا یہ حقیر سا دعویٰ ہے کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کا سہرا بندھوانے کے کئی خواہشمند حضرات سے کہیں بہتر اردو جانتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو مقابلہ کرا کے دیکھ لیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ اتنا تو ہونا ہی چاہئے کہ جس کے سر اردو یونیوسٹی کا سہرا باندھا جائے وہ خود بھی تو اردو جانے۔ پھر ہمارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ پچھلے چالیس برسوں سے ہم اردو میں قلم گھسنے کے علاوہ اپنے آپ کو بھی گھس رہے ہیں۔ جیسا کچھ بھی لکھتے ہیں اسی زبان میں لکھتے ہیں۔ کسی اور زبان میں نہیں لکھتے (یہ الگ بات ہے کہ ہمیں کوئی اور زبان نہیں آتی) ہم مذکورہ بالا سہرے پر اپنا حق منوانے کیلئے اور بھی کئی دعوے پیش کرسکتے ہیں لیکن عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ یوں بھی ہم نے چالیس برس پہلے اپنی شادی کا سہرا بندھوایا تھا پھر اسکے بعد

کوئی سہرا نہیں بندھوایا! آپ چاہیں تو ہمارا ریکارڈ دیکھ لیں ۔ اب اگر کوئی سہرا بندھوانے کا جھوٹ موٹ بھی اشارہ کردے تو ہم اس لنگڑے بھکاری کی طرح انتظار کرنے کو تیار ہیں جو بھیک مانگنے کے ارادہ سے ایک گھر کے دروازہ پر گیا تو دیکھا کہ نند اور بھاوج میں زور دار لڑائی ہو رہی ہے ۔ لڑتے لڑتے ایک مرحلہ پر بھاوج نے نند کو دھمکی دی ۔" اگر تو راہ راست پر نہیں آئے گی تو میں تیری شادی اس لنگڑے بھکاری سے کروادونگی "۔ بعد میں تو خیر نند اور بھاوج لڑتے لڑتے اندر چلی گئیں اور انکا جھگڑا بھی تھم گیا لیکن بڑی دیر بعد گھر کے دروازہ سے اس بھکاری کی آواز آئی " بی بی ! آپ لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے ۔ میرے لئے کیا حکم ہوتا ہے ۔ ٹہروں یا چلا جاؤں ۔"

اصل میں سہرا بندھوانے کی روایت اردو تہذیب کی دین ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اچھے اچھے شاعروں نے شادیوں کے مواقع پر بے پناہ سہرے لکھے ہیں۔ استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق نے تو بہادر شاہ ظفر کے بیٹے جواں بخت کی شادی کے موقع پر سہرا لکھ کر ایک مصرعہ میں مرزا غالب کو للکارا تھا کہ

ع دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اسکے جواب میں مرزا غالب کی معاصرانہ چشمک نے زور مارا تو انھوں نے بھی سہرا لکھا اور مقطع میں ذوق کو یہ کہہ کر للکارا کہ

ع دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

غرض ہم نے کسی اور زبان کے شاعر کو کسی اور کی شادی کے موقع پر خوش ہو ہو کر سہرے کہتے ہوئے نہیں دیکھا ۔ دنیا بھر میں شادیاں ہوتی ہیں لیکن سر پر سہرا باندھنے کی روایت خالص ہندوستانی ہے ۔ ہمارے ایک جاپانی دوست نے ایک شادی میں دولہا کو سر سے پاؤں تک سہرے میں بندھا ہوا دیکھ کر پوچھا تھا "آخر دولہا نے اپنا منہ کیوں چھپا رکھا ہے ۔ اپنے چہرہ سے سہرے کو کیوں نہیں ہٹاتا " اس پر ہم نے اسے سمجھایا تھا کہ " بھیا شادی کے موقع پر چونکہ اکثر دولہے اپنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے اسی لئے سہروں میں ملفوف ہوجاتے ہیں "۔

اگر ہم نے اپنی تہذیب میں سہروں کو اتنی اہمیت نہ دی ہوتی تو آج اردو یونیورسٹی

کے قیام کی خاطر اپنے سروں پر سہرے بندھوانے کے خواہشمندوں کی اتنی بھیڑ نہ لگی ہوتی ۔ بیچاری اردو زبان کی یہ بد نصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ ان دنوں جو کوئی بھی اس کے لئے ذرا سا کام کرتا ہے تو فوراً اپنا سر سہرا بندھوانے کے لیے پیش کردیتا ہے ۔ اردو تو مرجھارہی ہے لیکن اسکے نام نہاد بہی خواہوں کے سہروں کے پھول کھلتے چلے جارہے ہیں ۔ ہم نے تو بعض سروں کے ناپ بھی پہلے سے لے رکھے ہیں کہ عین وقت پر سہروں کے بنوانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے ۔ مبادا ہم اسے سر سے باندھنے کی کوشش کریں تو کہیں سہرا گلے میں نہ آجائے ۔

سچ پوچھیے تو جب سے اس یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوا ہے ہمیں فرانس کی ملکہ میری انطونیت کی بے پناہ یاد آرہی ہے ۔ اس کے زمانہ میں جب فرانس میں بھیانک قحط پھیلا تو لوگوں نے میری انطونیت سے کہا "عوام کے پاس کھانے کےلیے روٹی تک نہیں ہے" اس پر میری انطونیت نے بڑی معصومیت سے جواب دیا تھا "اگر عوام کے پاس کھانے کیلئے روٹی نہیں ہے تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے ۔" اردو یونیورسٹی کا بھی یہی معاملہ ہے ۔ یونیورسٹی سے نیچے کے درجات میں تو اردو پڑھانے کاکوئی معقول بندوبست نہیں ہے ۔ تاہم طلباء سے کہا جارہا ہے کہ وہ بی ۔ اے کریں ۔ اگر بی اے نہیں کرنا چاہتے توکم ازکم پی ایچ ڈی کرلیں ۔ آپ کوکس نے روکا ہے ۔ گویا اردو والے بھلے ہی اردو کی روٹی نہ کھا سکیں اردو کا کیک توکھالیں ۔ افسوس تو یہ ہے کہ آزادی کے وقت اس ملک میں اردو کی ایک عالیشان یونیورسٹی موجود تھی جسے پہلے تو ختم کردیا گیا ۔ اب پچاس برس بعد پھر ایسی ہی یونیورسٹی بنانے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ یونیورسٹی نہ ہوئی بچہ کا بنایا ہوا ریت کا گھروندا ہوگیا کہ جب جی چاہا توڑ دیا اور جب جی چاہا بنادیا ۔

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض اصحاب نہ صرف اس یونیورسٹی کے قیام کا سہرا اپنے سر بندھوانا چاہتے ہیں بلکہ بعض اصحاب تو اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننے کے لیے دوڑ دھوپ کررہے ہیں ۔ وائس چانسلروں کے بارے میں

ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے ۔ کیونکہ خدا کے فضل سے ہمارے کئی بے تکلف دوست مختلف یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر بنے ہوئے ہیں ۔ دوستی کا حق نبھانے کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم خاموش رہیں تاہم ہمیں اس وقت مشہور شاعر حسن نعیم مرحوم یاد آگئے جو اردو کے بڑے طرح دار شاعر تھے ۔ لیکن تھے بے حد معصوم آدمی ۔ وزارت خارجہ کے عہدہ دار تھے لیکن کسی شاعرانہ ترنگ میں وزارت خارجہ سے مستعفی ہو گئے تھے ۔ آخری زمانے میں وہ بمبئی میں مقیم ہوگئے تھے جہاں انہوں نے غزل گانے والوں کی نئی نسل کو غزل گائیکی کی تربیت دینے کے لیے ایک " غزل کالج " کھول رکھا تھا ۔ ایک بار دہلی آئے تو ہمارے دفتر بھی آئے ۔ کسی مسئلہ پر انہوں نے ایک مراسلہ اپنے "غزل کالج " کے لیٹرپیڈ پر لکھ کر دیا جس کے بائیں طرف جلی حروف میں چھپا تھا " حسن نعیم پرنسپل غزل کالج " ۔ ہماری رگ ظرافت پھڑکی تو ہم نے حسن نعیم سے کہا " حسن نعیم صاحب آپکو گھاٹے کا سودا کرنے میں ہمیشہ لطف آتا ہے ۔ آپ کو غزل کالج قائم کر کے صرف پرنسپل بننے کی کیا مجبوری تھی ۔ اگر آپ نے غزل کالج کی بجائے غزل یونیورسٹی قائم کی ہوتی تو آج آپ اللہ کے فضل سے اسکے وائس چانسلر ہوتے " ۔ ہم نے سوچا تھا کہ حسن نعیم ہماری بات سے محظوظ ہونگے لیکن وہ اچانک سنجیدہ ہوگئے اور بولے " تم بالکل ٹھیک کہتے ہو ۔ میں تو بڑی آسانی سے وائس چانسلر بھی بن سکتا ہوں ۔ " بعد میں بعض مخلص احباب نے انھیں غزل یونیورسٹی کا لیٹر پیڈ چھپوانے سے منع کیا ورنہ وہ تو وائس چانسلر بننے چلے تھے ۔ اتنا کہہ کر ہم وائس چانسلروں کے بارے میں مزید کچھ نہیں کہیں گے ۔ جہاں تک اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے سہرا بندھوانے کا سوال ہے تو ہم نے مسابقت کی اس دوڑ میں اپنا سر بھی پیش کردیا ہے ۔ اب ہم اردو والوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ " اب آپ کا کیا حکم ہوتا ہے ۔ ٹھہریں یا چلے جائیں ؟ "

(۲۳ / مارچ ۱۹۹۷ء)

اُردو جیل میں پہنچ گئی

صاحبو! کچھ عرصہ پہلے ہم نے اسی کالم میں یہ خوش خبری سنائی تھی کہ اردو پھر گھروں میں واپس آرہی ہے۔ اب ایک اور خوش خبری آپ کو یہ سنانی ہے کہ اردو خدا کے فضل و کرم سے جیل میں پہنچ گئی ہے۔ آپ ضرور حیرت میں مبتلا ہوں گے کہ اردو جیل میں پہنچ گئی اور ہم اس اطلاع کو "خوش خبری" قرار دے رہے ہیں۔ دراصل ہماری حالت اس افیونی کی سی ہے جو سر شام اپنی ترنگ میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ دور سے اس کے کانوں میں آواز آئی "بچاؤ۔ بچاؤ" افیونی نے آواز کا تعاقب کیا تو دیکھا کہ ایک آدمی اندھے کنوئیں میں گرا ہوا ہے اور اس کے باہر نکلنے کے سارے امکانات بند ہیں۔ افیونی نے پہلے تو اس آدمی کی حالت کا اندازہ لگایا اور پھر اس سے کہیں زیادہ اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اپنی ترنگ میں یہ کہہ کر چلتا بنا "میاں، تم جہاں بھی رہو خوش رہو۔ میری یہی دعا ہے۔ خدا حافظ" ہمارا بھی اب یہی حال ہے کہ اردو جہاں بھی اور جس حالت میں بھی نظر آتی ہے اس کے حق میں یہی دعا کرتے ہیں "بڑی بی! تم جہاں بھی رہو خوش رہو۔ چاہے امریکہ میں رہو یا دوبئی میں، لندن میں یا جاپان میں"

اردو کے جیل میں پہنچنے کی اطلاع پر آپ یہ ضرور پوچھیں گے کہ اردو کا جُرم کیا ہے جو اسے جیل میں بھیج دیا گیا ہے۔ بھیا اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ان دنوں جیل جانے کے لئے کوئی جُرم کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بہت سے لوگ یونہی جیلوں میں بند ہیں۔ یوں بھی اردو ایک قصور وار زبان ہے۔ اس کا سب سے بڑا قصور تو یہ ہے کہ اس ملک کی آزادی کی جنگ اسی زبان میں لڑی گئی تھی۔ آزادی کی جد و جہد میں جتنے بھی لیڈر جیلوں میں بند ہوئے وہ یہی زبان بولتے ہوئے بند

ہوئے تھے ۔ لیڈر تو اپنی سزا جیلوں میں بھگت چکے بلکہ آزادی کے بعد تو یہ اونچی اونچی کرسیوں پر براجمان بھی ہوگئے تھے ۔ (کچھ تو اب بھی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں)۔ لیکن اس زبان کو ابھی تک قرار واقعی سزا نہیں دی گئی تھی ۔ آزادی کے پورے سینتالیس برس بعد بھی یہ زبان آزادانہ گھوم رہی تھی ۔ اب تو اسے جیل میں پہنچنا ہی تھا ۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انصاف میں دیر تو ہو سکتی ہے ۔ لیکن اندھیر نہیں۔

لیکن آپ نہ گھبرائیں اردو کو کسی جرم کی پاداش میں جیل میں بند نہیں کیا گیا ہے ۔ زبان اور کلچر دو ایسی چیزیں ہیں جنہیں سزا دینے کے لئے انہیں جیل میں بند کرنا ضروری نہیں ہوتا ۔ انہیں تو آزاد رکھ کر بھی کڑی سے کڑی سزا دی جا سکتی ہے ۔ تغافل سزائے موت سے بھی کہیں زیادہ سنگین سزا ہے ۔ اردو کے جیل میں جانے کی اب جو ہم یہ خوش خبری سنا رہے ہیں تو اس کا تعلق اصل میں اردو کی ان گرمائی کلاسوں سے ہے جنہیں کچھ عرصہ پہلے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے حیدرآباد میں زور و شور سے شروع کیا گیا تھا ۔ اس کا اثر ہندوستان کے دیگر علاقوں پر بھی پڑا ۔ دہلی کی اردو اکیڈیمی پہلے ہی سے اردو کی کلاسس چلاتی آئی ہے لیکن جوشِ جنون میں دہلی اردو اکیڈیمی کے سکریٹری اور ہمارے دوست زبیر رضوی نے اسے جیل میں بھی پہنچا دیا ہے ۔ زبیر رضوی اردو کے شاعر ہیں اور وہ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ اردو شاعری اور جیل کا آپس میں کیا تعلق ہے ۔ شاعری اور جیل کے تعلق کو تو چھوڑیئے ۔ ہمارے تو کچھ شاعر بھی مختلف جرموں کی پاداش میں بہ نفس نفیس جیل جا چکے ہیں ۔ حسرت موہانی جیل میں تھے تو انہوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رکھی تھی ۔ آٹا بھی اچھا پیستے تھے اور شعر بھی اچھے کہتے تھے ۔ لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ شعر سے بڑھیا ان کا پیسا ہوا آٹا ہوتا ہے یا آٹے سے بڑھیا ان کے شعر ہوتے ہیں ۔ جو کام بھی کیا سچے خلوص اور لگن سے کیا ۔ ہمارے فیض احمد فیض جیل آتے جاتے نہ رہتے تو اردو ادب کو "زنداں نامہ" نہ دے سکتے تھے ۔ مخدوم نے بھی جیل میں جاکر اچھی شاعری کی ۔ غالب چونکہ اپنی شاعری کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے اسی لئے غالب نے قمار بازی کے جرم میں حوالات کی ہوا کھانے کو ضروری سمجھا ۔ غرض جیل اور اردو شاعری کا رشتہ بڑا

پُرانا ہے ۔ زبیر رضوی نے سوچا کہ کیوں نہ جیل کے قیدیوں کو اردو پڑھائی جائے تاکہ انہیں پتہ چلے کہ گوشہ میں قفس کے کتنا آرام ہوتا ہے اور اگر قفس کے اس گوشہ کا انتظام پولیس کی مشہور زمانہ عہدیدار کرن بیدی کے ہاتھوں میں ہو تو کیا کہنے ۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ دلی کے مشہور زمانہ تہاڑ جیل میں جہاں بدنام زمانہ قیدی رہتے ہیں قیدیوں کے لئے اردو کلاسوں کا افتتاح عمل میں آیا ۔ اس موقع پر دلی کے وزیر جیل مسٹر ہرچرن سنگھ بلی اور انسپکٹر جنرل (جیل) مسز کرن بیدی بھی موجود تھیں ۔ تہاڑ جیل کی جیل نمبر ۴ سب سے بڑی جیل ہے اور اس جیل میں ۷۰ فیصد قیدی ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے (آدمی کو سزا مل جائے تو پھر وہ سچ بولنے لگتا ہے ۔ یہ قیدی ان آزاد شہریوں سے بدرجہا بہتر ہیں جو مردم شماری کے وقت حالات اور مصلحت کے دباؤ میں آکر اپنی مادری زبان اردو کی بجائے ہندی لکھوادیتے ہیں) اس جیل میں 300 قیدیوں نے اردو سیکھنے کے لئے ان کلاسوں میں داخلہ لیا ہے ۔ اور ان کلاسوں کے لئے دس ایسے پڑھے لکھے قیدیوں کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو باقی قیدیوں کو اردو پڑھا سکیں ۔ ان اساتذہ کو اردو اکیڈیمی دلی ماہانہ سو روپے معاوضہ بھی دے گی ۔ ان کلاسوں کے لئے قاعدے اور مفت اسٹیشنری بھی فراہم کی جارہی ہے ۔ مسز کرن بیدی نے اعلان کیا کہ اردو کی کلاسیس دلی کی دیگر جیلوں میں بھی شروع کی جائیں گی ۔ تہاڑ جیل میں اردو کی ایک لائبریری بھی کھولی جارہی ہے جس کے لیے اردو اکیڈیمی نے کئی اردو ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں بھی تحفہ میں دی ہیں ۔

جیل میں قیدیوں کو اردو پڑھانے کا بندوبست نہ صرف خوش آئند ہے بلکہ قیدیوں کے لئے فائدہ مند بھی ہے ۔ اردو شاعری واحد شاعری ہے جو قیدیوں کو قید و بند کی صعوبتوں سے لطف اندوز ہونے کا گُر سکھا سکتی ہے ۔ جب تک وہ اردو نہیں سیکھیں گے انہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ در قفس پر صبا کیسے کیسے پیامات لے کر آتی ہے ۔ بہت سے قیدیوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ صبا کیا چیز ہے اور اس کی مدد سے کیا کیا کام لیے جاسکتے ہیں ۔ پھر قید میں رہنے کا مطلب ہجر کی کیفیت سے گزرنا ہے اور خدا کے فضل سے ہماری شاعری میں ہجر کو کچھ ایسا بلند و

بالا مقام عطا کیا گیا ہے کہ بعض اردو شاعر تو وصل کے نام سے ہی گھبراتے ہیں اور اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ نعوذ باللہ اگر معشوق سے وصل کی نوبت آگئی تو ان کی شاعری کی عصمت لٹ جائے گی۔ قیدیوں کو صیاد، رہزن اور رہنما کے اصلی روپ کو سمجھنے میں بھی یہی شاعری مدد دے گی۔ ہمیں خوشی ہے کہ اردو جیلوں میں پڑھائی جارہی ہے۔ کیا عجب کہ کل کے دن یہ اسکولوں میں بھی پھر سے پڑھائی جانے لگے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرتے چلیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست کو جب یہ پتہ چلا کہ تہاڑ جیل کی لائبریری میں اردو کے شعری مجموعے بھی رکھے جانے لگے ہیں تو وہ کل اپنے منجملہ دس شعری مجموعوں کے نسخے اپنے ساتھ لے کر ہمارے پاس آگئے اور مصر ہوئے کہ ہم اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے ان کے شعری مجموعوں کو جیل کے اندر پہنچادیں تاکہ قیدی ان سے مستفیض ہو سکیں۔ ہم نے کہا "ہم اپنے اثر و رسوخ کا مظلوم قیدیوں کے خلاف بالکل استعمال نہیں کریں گے۔ انہیں جو بھی اور جتنی بھی سزا ملنی تھی وہ مل چکی ہے۔ اب ہم اس سزا میں مزید اضافہ کر کے توہین عدالت کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے"۔ ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے ہماری بات کا مطلب نہیں سمجھا اور پیہم اصرار کرتے رہے کہ ہم ان کے شعری مجموعوں کو کسی نہ کسی طرح جیل کے اندر پہنچا دیں۔ اس پر ہم نے پھر کہا "ہمیں ڈر ہے کہ اگر آپ کے مجموعے جیل کے اندر پہنچ گئے تو اکثر قیدی نقب لگا کر جیل سے بھاگنے کی کوشش کریں گے"۔ ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے تب بھی ہماری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

(۱۴ / اگست ۱۹۹۴ء)

اردو کی نئی بستیاں

ہمارے ایک دوست مشاعروں کے مقبول شاعر ہیں ۔ ان کے بغیر اردو شاعری کا تصوّر تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے بغیر کسی مشاعرہ کا تصور کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہیں آگ نہ لگی ہو اور آپ وہاں دھوئیں کو تلاش کرنے لگ جائیں ۔ اسی لئے وہ آئے دن مشاعروں میں آتے جاتے رہتے ہیں اور اپنے کلام بلاغت نظام اور بلوغت نظام دونوں سے سامعین کو خوش کرتے رہتے ہیں ۔ اردو کی نئی بستیوں جیسے خلیجی ممالک اور امریکہ وغیرہ میں جہاں جہاں اردو بولنے والے اپنی مادی ضرورتوں سے مجبور ہوکر آباد ہوگئے ہیں وہاں کے مشاعروں میں بھی اکثر بلائے جاتے ہیں ۔ پرسوں ہم سے ملے تو امریکہ میں اپنی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے " اس بار میں اپنے ساتھ ایک ایسا کمپیوٹر بھی لے آیا ہوں جو میری شاعری کیلئے بڑا فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے ۔ وہ ایسے کہ جب بھی کوئی نیا خیال یا کوئی نیا شعر میرے ذہن میں آتا ہے تو میں اسے کمپیوٹر کی " یادداشت " میں محفوظ کر لیتا ہوں اور فرصت پاتے ہی اسے باہر نکال لیتا ہوں "۔

ہم نے کہا " بھیاّ ! تم تو غالبؔ سے زیادہ خوش قسمت ہو ۔ غالبؔ کے ذہن میں جب بھی کوئی نیا شعر آتا تھا اور اتفاق سے ان کے آس پاس کاغذ قلم نہیں ہوتا تھا تو وہ یاد داشت کے طور پر اپنے ازار بند میں گرہ لگا دیتے تھے ۔ جتنے شعر ذہن میں آتے تھے ازار بند میں اتنی ہی گرہیں لگ جاتی تھیں ۔ بعد میں فرصت ملنے پر وہ ایک ایک گرہ کو کھولتے جاتے تھے اور مطلوبہ شعروں کو برآمد کر لیتے تھے "۔

اس پر ہمارے دوست نے کہا " اس معاملہ میں بھی میری خوش بختی افضل ہے کیونکہ غالبؔ جب ازار بند میں لگی ہوئی گرہوں کی مدد سے شعروں کو

برآمد کرتے ہونگے تو پہلے غزل کا مقطع برآمد ہوتا ہوگا اور سب سے آخر میں مطلع ان کے ہاتھ آتا ہوگا۔ میں تو کمپیوٹر کے بٹن کو دباکر ترتیب سے پہلے مطلع برآمد کرتا ہوں پھر مقطع کی باری آتی ہے۔ یہ سب اردو کی نئی بستیوں کی دین ہے"۔

سچ پوچھئے تو ہمارے شاعر دوست کا یہ اچانک خیال ہم تک اردو کی نئی بستیوں کے حوالہ سے ہی آیا ہے۔ کیونکہ ان دنوں اردو کی نئی بستیوں کا بڑا شہرہ ہے۔ اردو والے خوش ہیں کہ جہاں اردو کی پرانی بستیاں اجڑنے لگی ہیں وہیں خلیجی ممالک، برطانیہ، امریکہ اور کناڈا وغیرہ میں اردو کی نئی بستیاں بھی آباد ہونے لگی ہیں۔ چنانچہ ہمارے شعراء اور ادیب آئے دن ان بستیوں کے پھیرے لگانے لگے ہیں۔ خود ہمیں بھی ان بستیوں میں جانے کا موقعہ ملا ہے۔ ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی کے تازہ شمارہ میں اردو کے ادیب اور شاعر ستیہ پال آنند کا ایک فکر انگیز مضمون "اردو کی نئی بستیاں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ستیہ پال آنند پچھلے کئی برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ اگر چہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں لیکن اردو سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں اور اسی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے مذکورہ بالا مضمون لکھا ہے۔ انہوں نے امریکہ کی ایک اردو تنظیم کے سکریٹری اختر عباس اختر (نام فرضی ہے) کے حوالہ سے اردو کلچر اور اردو مشاعروں کے بارے میں لکھا ہے۔

" اختر عباس اختر اور ان کی بیگم ہی صرف آپس میں اردو بولتے ہیں جب کہ ان کے بچّے، ان کے ساتھ یا آپس میں یا دیگر اردو داں لوگوں کے ساتھ بھی انگریزی اور صرف انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں۔ کیا اردو کلچر نام کی اس چیز کی نشوونما کے لیے صرف ایک حیلہ یہی رہ گیا ہے کہ گاہے بگاہے مل کر شعر خوانی کرلی جائے۔ برصغیر سے کمرشیل سطح پر کھلاڑیوں، پہلوانوں یا قوالوں کی طرح گروپوں میں مدعو کیے گئے شعراء اور شاعرات سے ان کا کلام سنا جائے اور ایک شام زندگی کی گوناگوں مصروفیات میں سے نکال کر کلچر کی تشنگی کو تشفی میں بدل لیا جائے جبکہ بچے اردو رسم خط سے نابلد محض ہوں، اردو بولنے کو دردسر سے تشبیہ دیں۔ اردو لکھنا تو کجا اردو پڑھنا بھی پتھر کے زمانے کی عادت تصوّر کریں۔

یعنی بر صغیر سے دادا جان کا خط اردو میں آجائے تو دنیائے عجائبات کا ایک نمونہ سمجھ کر اسکول میں دوستوں کو یہ دکھانے کیلئے لے جائیں کہ ان کے آبا و اجداد کس عجیب ملک میں بستے ہیں، جہاں زبان بھی دائیں طرف سے بائیں طرف کو لکھی جاتی ہے"۔

ستیہ پال آنند نے اپنے ایک طالب علم کے ذریعہ امریکہ میں مقیم اردو بولنے والے تارکان وطن کے سات اور بارہ سال کی درمیانی عمر کے 78 بچوں کا ایک سروے بھی کیا جس کے مطابق صرف 28 بچے اردو بول لیتے ہیں۔ 9 بچے اردو پڑھ لیتے ہیں اور صرف 5 بچے اردو لکھ لیتے ہیں جب کہ گجراتی، پنجابی اور ہندی بولنے والوں کے بچوں کی اکثریت نہ صرف اپنی زبان بولنے پر قدرت رکھتی ہے بلکہ اسے پڑھ اور لکھ بھی لیتی ہے۔ انہیں اس پر حیرت ہے کہ صرف اردو بولنے والوں کے بچے ہی اس معاملہ میں کیوں پیچھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر اس وقت بر صغیر سے تارکان وطن کی بچوں سمیت آمد کو امریکہ میں روک دیا جائے تو ۲۰۱۲ء تک اردو بولنے والے لسانی گروپ کے بچوں میں اردو بولنے، پڑھنے اور لکھ سکنے کی قدرت بالکل عنقا ہو جائے گی۔ (گویا امریکہ میں آئے دن منعقد ہونے والے مشاعرے اس وقت تک بالکل برخاست ہو جائیں گے)۔

یہ تو رہی امریکہ میں مقیم اردو بولنے والوں کے بچوں کی صورتحال۔ اس معاملہ میں وہاں مقیم بڑے بھی کچھ کم پیچھے نہیں ہیں۔ اس ضمن میں ستیہ پال آنند نے ایک اور ریسرچ اسکالر ڈاکٹر احمد سہیل کے سروے کا حوالہ دیا ہے جنہوں نے نیویارک، واشنگٹن، شکاگو، ہوسٹن اور سانفرانسکو میں ایک سو خواتین اور حضرات کو اردو زبان و ادب سے متعلق ایک سوالنامہ ارسال کیا تھا۔ اس سوالنامہ کے جوابات سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں انھیں بلاشبہ مزاحیہ ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان سو افراد میں سے صرف ایک خوش نصیب کو میر تقی میرؔ کا کوئی شعر یاد تھا۔ غالبؔ کے ساتھ بھی ان لوگوں نے یہی سلوک کیا۔

75 افراد کرشن چندر کو بحیثیت شاعر جانتے تھے۔ صرف بارہ افراد نے انہیں افسانہ نگار مانا (کرشن چندر کو ہم جیسے چاہنے والوں نے ہزار بار کہا کہ وہ اتنی

خوبصورت نثر نہ لکھیں کہ اس پر شاعری کا گمان ہوا نے لگے ۔ وہ نثر میں شاعری ضرور کرتے تھے لیکن تھے تو نثر نگار ہی ۔ کسے پتہ تھا کہ امریکہ تک ان کی شہرت کے پہنچتے پہنچتے وہ شاعر بن جائیں گے) ان سو افراد میں سے 71 افراد نے راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں کہا کہ وہ ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان رہ چکے ہیں ۔ اگر بشن سنگھ بیدی کو کوئی غلطی سے اردو کا افسانہ نگار مان لے تو ذرا سوچئے انہیں کتنی ذہنی کوفت ہوگی ۔ دیکھا جائے تو راجندر سنگھ بیدی بروقت اس دنیا سے چلے گئے ۔ اگر خدا نخواستہ آج وہ زندہ ہوتے تو اپنے ہاتھوں میں قلم کی بجائے کرکٹ کی گیند کو پاکر نہ جانے ان پر کیا گزرتی ۔ پاکستان کی مشہور شاعرہ کشور ناہید کے بارے میں پچاس افراد نے کہا کہ وہ پاکستان کی گلوکارہ ہیں (اگر چہ کشور ناہید بھی اکثر امریکہ کے مشاعروں میں آتی جاتی رہتی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ترنم سے کلام نہیں سناتیں ۔ تاہم اس جواب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستانی گلوکارہ ناہید اختر ان سے کہیں زیادہ مرتبہ امریکہ جا چکی ہیں) ایسے اور بھی بہت سے دلچسپ جوابات ہیں جنہیں سن کر آپ کیا کریں گے ۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے امریکہ میں ہونے والے اردو مشاعروں کے بارے میں کہا ہے کہ ان مشاعروں کی تشکیل کچھ اسطرح ہوتی ہے ۔ مسخرے (مزاحیہ شاعر) ایک یا دو عدد ، ترنم سے پڑھنے والی شاعرات دو یا تین عدد ، ترنم سے پڑھنے والے شاعر چار یا پانچ عدد ، سچ مچ کے شاعر دو یا تین عدد ۔ بعض گلے باز شاعر تحت اللفظ میں شعر سنانے کا معاوضہ دس ڈالر فی غزل اور ترنم سے غزل سنانے کا معاوضہ چالیس ڈالر فی غزل لیتے ہیں ۔ بعض شاعرات Urdu language میں شعر سنانے کی بجائے اپنی Body Language کی مدد سے کچھ اس ڈھنگ سے شعر سناتی ہیں کہ مشاعرہ اور مجرے میں بہت کم فرق باقی رہ جاتا ہے ۔

ستیہ پال آنند چونکہ اپنے دل میں اردو کا درد رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ امریکہ میں مقیم اردو داں حضرات مشاعروں پر ہونے والے ہزاروں ڈالروں کے خرچ سے کچھ رقم بچا کر اگر اپنے بچوں کو اردو پڑھانے

کا بندو بست کر سکیں تو اردو کی ان نئی بستیوں میں اردو کا چلن بر قرار رہ سکتا ہے ورنہ دس بارہ برس بعد

دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اردو کی پرانی بستیوں میں رہنے والوں سے ہم پھر ایک بار یہ کہنا چاہیں گے کہ وہ صرف اس بات پر خوش ہونے کی کوشش نہ کریں کہ اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ علامہ اقبال بہت پہلے کہہ چکے ہیں کہ شاخ نازک پر جو آشیانہ بنتا ہے وہ ہمیشہ ناپائیدار ہوتا ہے۔ اس لئے ہوسکے تو اردو کی پرانی بستیوں کے علاوہ نئی بستیوں میں بھی نئی نسل کو اردو تعلیم سے روشناس کرانے کی ضرورت کو محسوس کیا جائے۔

(۱۹۹۸ء)

اردو اساتذہ اور اردو کا مستقبل

انگریزی روزنامہ " ہندوستان ٹائمز " میں کچھ عرصہ پہلے انگریزی کے مشہور صحافی رکشت پوری کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اردو کے ایک حالیہ سمینار کے حوالے سے اردو کی موجودہ صورتحال کے بارے میں نہایت اطمینان بخش اور دل خوش کن تصویر پیش کی گئی تھی ۔ اتفاق سے ہم نے بھی یہ کالم پڑھا تھا لیکن اس کے بارے میں کسی اظہار خیال کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں کی تھی کہ رکشت پوری انگریزی کے صحافی ہیں ۔ انگریزی جیسی خوشحال زبان میں اگر کوئی کسی اور زبان کے بارے میں کچھ لکھے گا تو وہ اچھا ہی لکھے گا ۔ شخصی خوشحالی اور مرفہ الحالی زندگی کو دیکھنے کا زاویہ ہی بدل دیتی ہے ۔ ہماری جیب میں اگر کبھی دو تین سو روپے فالتو موجود ہوں تو بخدا زندگی بہت حسین نظر آنے لگتی ہے ۔ جھگیاں اور جھونپڑیاں بھی قدرت کا ایک انمول تحفہ معلوم ہوتی ہیں ۔ غریب آدمی تو ہمیں دکھائی دیتا ہے لیکن غربت نہیں دکھائی دیتی ۔ ایسا زاویہ نگاہ وقتی خوشحالی کا مرہون منت ہوتا ہے ۔ پھر رکشت پوری تو انگریزی کے صحافی ہیں ۔ اردو بھی تھوڑی بہت جان لیتے ہیں لیکن انہیں کیا پتہ کہ ان دنوں اردو اس ملک میں کن حالات سے گذر رہی ہے ۔ دس بارہ برس پہلے اردو کے مشہور شاعر اور ناقد ساقی فاروقی ، جو لندن میں رہتے ہیں ، اپنی جرمن بیوی کے ساتھ پہلی بار ہندوستان آئے تھے ۔ بیگم ساقی فاروقی نے ساقی کے ساتھ دہلی کی چند اردو محفلوں میں شرکت کی اور جب دیکھا کہ لوگ ساقی کے کلام پر دوہرے ہو ہو کر داد دے رہے ہیں اور ہلکان ہونے کا نام نہیں لے رہے ہیں تو بیگم ساقی فاروقی نے ہم سے انگریزی میں جو کچھ کہا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ " مجھے پتہ نہیں تھا کہ

ساقی اردو کے لئے بڑے شاعر ہیں ۔ میں نہ جانے کتنے ہی برسوں سے ساقی کے ساتھ زندگی گذار رہی ہوں لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں اردو کے لئے بڑے شاعر کی رفیق حیات ہوں ۔ اگر میں ان کے ساتھ ہندوستان نہ آتی تو سدا اندھیرے میں ہی رہتی " ۔ اس پر ہم نے بیگم ساقی فاروقی سے کہا تھا " آپ چونکہ اردو نہیں جانتیں اس لئے اگر آپ اپنے شوہر کے بارے میں ایسی رائے قائم کر لیتی ہیں تو یہ بات حق بجانب ہے ۔ اردو نہ جاننے کے یہی تو فائدے ہیں " ۔ اردو کی محفل میں لوگ جس طرح سماں باندھ دیتے ہیں اس کے باعث وہ لوگ جو اردو نہیں جانتے اکثر غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ ماحول بنانا یا سماں باندھنا ، اردو تہذیب کا خاصہ رہا ہے ۔ ہم نے مشاعروں میں بعض شاعروں کے ایسے کلام پر سامعین کو بے پناہ داد دیتے ہوئے دیکھا ہے جس پر شاعر کو اصولاً سزا ملنی چاہئے تھی ۔ سزا اور داد کا فرق جب مٹ جاتا ہے تو زبانوں کا یہی حشر ہوتا ہے ۔ رکشت پوری نے اردو کی موجودہ صورتحال کے بارے میں جو دلخوش کن تحریر لکھی ہے وہ اصل میں ایسی ہی کسی محفل میں شرکت کے بعد لکھی ہے ۔

اس کے جواب میں اردو کے ایک بہی خواہ اے ۔ اے ۔ عباسی کا ایک تفصیلی مراسلہ " اردو کا مستقبل " کے عنوان سے ہندوستان ٹائمز میں ہی شائع ہوا ہے جس میں مراسلہ نگار نے رکشت پوری کے مندرجہ بالا کالم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایسی گمراہ کن تحریروں سے اردو والے خواہ مخواہ خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ ساری گڑ بڑ اردو کے ان معدودے چند پروفیسروں اور اساتذہ کی پیدا کردہ ہے جو دہلی ، علی گڑھ ، بھوپال ، لکھنؤ اور حیدرآباد میں بیٹھ کر اردو کے بارے میں جان بوجھ کر ایسی خوش فہمیاں پھیلاتے رہتے ہیں ۔ اور ایسی خوش فہمیوں کو پھیلانے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اردو کے یہ پروفیسر اور اساتذہ اپنے زندہ رہنے کا جواز ڈھونڈتے ہیں ۔ انھیں اصل میں اپنے حلوے مانڈے سے مطلب ہوتا ہے ۔ اردو اساتذہ کا یہ ٹولہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان اداروں اور انجمنوں پر قابض ہو جاتا ہے جنہیں مرکزی

حکومت اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے امداد ملتی ہے ۔ پھر یہ آپس میں مل کر اردو کے لئے ملنے والی اس امداد کو بانٹ لیتے ہیں ۔ ان کے سامنے اردو کی بقاء کا نہیں بلکہ اپنی بقاء کا مسئلہ ہوتا ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ جلتے گھر کے بانس کو بھی لوگ اٹھا کر لے جاتے ہیں ۔ اردو کے جلتے ہوئے گھر کے ساتھ بھی یہ اساتذہ یہی کر رہے ہیں ۔ مراسلہ نگار نے اردو کے بارے میں دلخوش کن تحریریں لکھنے والوں سے کہا ہے کہ وہ اردو کی محفلوں میں اساتذہ کی جانب سے کی جانے والی چکنی چپڑی باتوں پر بالکل نہ جائیں بلکہ ایک نظر اردو کی کسی بھی محفل میں موجود شرکاء کے سروں کے اندر نہیں بلکہ سروں کے اوپر ڈال لیں تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ اردو کی صورتحال کتنی سنگین ہوتی جارہی ہے ۔ کیونکہ ان میں سے بیشتر شرکاء کے سروں پر یا تو بال ہی نہیں ہوں گے اور اگر ہوں گے تو وہ سفید ہوں گے ۔ اردو کی کسی بھی محفل میں اب جتنے لوگ بھی شرکت کرتے ہیں انکی عمریں پچپن اور ساٹھ برس سے زیادہ ہوتی ہیں ۔ اردو کی محفلوں میں نئی نسل آہی نہیں رہی ہے تو کالے بالوں والے سامع کہاں سے آئیں گے ۔ اردو کی موجودہ سنگین صورتحال کو سمجھنے کے لئے یہ ثبوت کافی ہے ۔ مراسلہ نگار کی اس رائے سے ہمیں پوری طرح اتفاق نہیں ہے کیونکہ دہلی کی ادبی محفلوں میں کبھی کبھار کوئی کالے بالوں والا سامع بھی شریک ہوجاتا ہے ۔ ہماری مراد ہے ڈاکٹر خلیق انجم سے جو اپنے بالوں میں بڑے اہتمام سے خضاب لگاتے ہیں ۔ ہم انہیں جب بھی دیکھتے ہیں تو اردو کا مستقبل اتنا تاریک نظر نہیں آتا ۔ اگر بالوں کی سیاہی کا مطلب اردو کے روشن مستقبل سے ہے تو اردو والوں سے ہماری گذارش ہے کہ وہ اردو محفلوں میں جانے سے پہلے اپنے بالوں میں خضاب ضرور لگایا کریں کیونکہ بالوں میں خضاب لگانا بھی اردو کے مستقبل کے بارے میں دل خوش کن تحریریں لکھنے کے مترادف ہے ۔ جو لوگ اردو کے مستقبل کے بارے میں اچھی اچھی اور پر امید تحریریں لکھتے ہیں وہ بھی تو آخر اپنی تحریر میں خضاب ہی لگاتے ہیں ۔ یادش بخیر ! اردو کے تاریک مستقبل اور روشن ماضی کے بارے میں ایک واقعہ یاد آگیا ۔ پندرہ برس پہلے بنگلور میں ایک سمینار منعقد ہوا تھا جس میں پروفیسر

ثریا حسین، جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو تھیں اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، جو ان دنوں ترقی اردو بورڈ کی ڈائرکٹر تھیں، بھی موجود تھیں۔ پروفیسر ثریا حسین کا رنگ نہایت سرخ و سفید ہے اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا رنگ کسی قدر سیاہی مائل ہے۔ سمینار میں دونوں برابر برابر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک مقرر نے سمینار میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "حضرات! اردو کا ماضی اگر چہ نہایت روشن اور تابناک تھا لیکن اب اس کا مستقبل تاریک ہوتا جارہا ہے۔" اس پر ہم نے دونوں معزز خواتین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور اتفاق سے اس وقت اردو کا روشن ماضی اور تاریک مستقبل دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں" بہر حال یہ ایک لطیفہ تھا جو ہمیں اچانک یاد آگیا۔ غرض مراسلہ نگار نے اپنے مراسلہ میں اور بھی بہت سی باتیں کہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے بھی دو ایک برس پہلے اسی کالم میں لکھا تھا کہ اردو کی محفلوں میں اب زیادہ تر بوڑھے ہی شرکت کر رہے ہیں۔ سوچا تھا کہ ہمارے لکھنے کے بعد کچھ نوجوان بھی اردو کی محفلوں میں آنے لگیں گے اور اتفاق سے چند روز بعد ہی ہمیں اردو کی ایک محفل میں بارہ برس کا ایک لڑکا نظر آگیا۔ اردو سے اس کی محبت کو دیکھ کر ہم نہال ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے اسے اپنے پاس بلایا اس کی ہمت افزائی کی۔ اتا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اردو کے ایک پروفیسر، جو ہمارے دوست بھی ہیں، کا نواسا ہے۔ جب ہم نے اپنے پروفیسر دوست سے ان کے نواسے کی اردو سے محبت کی تعریف کی تو بولے "نعوذ باللہ! بھیا! اسے اردو سے کیا لینا دینا ہے۔ مجھے اصل میں اس محفل کے بعد ایک تقریب میں جانا ہے۔ اس لئے اسے ساتھ لے آیا ہوں۔ بڑی مشکل سے آیا ہے۔ پورے دس روپے کے چاکلیٹ دلائے ہیں تب کہیں جاکر اردو کی اس محفل میں آنے کے لئے راضی ہوا ہے۔ آپ بھی بڑے معصوم آدمی ہیں، آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے نواسے کو اردو کے چکر میں مبتلا کروں گا۔ یہ تو انگلش میڈیم کے اسکول میں پڑھتا ہے۔ اردو کے حروف تہجی سے بھی واقف نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے اتنا عاقبت نااندیش سمجھتے ہیں کہ میں اپنے نواسے کو اردو پڑھاؤں گا"۔ اس جواب کے بعد ہم نے اردو محفلوں میں نوجوانوں کو تلاش کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر

میرا کالم

کوئی نوجوان مل بھی جاتا ہے تو اس سے یہ تک نہیں/پوچھتے کہ وہ کتنے روپیوں کے چاکلیٹ لے کر اس محفل میں آیا ہے ۔ مراسلہ نگار نے اردو اساتذہ کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ہمیں بھی صد فی صد اتفاق ہے لیکن ہم اس بارے میں کھل کر اس لئے کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ اردو کے بیشتر نقاد یہی اساتذہ ہوتے ہیں ۔ بھیا! ہمیں بھی تو ادب میں زندہ رہنا ہے (بھلے ہی زبان مر جائے) ۔ اردو کے سوائے کسی اور زبان میں یہ نہیں دیکھا کہ جو کوئی بھی ٹوٹی پھوٹی اردو میں ایم اے کر کے کسی کالج میں اردو کا استاد مقرر ہوجاتا ہے تو فوراً ناقد بھی بن جاتا ہے اور ادب کے بارے میں غلط زبان لکھ کر غلط فیصلے صادر کرنے لگ جاتا ہے۔ آپ کو اردو کا کوئی خالص استاد ایسا نہیں ملے گا جو اردو کی تعلیم سے مطلب رکھتا ہو ۔ جو بھی ملے گا ناقد ہی ملے گا ۔ اسکی دکان بھی ایسی ہی لنگڑی لولی تنقیدی تحریروں کے ذریعہ چلتی ہے ۔ ہمارے پاس اردو کے بعض اساتذہ کے ایسے کئی خطوط ہیں جن میں زبان کی بے شمار غلطیاں موجود ہیں ۔ اردو کے ان اساتذہ کی خواہش یہ نہیں ہوتی کہ اردو زبان کو عام کیا جائے ان کی ساری توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ اردو کے نام پر امداد کہاں سے حاصل کی جائے ۔ کونسی کمیٹی کی رکنیت پر قبضہ کیا جائے ۔ اور جوڑ توڑ کے ذریعہ " بندر بانٹ " کو کس طرح فروغ دیا جائے ۔ ہم نے تو اب اردو کے مستقبل کے تعلق سے ان اساتذہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا ہے ۔ ہمیں تو وہ نادر اور مفلس کارکن اچھے لگنے لگے ہیں جو رضا کارانہ طور پر اردو کی ابتدائی تعلیم کے لئے سر گرم عمل ہو گئے ہیں ۔ اردو کا مستقبل روشن ہو گا تو ایسے ہی بے لوث لوگوں کے ذریعہ ہو گا ۔ اردو کے با لوث اساتذہ کو تو اپنے ڈرائنگ رومس میں بیٹھ کر لفظوں کے طوطا مینا بنانے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

(۶ / مئی ۱۹۹۷ء)

بجلی ، بجلی بورڈ اور اردو ادب

آپ کو یاد ہوگا کہ دو مہینے پہلے دلی میں بجلی بورڈ کے ملازمین نے اچانک ہڑتال کردی تھی اور پورے چوبیس گھنٹوں تک دلی کے اکثر علاقے تاریکی میں ڈوب گئے تھے ۔ اس سنگین صورتحال کے پیش نظر مشہور ماہر قانون ایچ ڈی شوری نے، جو اپنی تنظیم " Common Cause " کی معرفت عوامی مسائل کے بارے میں عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہتے ہیں ، دلی ہائیکورٹ میں ایک عرضی داخل کی تھی کہ بجلی تو صارفین کے روز مرہ استعمال کی چیز ہے اس کی سربراہی کا بند ہونا صارفین کے بنیادی حق کی خلاف ورزی ہے ۔ چنانچہ دلی ہائیکورٹ کی ہدایت پر ملازمین نے اپنی ہڑتال ختم کر دی تھی ۔ ایچ ڈی شوری غریبوں اور عوام کے مسائل کو ہمیشہ اٹھاتے رہتے ہیں اور اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوتے رہتے ہیں ۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ایچ ڈی شوری انگریزی کے مشہور صحافی ارون شوری اور ٹیلی ویژن کی جانی پہچانی شخصیت نلنی سنگھ کے والد ہیں ۔ ایچ ڈی شوری کی مداخلت پر دلی میں بجلی بحال ہوگئی تو ہم نے بھی اطمینان کا لمبا سانس لیا کیونکہ چھ سات گھنٹوں تک بجلی فیل ہوجاتی ہے تو ہم اس صورتحال کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں بلکہ اسے تو روز مرہ کا معمول سمجھتے ہیں لیکن چوبیسوں گھنٹوں تک بجلی بند رہے تو یہ کیفیت ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے ۔ بہر حال اس واقعہ کے دو چار دن بعد ایک صبح کو ہم " ٹائمس آف انڈیا " کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ایک خبر نظر سے گذری جس میں لکھا تھا کہ دلی ہائیکورٹ نے دلی میں بجلی کے صارفین کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک با اختیار کمیٹی تشکیل دی ہے ۔ جس کے صدر نشین نوین چاولہ ہونگے (نوین چاولہ حکومت ہند کے سینئر آئی اے ایس

عہدیدار اور دہلی بجلی بورڈ کے صدر نشین ہیں۔ "مدر ٹریسا" کے بارے میں انہوں نے جو معرکتہ الآرا کتاب لکھی ہے اس کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت بھی رکھتے ہیں) اس کمیٹی کے ارکان میں ہمیں ایچ ڈی شوری، دہلی چیمبر آف کامرس کے صدر نشین انل بھار گو، بجلی بورڈ کے ملازمین کے نمائندہ ہیرا لال شرما کے علاوہ ایک نام "مجتبیٰ حسین" کا بھی نظر آیا۔ ہمیں یہ جان کر خوشی تو ہوئی کہ "مجتبیٰ حسین" نامی ایک صاحب اور بھی ہیں جو غالباً پیشہ کے اعتبار سے الکٹریکل انجینئر ہونگے اور اپنے فن کے ماہر ہونگے۔ چاہے کچھ بھی ہو اطمینان ضرور تھا کہ ہم نہ سہی ہمارا کوئی "ہم نام" دہلی میں بجلی کی سربراہی کے انتظام کو بہتر بنائے گا۔ یوں بھی یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ یہ مجتبیٰ حسین ہم بھی ہو سکتے ہیں، پھر ایسا کوئی معاملہ پیش آئے تو ہم اردو کے اس مصرعہ کو یاد کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔

گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس خبر کو روا روی میں پڑھنے کے بعد ہم دوسری خبریں پڑھنے لگے تو کچھ دیر بعد اچانک بجلی فیل ہوگئی۔ ہم نے دل ہی دل میں بجلی کو کوسا کہ "بھاگیہ وان! اب تیری خیریت نہیں ہے کیونکہ ہمارا ایک ہم نام شخص تجھے راہ راست پر لانے کے لیے آرہا ہے۔ اب بار بار فیل ہونے کی کوشش نہ کرنا" ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دہلی بجلی بورڈ کے جنرل منیجر این پی سنگھ کا فون آیا کہ حضور! آپ نے آج کے اخباروں میں یہ خبر تو پڑھ لی ہوگی کہ دہلی ہائیکورٹ نے آپ کو دہلی بجلی بورڈ کی بااختیار کمیٹی کا رکن نامزد کیا ہے۔ کل اس کمیٹی کی پہلی میٹنگ ہے۔ آپ کو اس میں ضرور آنا ہے"۔ یہ سنتے ہی ہمارے دل پر بجلی سی گری، پھر علامہ اقبال بھی بے ساختہ یاد آئے جنہوں نے اپنے ایک شعر میں شکایت کی تھی کہ برق گرتی ہے تو ہم جیسے بیچاروں پر ہی گرتی ہے۔ بہر حال بجلی کے اس شاک سے سنبھلنے کے بعد ہم نے پوچھا "بھیا! ہمارا بجلی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اگر دہلی ہائیکورٹ نے واقعی ہمیں رکن بنایا ہے تو یہ سراسر ناانصافی ہے۔ ہم تو اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں بھی جانے کو تیار ہیں۔ پہلے یہ بتلایئے کہ یہ فیصلہ کون سے جج کے اجلاس پر ہوا ہے؟"

بجلی، بجلی بورڈ اور اردو ادب

این پی سنگھ نے کہا - دلی ہائیکورٹ کے جج عزت مآب جسٹس جسپال سنگھ نے یہ کمیٹی تشکیل دی ہے ۔ آپ تو بجلی اور بجلی کے مسائل کے بارے میں ضرور جانتے ہونگے ۔ تبھی تو انہوں نے آپ کو اس کمیٹی کا رکن نامزد کیا ہے۔" جسٹس جسپال سنگھ کا نام سنتے ہی ہماری آنکھوں کے آگے بجلی سی کوند گئی۔ سنبھل کر بولے - اچھا تو جسٹس جسپال سنگھ جی نے ہمیں رکن بنایا ہے۔ تب تو ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا کیوں کہ جسٹس جسپال سنگھ دلی ہائیکورٹ کے واحد جج ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ بجلی سے ہمارا کتنا گہرا تعلق ہے ۔ اگر چہ ہمارا شمار ملک کے ممتاز ماہرین برقی میں ہوتا ہے لیکن ہم نے یہ بات اب تک صیغہ راز میں رکھی تھی کیونکہ لوگ خواہ مخواہ تنگ کرتے ہیں کہ صاحب ہماری ٹیوب لائٹ خراب ہوگئی ہے ۔ ذرا ٹھیک کر جائیے ، اور ہاں لگے ہاتھوں بجلی کا پنکھا اور بجلی کی استری بھی چیک کر جائیے "۔ غرض اس طرح ہم ان دنوں دلی بجلی بورڈ کی با اختیار کمیٹی کے ایک معزز رکن بنے ہوئے ہیں۔ کئی بار ہم نے اپنے کالم میں جسٹس جسپال سنگھ کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہمارے کرم فرماؤں میں سے ہیں اور اردو شعر و ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں ۔ بھلا بتائیے اردو ادب اور بجلی کے گہرے رشتے کو ان سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔ تبھی تو انہوں نے ہمیں اس بااختیار کمیٹی کا رکن نامزد کیا ہے ۔ ایک زمانہ تھا جب آسمان پر گھنگھور گھٹاؤں کے نہ ہونے کے باوجود ہمارے دل پر دھڑا دھڑ بجلیاں گرا کرتی تھیں بلکہ کبھی کبھی تو ہم خود کسی اچھی سی بجلی پر جاکر گر جاتے تھے ۔ اب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں بجلیوں میں وہ کڑک اور چمک نہیں دکھائی دیتی، یہ بجلیاں تو ہیں لیکن ٹھنڈی بجلیاں ہیں ۔ بزرگ مزاح نگار آنجہانی بھارت چند کھنہ نے اپنی ایک کتاب کا نام " ٹھنڈی بجلیاں " رکھا تھا ۔ نوجوانی میں ہمیں اس کتاب کا نام مضحکہ خیز لگتا تھا کہ آخر بجلی ٹھنڈی کیسے ہو سکتی ہے ۔ مگر جب سے ہماری عمر میں اضافہ ہوا ہے اور اس اضافہ کے باعث ہمارے اخلاق خود بخود بہتر ہوتے چلے جارہے ہیں تو ہمیں ٹھنڈی بجلیوں کا مطلب خوب سمجھ میں آنے لگا ہے یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اردو ادب میں بجلی کا جتنا زیادہ استعمال ہوتا آیا ہے اتنا دنیا کی کسی اور زبان میں نہ ہوا ہوگا ۔ جب آدمی نے بجلی کو قابو میں کر کے مشینوں کو چلانا

شروع نہیں کیا تھا اور بجلی کا بلب بھی ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا تو تب بھی اردو ادب میں بجلی کا بول بالاتھا اور اس کا بے دریغ استعمال کیا جاتا تھا۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ ہمارے حیدرآباد کو تو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں اردو کے سب سے بڑے الکٹریکل شاعر جناب سعید شہیدی رہتے ہیں۔ ان کی کوئی غزل برق اور آشیاں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ جب سے انہوں نے شاعری شروع کی ہے تب سے بلاشبہ سینکڑوں آشیاں بنا چکے ہیں اور ان پر ہزاروں بجلیاں گرا چکے ہیں۔ ان کے ہاں بجلیوں کی تعداد ہمیشہ آشیانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بجلی بورڈ کے پاس بھلے ہی بجلی نہ ہوتی ہو سعید شہیدی کی شاعری میں تو بجلی کبھی فیل نہیں ہوتی۔ البتہ آشیانہ ضرور فیل ہوجاتا ہے۔ ان کی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ ابھی وہ آشیانے کے لئے دو چار تنکے بھی جمع نہیں کر پاتے کہ اس کام کو ادھورا چھوڑ کر بجلی کی تلاش میں شکل کھڑے ہوتے ہیں کہ " کہاں گئی،کدھر گئی۔گرتی۔کیوں نہیں میرے آشیانے پر نکمی، کہیں کی " غرض بجلی کو اتنا ڈانٹتے اور ڈپٹتے ہیں کہ بے چاری کو مجبوراً نا مکمل آشیاں پر ہی گر جانا پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں تو ان کی نیت اچھی نہیں لگتی کیونکہ وہ آشیاں اس لئے نہیں بناتے کہ اس میں رہ سکیں بلکہ وہ تو آشیاں بناتے ہی اس لئے ہیں کہ اس پر بجلی کو گرا سکیں۔ ان کے بعض شعروں میں تو ہم نے یہاں تک محسوس کیا کہ آشیاں بن چکا ہے مگر بجلی اس پر گرنے سے گریز کر رہی ہے۔ برق و آشیاں کے بیچ یہ آنکھ مچولی جب طول پکڑتی ہے تو قبلہ سعید شہیدی غزل کو مکمل کرنے کی عجلت میں خود آشیاں کو بجلی پر لیجاکر گرادیتے ہیں۔ دروغ بر گردن راوی ایک بار کسی نے بتایا تھا کہ برسات کے موسم میں موسلادھار بارش ہورہی تھی ۔ بجلیاں چھماچھم چمک رہی تھیں کہ ایسے میں سعید شہیدی کسی مشاعرہ میں شرکت کے لیے آپہنچے۔ جیسے ہی وہ مشاعرہ میں آئے بادل بجلیوں سمیت دُم دباکر بھاگ گئے اور برسات بھی اچانک رک گئی۔ کسی نے موسم کی اس فی الفور تبدیلی کا سبب پوچھا تو بتایا گیا کہ بجلیاں اس ڈر سے بھاگ گئی ہیں کہ کہیں سعید شہیدی ان پر اپنے شعر نہ گرادیں۔ بجلیوں کو بھی تو اپنی عافیت مطلوب ہوتی ہے۔ وہ کہیں اور گرنا چاہتی ہیں اور سعید شہیدی انھیں اپنے آشیاں پر گرنے کے لئے مجبور

کرتے رہتے ہیں۔ وہ نہیں گرتیں تو انہیں بجلی کٹی سنانا شروع کر دیتے ہیں ۔ وہ تو اچھا ہے کہ سعید شہیدی حیدر آباد میں رہتے ہیں اگر خدا نخواستہ دہلی میں ہوتے تو بجلی کی بااختیار کمیٹی میں ہماری نامزدگی کیونکر ہوتی۔ پھر بھی حیدر آباد کے بجلی بورڈ کو چاہیئے کہ ان کی خدمات سے ضرور استفادہ کرے ۔ اس سے بجلی بورڈ اور شاعری دونوں کا بھلا ہوگا ۔ ہمارا تو خیال ہے کہ اور بھی ایسے کئی امور ہیں جن کی چھان بین کے لیے اگر بااختیار کمیٹیاں بنائی جائیں تو ان میں اردو شاعروں کو آسانی سے نامزد کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً جیلوں کی اصلاح کا معاملہ ہو تو اس میں بھلے ہی ہمارے فیض احمد فیض ، مخدوم محی الدین ، حبیب جالب وغیرہ کو عملی دشواریوں کی وجہ سے نامزد نہ کیا جاسکے لیکن ان کے شعری مجموعوں سے استفادہ تو کیا جاسکتا ہے بلکہ فیض کا " زنداں نامہ " تو جیلوں کی اصلاح کی لیئے " رہنمائے زنداں " کی حیثیت رکھتا ہے ۔ محکمہ ڈاک و تار کے امور کو بہتر بنانے کا معاملہ ہو تو اس کی کسی کمیٹی میں اردو شاعروں کا رہنا نہایت ضروری ہے ۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اردو شاعری میں قاصد یا پوسٹ مین کو کتنی بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔ غالب تو زندگی بھر اپنی شاعری میں قاصد ، پیامبر اور دربان کی منت سماجت کرتے رہے ۔ آپ نے اس پوسٹ مین کا قصہ تو ضرور سنا ہوگا جو ایک نوجوان کے خط اس کی محبوبہ کے نام پہنچایا کرتا تھا ۔ ایک مرحلہ پر جب نوجوان کے خطوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور نازنین سے پوسٹ مین کا ربط بڑھنے لگا تو نازنین نے بالآخر اس نوجوان کی بجائے پوسٹ مین سے شادی کرلی۔

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

بہر حال جسٹس جسپال سنگھ کی عنایت سے ان دنوں ہم بجلی کے امور کے ماہر بنے ہوئے ہیں حالانکہ بجلی کی استری اور بجلی کے پنکھے وغیرہ اب بھی ٹھیک نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ بجلی کی چوری کیسے کی جاسکتی ہے ۔ بجلی کے میٹر کو اپنے فائدے کے لیئے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی معمولی فائدے ہیں جو ہمیں پہونچ رہے ہیں۔ ذرا یہ تو سوچیئے کہ جسٹس جسپال سنگھ ہمارا کتنا خیال رکھتے ہیں ۔

(۹/ اپریل ۱۹۹۸ ء)

بجٹ اور اردو شاعری

اس سال کے مرکزی بجٹ کے بارے میں عام طور پر اس رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ یہ پچھلی سرکار کے بجٹ کا ایک تسلسل ہے ۔ سچ پوچھئے تو ہمیں آج تک کوئی بجٹ سمجھ میں نہیں آیا ۔ نہ پچھلی سرکار کا ، نہ موجودہ سرکار کا ۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا بھی ذاتی خیال یہ ہے کہ موجودہ بجٹ پچھلی سرکار کے بجٹوں کا ایک تسلسل ہے ۔ تسلسل ان معنوں میں کہ وزیر فینانس مسٹر چدمبرم نے بھی اپنی تقریر میں اردو کے دو شعر پڑھے ۔ ایک شعر تو خیر ہماری سمجھ میں نہیں آیا البتہ وزیر فینانس نے یہ ضرور کہا کہ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے اور ہوگا بھی ان کا ہی کیونکہ وزیر فینانس نے جس طرح اس شعر کو ادا کیا اس میں ہمیں صرف ایک لفظ سمجھ میں آیا اور وہ ہے " شاہین " ۔ اور شاہین اگر کوئی پرندہ ہے بھی تو وہ علامہ اقبال کے سوا کسی اور کی شاعری میں داخل ہونے کی جسارت نہ کر سکا ۔ ہم ٹیلی ویژن پر مسٹر چدمبرم کی بجٹ تقریر کو بڑے غور سے سن رہے تھے ۔ جیسے ہی انہوں نے علامہ اقبال کا نام لیا ہمارا دل باغ باغ ہو گیا ۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک مسٹر منموہن سنگھ وزیر فینانس رہے ہم بجٹ کی تقریر صرف اس لئے سنا کرتے تھے کہ دیکھیں اس میں کتنے اردو شعر استعمال ہوتے ہیں ۔ مسٹر منموہن سنگھ اردو شاعری کے دلدادہ رہے ہیں اس لئے بجٹ جیسے خشک موضوع کو آسان بنانے کے لئے وہ اپنی ہر بجٹ تقریر میں جابجا اردو شعروں کا استعمال کرتے رہے ۔ ان کی بجٹ تقریر کے بعد لوگ تو یہاں تک پوچھتے تھے کہ بتایئے وزیر فینانس نے اس سال کتنے نئے ٹیکس اور کتنے اردو شعر لاگو کئے ہیں ۔ بعض تو ایسے بھی تھے جو اردو شعر کو ٹیکس کے مماثل کوئی چیز سمجھتے تھے ۔ مسٹر منموہن

بجٹ اور اردو شاعری

سنگھ کے بارے میں تو یہ سمجھ میں آجاتا تھا کہ چونکہ خود اردو جانتے ہیں اس لئے اردو شعروں کا اپنی بجٹ تقریر میں استعمال کرتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہا کرتے تھے کہ بجٹ تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ بجٹ تقریر کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ منموہن سنگھ اپنے پسندیدہ شعروں کو سنا سکیں ۔ بالکل اسی طرح جیسے مولانا ابوالکلام آزاد نثر صرف اس لئے لکھتے تھے کہ اس میں جابجا اپنے پسندیدہ شعروں کو پیش کر سکیں ۔ بہر حال ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ مسٹر چدمبرم بھی اپنی بجٹ تقریر کو گوارا بنانے کے لئے اردو شعروں کا استعمال کریں گے ۔ یہ اور بات ہے کہ علامہ اقبال کے شعر کو انہوں نے اپنے مخصوص ٹامل لہجہ میں کچھ اس طرح سنایا کہ لگتا تھا علامہ اقبال نے یہ شعر خود ٹامل میں کہا ہو ۔ اگر وہ "شاہین" کے لفظ کا صحیح تلفظ ادا نہ کرتے تو ہمیں پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ اردو کا شعر ہے ۔ بجٹ اور اردو شاعری میں بظاہر ہمیں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی کیونکہ اردو شاعری شروع ہی سے فاقہ کشوں ، قلندروں ، مظلوموں اور مجبوروں کی شاعری رہی ہے اور خاص طور پر علامہ اقبال کی ساری شاعری میں تو " فقر و فاقہ " کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور جا بجا عوام کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ غریبی میں نام پیدا کریں (اور حکومت کو کوئی ٹیکس نہ ادا کریں) ۔ ظاہر ہے کہ جو آدمی غریبی میں نام پیدا کرے گا وہ شہرت تو کمائے گا لیکن دولت نہیں کمائے گا اور نتیجہ میں اس پر کوئی ٹیکس بھی عائد نہیں ہو گا ۔ دیکھا جائے تو ساری اردو شاعری بجٹ کے خلاف جاتی ہے ۔ عملی طور پر بھی اردو کے بہت کم شاعر ایسے ہونگے جو حکومت کو اپنی آمدنی پر ٹیکس ادا کر تے ہونگے ۔ یہ ضرور ہے کہ مشاعروں کے بعض مقبول شاعر ، مشاعروں سے ملنے والی آمدنی پر کچھ ٹیکس ادا کرتے ہوں لیکن مشاعروں کے شاعر شاعروں کے زمرے میں کہاں سے آتے ہیں ۔ یہ تو ایک الگ ہی مخلوق ہے جو اگر ٹیکس بھی ادا کرتی ہے تو اس سے اس کی شاعری کے وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ بھلے ہی اصلی اردو شاعری کا مال و متاع ، زر و دولت سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن وقت ضرورت اسے رئیسوں ، صاحبانِ اقتدار اور امرا کے حق میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر

ہمیں یاد ہے کہ پچھلے سال مسٹر منموہن سنگھ نے اپنی بجٹ تقریر میں شعر پڑھا تھا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یہ جاننے کے لئے ہم نے لاکھ سر کھپایا کہ سر فروشی کی یہ تمنا آخر کس کے دل میں ہے۔ کیونکہ جو وزیر ٹیکس لگاتا ہے (چاہے وہ پگڑی ہی کیوں نہ باندھتا ہو) اس کے دل میں سر فروشی کی تمنا تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ سر فروشی کی تمنا تو ٹیکس ادا کرنے والے کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ پھر ٹیکس عائد کرنے والے کو خود قاتل تصور کیا جاتا ہے۔ اسے آخر کیوں بازوے قاتل کا زور جاننے کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ اسے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ مقتول کے گلے میں کتنا زور ہے تاکہ وہ اس مناسبت سے مقتول کے گلے پر چھری پھیرنے میں طاقت لگا سکے۔ مگر بجٹ تقریر میں اردو شعر قاتل اور مقتول کو سامنے رکھ کر کہاں استعمال کئے جاتے ہیں۔ انہیں تو صرف بجٹ تقریر میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

اب یہی دیکھئے کہ مسٹر چدمبرم نے اس سال کی بجٹ تقریر میں علامہ اقبالؔ کے اس شعر کا حوالہ دیا تھا جس میں "شاہین" کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ بھلا بتلایئے شاہین کا بجٹ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ نہ وہ ٹیکس ادا کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ٹیکس عائد کر سکتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے شاہین کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے مطابق تو وہ ایک ایسا پرندہ قرار پاتا ہے جو ہمیشہ پرواز کرتا رہتا ہے اور ایسا اڑنے والا پرندہ کبھی ٹیکس کی زد میں نہیں آسکتا۔ کسی ٹیکس دہندہ کو اگر شاہین کی طرح کی "طاقت پرواز" عطا ہو جائے تو وہ کبھی ٹیکس ادا نہ کرے۔ یوں بھی شاہین کا بسیرا کبھی بھی "قصر سلطانی کی گنبد" پر نہیں ہوتا بلکہ وہ تو پہاڑوں کی چٹانوں پر رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو شاعری کا بیشتر حصہ "قصر سلطانی کی گنبد" کے خلاف کہے گئے شعری سرمایہ پر مشتمل ہے۔ اردو کے بیشتر شاعروں نے اپنے آپ کو اقتدار اور جاہ و حشمت سے دور رکھا لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ان دنوں صاحب اقتدار لوگ بھی اپنے بچاو کے لئے اردو شاعری کا ہی

استعمال کرنے لگے ہیں ۔ کیا کریں اردو شاعری میں ہر آدمی اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ لیتا ہے ۔ ابھی پچھلے دنوں بھارتیہ جنتا پارٹی کی تیرہ روزہ سرکار کو گرانے کے لئے پارلیمنٹ میں جو بحث ہوئی تھی اس میں بھی اردو شعروں کا بے دریغ استعمال کیا گیا تھا ۔ رکن پارلیمنٹ مسز میرا کمار نے تو تقریر کم کی اور اردو شعر زیادہ پڑھے ۔ تھوڑی دیر کے لئے یوں لگا جیسے ہم پارلیمنٹ کی بحث نہ سن رہے ہوں بلکہ کسی مشاعرہ میں بیٹھے ہوں ۔ میرا کمار کا تلفظ تو خیر بہت صاف اور واضح تھا ۔ حد ہو گئی کہ پارلیمنٹ کی سب سے جوشیلی رکن ممتا بنرجی نے بھی خالص بنگالی لہجہ میں اردو کا ایک شعر داغ دیا تھا ۔ ابراہیم جلیس مرحوم نے بنگالی لہجہ کے بارے میں اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ ایک دن وہ گھر واپس ہوئے تو ان کے بنگالی ملازم نے انہیں اطلاع دی کہ اس دن گھر میں " سیریا کا بادشاہ " آیا تھا ۔ اب یہ پریشان ہو گئے کہ سیریا کے بادشاہ کو کسی اطلاع کے بغیر ان کے گھر آنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی ۔ مگر بہت بعد میں انہیں پتہ چلا کہ اس دن ان کے گھر میں " سیریا کا بادشاہ " نہیں آیا تھا بلکہ " چڑیا کا بچہ " آیا تھا ۔

بہر حال پارلیمنٹ کی اس بحث کے بعد ہمارے ایک دوست نے کہا تھا " ہم تو یہ سمجھتے آئے تھے کہ اردو شاعری صرف انگریزوں کی حکومت کو گرانے کے ہی کام آسکتی تھی لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ آزادی کے بعد بھی اس میں دیسی حکومت کو گرانے کی بھی صلاحیت موجود ہے " ۔

بجٹ پیش کرتے وقت وزیر فینانس چاہے کتنے ہی اردو شعروں کا استعمال کیوں نہ کریں لیکن ٹیکس ادا کرنے والوں نے بھی اردو کے ہی ایک مصرعہ کو اپنی گرہ میں باندھ لیا ہے اور وہ مصرعہ ہے ۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

پس نوشت :۔ مسٹر چدمبرم نے علامہ اقبال کا جو شعر اپنی تقریر میں اپنے مخصوص لہجہ میں پڑھا تھا ۔ اسے جاننے کی بہت کوشش کی لیکن پتہ نہیں چلا ۔ بالآخر ہم نے پارلیمنٹ کی ایک اعلیٰ عہدیدار کو جو خود بھی ٹاملناڈو کی رہنے والی ہیں اس سلسلہ میں زحمت دی اور انہوں نے ہمارے کالم کے لکھے جانے کے بعد

ابھی ابھی اطلاع دی ہے کہ جو شعر مسز چد مبرم نے پڑھا تھا وہ حسب ذیل ہے:

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

شعر کو سننے کے بعد ہم نے موصوفہ سے پوچھا "محترمہ! سچ سچ بتلایئے کیا تامل زبان میں "خطرہ افتاد" ہوتا ہے؟"۔ بولیں "جے للیتا کے ساتھ ان دنوں جو کچھ ہو رہا ہے وہ "خطرہ افتاد" نہیں تو اور کیا ہے؟"

ہمیں بڑا اطمینان ہوا کہ دوسری زبانوں میں بھلے ہی شاہین نہ ہو "خطرہ افتاد" تو ہے۔ آخر میں وہ دوسرا شعر بھی سن لیجیے جو انہوں نے پڑھا تھا۔

چلے چلیے کہ چلنا بھی دلیلِ کامرانی ہے
جو تھک کے بیٹھ جاتے ہیں وہ منزل پا نہیں سکتے

(۲۸ / جولائی ۱۹۹۶)

اردو شاعری اور آٹو رکشا

ادھر کچھ دنوں سے اردو زبان و ادب پر آٹو رکشا والوں کے احسانات کا خاصا ذکر ہونے لگا ہے۔ بعض افراد کا خیال ہیکہ یہ جو آٹو رکشا والے اپنے رکشا پر اردو کے شعر بڑے ذوق و شوق سے لکھواتے ہیں تو اس سے اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہو تا جا رہا ہے۔ یہ رکشا جہاں جہاں جاتے ہیں وہاں وہاں اردو بھی چلی جاتی ہے۔

جب تم چلو، زبان چلے، آسماں چلے

یوں بھی اردو اب ایک ایسی کمزور اور نحیف زبان بن گئی ہے کہ جو خود سے تو نہیں چل سکتی البتہ رکشا میں سوار ہو کر ضرور چلی جاتی ہے۔ یہ رکشا والوں کا کرم نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ وہ اردو کو اپنے رکشا میں سوار کر کے تو لے جاتے ہیں لیکن اس سے کوئی کرایہ وصول نہیں کرتے ورنہ رکشا والے کب کسی کو مفت میں لے جاتے ہیں۔ حکومت بھی اردو کے لئے کچھ کرتی ہے تو بھلے ہی کرایہ نہ مانگے اردو والوں سے "ووٹ" تو مانگ لیتی ہے۔

اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں یا اس پر احسان کرنے والوں کی فہرست اب لمبی ہی ہوتی چلی جارہی ہے۔ فلمیں بنانے والوں کا اردو پر احسان یہ ہے کہ وہ اپنی فلموں میں اردو کا استعمال کر رہے ہیں۔ مشاعروں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاتی ہے کہ جہاں جہاں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں وہاں وہاں اردو الفاظ کا چلن عام ہو جاتا ہے۔ قوالوں کا احسان یہ ہے کہ ان کے پروگراموں کے ذریعہ اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ فقیر بھی اردو کے محسن ہی ہیں جو اردو شعروں کی مدد سے بھیک مانگتے ہیں۔ اب اردو کے ان

میرا کالم

محسنوں میں آٹو رکشا والوں کا بھی اضافہ ہوگیا ہے ۔ اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو یا نہ ہو اسکے محسنوں کی تعداد میں اضافہ خود ایک خوش آئند بات ہے ۔ تاہم اس سلسلہ میں ایک صاحب نے آٹو رکشا والوں کی اردو خدمات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ آٹو رکشا والوں کو اردو کی مقبولیت میں اضافہ کا سبب جاننا سراسر غلطی ہے کیونکہ آٹو رکشا والے عموماً ایسے شعر اپنے رکشاؤں پر لکھواتے ہیں جن کا نہ کوئی سر ہوتا ہے اور نہ پیر۔ بے تکے سے شعر ہوتے ہیں جو اکثر بحر سے خارج ہوتے ہیں۔

اس اعتراض کے جواب میں ہماری عرض یہ ہے کہ آٹو رکشا سواری ہی ایسی ہے اس میں آدمی بیٹھے یا شعر اس کا بحر سے خارج ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے ۔ جن لوگوں کو آٹو رکشا میں بیٹھنے کا تجربہ ہے اور جو علم عروض سے بھی واقف ہیں وہ اس نکتہ کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سواری میں بیٹھنے کے بعد خود آدمی کا قافیہ نہ صرف تنگ ہو جاتا ہے بلکہ بسااوقات وہ اپنے وزن سمیت رکشا سے گر جاتا ہے۔ ہمیں یہ اعتراض بھی فضول سانظر آتا ہے کہ آٹو رکشاؤں پر لکھے جانے والے شعروں کا کوئی سر ہوتا ہے نہ پیر اور یہ کہ ان میں سے بیشتر اشعار میں کوئی معنی نہیں ہوتے ۔ شعر تو صرف شعر ہوتا ہے اس میں سر اور پیر کو تلاش کرنا بیوقوفی کی بات ہے ۔ پھر ان دنوں جس قسم کی شاعری ہو رہی ہے اس میں سر اور پیر کہاں ہوتے ہیں جو آٹو رکشا والوں سے اس بات کی توقع رکھی جائے کہ وہ اپنی شاعری میں سر اور پیر کی گنجائش فراہم کریں۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے ۔ پھر جدید شاعری میں ہمیں تو کوئی معنی نہیں نظر آتے ۔ جب مسلّمہ شاعروں پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو آٹو رکشا والوں کو کیوں مورد الزام ٹھہرایا جائے ۔ ہمیں تو آٹو رکشا والوں کی شاعری، جدید شاعری کے ہم پلّہ ہی نظر آتی ہے ۔ حالانکہ یہ بیچارے باضابطہ شاعر نہیں ہوتے ۔ یہ ضرور ہیکہ کبھی کبھار آٹو رکشاوالوں سے "املا" کی غلطیاں یقیناً سر زد ہوجاتی ہیں لیکن ان کی ان غلطیوں سے بھی شعر میں نئے معنی اور مفہوم پیدا ہو جاتے ہیں ۔ بہت عرصہ پہلے ہم نے ایک آٹو رکشا پر علاّمہ اقبالؔ کا مشہور شعر اس طرح لکھا ہوا دیکھا تھا۔

نہیں تیرا نشیمن "خسر سلطانی" کی گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

آٹو رکشا والا چونکہ "قصر سلطانی" سے واقف نہیں تھا اس لئے اس نے "خسر سلطانی" لکھا تھا اور "خسر سلطانی" لکھ کر اور اپنے خسر کے گھر میں اپنا نشیمن نہ بنا کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنی محنت کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتا ہے اور "گھر داماد" ہر گز نہیں بننا چاہتا۔ دیکھا جائے تو املا کی اس غلطی سے علامہ اقبال کے شعر میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی تھی۔

رکشاؤں پر لکھی جانے والی تحریروں میں بعض اوقات "قول محال" کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر رکشاؤں پر لکھا ہوتا ہے۔ "ماں کی دعا" ۔ یہ عبارت قول محال نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک آدمی رکشا چلا رہا ہے لیکن پھر بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ رکشا محض اس لئے چلا رہا ہے کہ اس میں "ماں کی دعا" شامل حال ہے۔ اگر "ماں کی دعا" سچ مچ شامل حال رہتی تو وہ رکشا کیوں چلاتا۔ کسی پارٹی کا نیتا نہ بن جاتا۔ پھر بھی رکشا والے کے جذبہ قناعت اور وسیع القلبی کی داد دیجئے کہ وہ رکشا چلانے کو بھی "ماں کی دعا" سمجھتا ہے۔ حالانکہ رکشا چلانے کو "ماں کی دعا" نہیں بلکہ "باپ کی بددعا" سمجھنا چاہئے۔ یوں بھی ان دنوں "ماں کی دعا" اتنی اثر انگیز نہیں ہوتی جتنی کہ "باپ کی بد دعا" ہوتی ہے۔ جو آٹو رکشا والے اپنے رکشاؤں پر "ماں کی دعا" والی عبارت لکھواتے ہیں ہم تو انہیں طنز نگار بھی سمجھتے ہیں۔ اس عبارت کے ساتھ رکشا چلانے کے عمل میں ہمیں تو طنز کی ایک گہری کاٹ دکھائی دیتی ہے۔

بعض رکشاؤں پر ایک طرف تو ہمیں نہایت اعلیٰ وارفع اشعار نظر آتے ہیں جن میں اخلاقی اقدار کی حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے تو دوسری طرف بعض رکشاؤں پر ایسے عاشقانہ اور فاسقانہ اشعار بھی نظر آتے ہیں جو آپ کے جذبات میں خواہ مخواہ ہلچل سی پیدا کر دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو زندگی دو انتہاؤں کے بیچ اعتدال پیدا کرنے کا ہی نام ہے۔

آٹو رکشاؤں اور اردو شاعری کی بات چل نکلی ہے تو ہمیں تیس برس

پہلے کے ایک رکشا والے کی بھی یاد آگئی جس کے رکشا میں ہم نہایت پابندی سے بیٹھا کرتے تھے ۔ لیکن رکشا چلانے والا خود بہ نفس نفیس شاعر تھا ۔ اسے جب اچانک پتہ چلا کہ ہمارا بھی تھوڑا بہت تعلق لکھنے پڑھنے سے ہے تو اس نے ایک دن ہمیں ایک شعر سنایا ۔ شعر ہمیں پسند آیا اور ہم نے داد دی تو اس نے اچانک رکشا کو روک دیا اور خالص شاعرانہ انداز میں ہمیں یوں سلام کرنے لگا جیسے شعر کی داد وصول کر رہا ہو ۔ جو فاصلہ ہم عموماً تین منٹ میں طے کرتے تھے اس دن آدھے گھنٹہ میں طے ہوا کیونکہ ہماری داد کے جواب میں اسے بار بار رکشا کو روک کر اترنا پڑتا تھا اور سلام کرنا پڑتا تھا ۔ اس انکشاف کے بعد سے وہ ہمیشہ ہماری سواری میں رہنے لگا ۔ اگرچہ وہ رکشا چلاتا تھا لیکن ادب کے وسیلہ سے وہ ہمارا دوست بن گیا تھا ۔ پتہ چلا کسی زمانے میں وہ باضابطہ شعر کہتا تھا لیکن جب اس کے خاندان والوں نے کہا کہ اسے شاعری کرنے کے علاوہ کوئی شریفانہ کام بھی کرنا چاہیئے تو اس نے رکشا چلانا شروع کردیا ۔ دیکھا جائے تو وہ ان شاعروں سے ہزار درجہ بہتر تھا جو صرف شعر کہتے ہیں اور شعر کہنے کے سوا کوئی اور کام نہیں کرتے (بشرطیکہ شعر کہنے کو کام سمجھا جائے) ہم نے اس سے ایک دن کہا کہ وہ مشاعروں میں اپنا کلام کیوں نہیں سناتا تو کہنے لگا " حضور ! یہ زمانہ شاعروں کا نہیں متشاعروں کا ہے ۔ ان متشاعروں نے اپنا " تحسین باہمی " والا ایک گروپ بنا لیا ہے اور مشاعروں میں ان ہی کی اجارہ داری چلتی ہے ۔ اگر آپ اس گروپ سے تعلق نہ رکھتے ہوں تو آپ کو مشاعروں میں نہیں بلایا جاتا ۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن اپنی انا کا سودا نہیں کر سکتا ۔ شعر اچھے کہتا ہوں تو کیا ضروری ہے کہ مشاعروں میں بھی کلام سناؤں ۔ میں تو اپنی تسکین کے لیئے شعر کہتا ہوں ۔ دوسروں سے مجھے کیا غرض " ۔ وہ ایک بے لوث شاعر تھا لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ زمانے نے اس کی قدر نہیں کی ۔ وہ ہر شام کو ہمیں گھر لے جانے کے لئیے ہمارے دفتر پہنچ جاتا تھا ۔ ایک شام وہ دفتر آیا مگر ہم دفتر میں نہیں تھے ۔ دوسرے دن اس نے شکایت کی تو ہم نے کہا " بھئی ! کل شام ہم ایک محفلِ شعر میں چلے گئے تھے جو مخدوم محی الدین صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی " یہ سنتے ہی وہ

اداس سا ہو گیا۔ کہنے لگا" صاحب! ان سینیئر شاعروں کی وجہ سے ہم جیسے جونیر شاعروں کو پہنچنے کا موقع نہیں ملتا۔ کل میں آپ کے لئے ایک نئی غزل لکھ کر لے آیا تھا۔ آپ کو سنانے کی بڑی تمنا تھی لیکن آپ بھی سینیئر شاعروں کے چکر میں پڑ گئے "

اس کی بات چونکہ معقول تھی اس لئے ہم نے ازراہ ہمدردی اس دن نہ صرف اس کی تازہ غزل سنی بلکہ اس پر اتنی داد دی کہ ایک مرحلہ پر ہم نے یہ پیش کش کی کہ رکشا ہم چلائیں گے اور وہ پیچھے بیٹھ جائے۔ کیونکہ ہماری داد کے جواب میں اسے سلام کرنے کے لئے بار بار رکشا سے اترنا پڑتا تھا۔

ہماری پیش کش کے جواب میں اس کی آنکھوں میں اچانک آنسو آگئے۔ ہماری سخن فہمی کی داد دیتے ہوئے کہنے لگا" آپ جیسے سخن فہم حضرات دو چار اور پیدا ہو جائیں تو ادب کی صورتحال کیا سے کیا ہو جائے گی "۔ ہم نے اسے سمجھایا کہ" قدرت تم جیسے انمول شاعروں اور ہم جیسے بے مثال سخن فہموں کو پیدا کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیتی ہے۔ زمانہ میں اچھے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں "۔ رکشا چلانے والا یہ شاعر ہمیں اب بھی اکثر یاد آتا ہے۔ کبھی ہمارے پاس رکشا کا کرایہ دینے کے پیسے نہیں ہوتے تھے تو کہتا تھا" مال و متاع، دولت و ثروت سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ جب آپ کے پاس آجائیں تو دیدیجئے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے "۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی مقصود تھا۔ ہم اچانک دہلی چلے گئے اور ہم اسے کرایہ کی باقی رقم ادا نہ کر سکے۔ بعد میں ہم نے اسے بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا۔ اردو زبان کے بے لوث اور خاموش خدمت گذار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ جہاں کرایہ دینا چاہیئے وہاں داد دے کر انجان بن جاتے ہیں۔

(۱۶ / فروری ۱۹۹۷ء)

انتظار حسین اور جیلانی بانو کو مبارکباد

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دوحہ قطر کی ادبی تنظیم مجلس فروغ ادب ہر سال اردو کے دو ادیبوں کو انعامات دیتی ہے جن میں سے ایک انعام پاکستان کے کسی ادیب کو اور دوسرا انعام ہندوستان کے کسی ادیب کو دیا جاتا ہے۔ اس بار یہ انعام ہندوستان کی افسانہ نگار جیلانی بانو اور پاکستان کے افسانہ نگار انتظار حسین کے حصہ میں آیا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ پہلے ہی سے ہمارے جی کو یہ دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ اس بار انعاموں کے اس موسم میں ضرور کوئی بڑا انعام کسی ایسے ادیب کو ملے گا جس سے ہمارے قریبی مراسم رہے ہوں۔ اس انعام کا اعلان ہوا تو احساس ہوا کہ یہاں تو معاملہ یک نہ شد دو شد والا ہے۔ انتظار حسین اور جیلانی بانو ہمارے نہ صرف پسندیدہ افسانہ نگار ہیں بلکہ ان دونوں سے ہمارے قریبی مراسم بھی رہے ہیں۔ ایک اور بات کی وضاحت ہم پہلے ہی کر دینا چاہتے ہیں کہ جب دوستوں کو انعامات ملتے ہیں تو ہمیں سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہماری یہ خوشی خود ان اصحاب کی خوشی سے بھی زیادہ ہوتی ہے جنہیں یہ انعامات ملتے ہیں۔ یوں بھی ہم بے انتہا ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ اور بھلے ہی دوستوں کا دکھ درد نہ بانٹ سکیں ان کی خوشیوں میں تو بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ خود ہمیں کوئی بڑا انعام آج تک نہیں ملا۔ ویسے ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جو دے اس کا بھی بھلا۔ اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ پیسہ اور مال و متاع سے ہمیں یوں بھی کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ ہم نے پیسہ کو ہمیشہ ہاتھ کا میل سمجھا (بشرطیکہ یہ میل دوسرے کے ہاتھ پر ہو) اس ضمن میں ہماری بے نیازی اور استغنا مسلّمہ ہے۔

البتہ جب دوستوں کو انعامات ملتے ہیں تو ہم ان سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ آپ نے اس ماں کا قصہ تو سنا ہوگا جو اپنے لاڈلے کو اسکول میں بھرتی کرانے کے لئے گئی تو کلاس ٹیچر سے کہا "محترمہ! میرا بیٹا بڑا حساس اور جذباتی ہے۔ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو خدارا آپ اسے کوئی سزا نہ دیں البتہ اس کے برابر بیٹھنے والے طالب علم کو سزا دیدیں تو یہ اپنے آپ راہ راست پر آجائے گا"۔ ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہمارے کسی ادیب دوست کو انعام ملتا ہے تو ہم بے پناہ خوش ہوتے ہیں اور خود بخود راہ راست پر آجاتے ہیں۔ پھر انتظار حسین اور جیلانی بانو۔ یہ دونوں ہمارے ادب کی ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے ایوارڈ حاصل کرنے کی دوڑ میں کبھی سنجیدگی سے حصہ نہیں لیا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں ہمارے بعض ادیب دوست انعامات حاصل کرنے کیلئے ہمیشہ دوڑتے ہی رہتے ہیں۔ اردو کے ایک ادیب اور دانشور کے بارے میں تو یہاں تک سنا ہے کہ انہیں ہر ہفتہ ہی نہیں بلکہ ہر روز کوئی نہ کوئی انعام مل جاتا ہے۔ ایک دن ان کی بیوی نے ہمارے سامنے یہاں تک کہا تھا کہ اگر آج شام میں گھر واپس ہوتے وقت آپ کے ہاتھ میں انعام کی کوئی ٹروفی، شیلڈ یا سند وغیرہ نہ ہو تو بازار سے گھر کے لئے ایک کیلو گوشت لیتے آیئے۔ آپ کے ہاتھ چونکہ خالی نہیں رہتے اسی لئے میں آپ کو سودا سلف لانے کیلئے نہیں کہتی"۔ دروغ برگردن راوی ایک بار یہ بیمار ہوگئے اور جب ان کے فیملی ڈاکٹر کو فون پر ان کی علالت کی اطلاع دی گئی تو ڈاکٹر نے پوچھا "موصوف کو اس ہفتہ کتنے انعامات ملے ہیں؟" جواب ملا "اتفاق سے اس ہفتہ تو انہیں ایک بھی انعام نہیں ملا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی ایک ٹروفی لے کر آپ کے ہاں آرہا ہوں۔ انشاء اللہ وہ فوراً صحت یاب ہوجائیں گے"۔

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ مجلس فروغ ادب نے اس سال سے ایوارڈ کی رقم فی کس ایک لاکھ روپئے سے بڑھا کر سوا لاکھ روپیہ کردی ہے۔ مگر یہ سوا لاکھ کی رقم ہمیں بچی نہیں کیونکہ اردو محاورہ کے حساب سے ہمارے ہاں تو مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ زندہ ادیبوں کا کچھ تو خیال رکھا جاتا۔ رقم کو بڑھانا ہی تھا

تو ڈیڑھ لکھ کردیتے ۔ اس طرح اردو کے محاورہ پر بھی آنچ نہ آتی ۔ سانپ بھی نہ مرتا اور لاٹھی بھی ٹوٹ جاتی ۔ خیر!

انتظار حسین اور جیلانی بانو دونوں سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے ۔ بیس برس پہلے انتظار حسین ایک سیمنار میں شرکت کیلئے ہندوستان آئے تھے تو ان سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی ۔ اس کے بعد وہ کئی بار ہندوستان آچکے ہیں اور ہمیں ان کی صحبت سے مستفید ہونے کے بیسیوں مواقع مل چکے ہیں ۔ وہ ہمارا کتنا خیال رکھتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار ہم نے ان سے کہا کہ وہ ہماری خاطر مزاح نگار بن جائیں تو فوراً بن گئے اور ہمارے ساتھ زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ لطیفہ گوئی کی محفل میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ ویسے انتظار حسین پاکستان کے معروف کالم نگار بھی ہیں۔ اب تو اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی کالم لکھتے ہیں (ہمارے بارے میں بھی دو تین کالم لکھ چکے ہیں ۔) ان کے ناول "بستی" کی برصغیر میں بڑی دھوم ہوئی ۔ ہندی میں بھی انکی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں بلکہ ہمیں تو وہ ہندی حلقوں میں زیادہ مقبول نظر آئے ۔ انتظار حسین نے پرانی داستانوں کے کرداروں اور ان کی فضا کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ آج کی کہانی میں پھر سے رائج کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں یہ کردار ایک طاقتور استعارہ بن گئے ہیں ۔ انتظار حسین اگرچہ نہایت کم گو اور کم آمیز ہیں لیکن اپنی کہانیوں میں جب وہ بولنا شروع کرتے ہیں تو ماضی ، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کی گونج ان میں صاف سنائی دیتی ہے ۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ میرٹھ میں رہتے تھے مگر اب میرٹھ ان کی کہانیوں میں رہتا ہے ۔ لاہور میں بھی انہیں نیم کے وہ پیڑ اکثر یاد آتے ہیں جنہیں وہ اپنی نوجوانی کے دنوں میں میرٹھ میں چھوڑ آئے تھے ۔ کوئی اپنی محبوباؤں کو بھی اس طرح یاد نہیں کرتا جس طرح وہ نیم کے پیڑوں کو یاد کرتے ہیں ۔ میرٹھ ہم بھی کئی بار گئے ہیں اور محض انتظار حسین کی خاطر ہم نے وہاں نیم کے پیڑوں کو بغور دیکھا ہے۔ ہمیں تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ لیکن انتظار حسین کی کہانیوں میں پہنچ کر ان پیڑوں کی خاصیت بدل جاتی ہے ۔ انتظار حسین کی نیم چڑھی کہانیوں کی بات ہی الگ ہوتی ہے ۔ انتظار حسین اپنے

nostalgia کے لئے بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں اور اس شہرت کے حوالے سے ان کی ہجرت کی خوشبو بھی خاصی مشہور ہوگئی ہے۔

جیلانی بانو کے بارے میں ہم کیا عرض کریں۔ ان سے ہمارے کئی رشتے ہیں۔ ایک رشتہ تو یہی ہے کہ وہ حیدرآبادی ہیں۔ اور کسی حیدرآبادی کا حیدرآباد میں رہ کر نام کمانا کوئی معمولی بات نہیں ہے کیونکہ یہاں عزت اسی کو ملتی ہے جو وطن سے نکل جاتا ہے۔ (جیسے ہم نکل گئے تھے۔ خیر اس کے بعد بھی عزت نہیں ملی یہ ایک الگ کہانی ہے) دوسرا رشتہ یہ ہے کہ وہ ہمارے بزرگ اور مشفق علامہ حیرت بدایونی مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ تیسرا رشتہ یہ کہ ان کے دو چھوٹے بھائی پروفیسر افضل محمد اور احمد جلیس مرحوم ہمارے بے تکلف دوست رہے ہیں۔ چوتھا رشتہ یہ کہ ان کے شوہر پروفیسر انور معظم عثمانیہ یونیورسٹی میں اگرچہ ہم سے کچھ سینئر رہے لیکن ان سے ہمارے برسوں کے دوستانہ مراسم ہیں۔ پانچواں رشتہ یہ کہ ضرورت شعری کے تحت وہ مزاح نگاری بھی کرلیتی ہیں۔ چھٹا رشتہ یہ کہ انہوں نے بھی حیدرآباد کے اس ہنگامہ پرور ادبی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جن میں ہم نے بھی ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یوں بھی اس زمانہ میں علمی و ادبی گھرانوں میں پیدا ہونے کا فیشن عام تھا۔ یادش بخیر! نوجوانی کے دنوں میں ایک دوست سے ہماری اس بات پر ان بن ہوگئی تھی کہ ہم دونوں میں سے کس نے علمی و ادبی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ ایک مرحلہ پر ہم نے اپنے دوست سے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ، تمہاری پیدائش کس جگہ ہوئی تھی؟" اس نے کہا "میری پیدائش وکٹوریہ زنانہ ہسپتال میں ہوئی تھی" اس پر ہم نے اپنا سینہ تان کر کہا تھا "کھا گئے نا مات بھیا! ہم تو آصفیہ لائبریری میں پیدا ہوئے تھے۔ جہاں ہمارے چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں"۔ بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ جیلانی بانو باکمالوں talented persons کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ان کے ایک بھائی آرٹسٹ اور فوٹو گرافر ہیں اور فرزند میاں فرحان کمپیوٹر انجینیر ہیں۔ اور ایسا خاندان ٹیلی ویژن سیریل بنانے میں ہمیشہ بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ جیلانی بانو نے بھی ایک ٹی وی سیریل

بنایا جس کی کہانی، مکالمے اور اسکرین پلے تو خود جیلانی بانو نے لکھے تھے۔ پس منظر میں آواز پروفیسر انور معظم کی تھی۔ ہمارے دوست احمد جلیس مرحوم نے اس میں ویلن کا کردار ادا کیا تھا۔ آرٹ ڈائرکشن اور فوٹو گرافی کے فرائض ان کے بھائی نے انجام دیئے تھے اور فرزند میاں فرحان نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ حد تو یہ کہ اس سیریل میں ایک بلّی بھی دکھائی گئی تھی جو ان ہی کے گھر میں پلی تھی۔ ہمہ خاندان آفتاب است اسی کو کہتے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا ان کے سیریل میں ایک غیر ملکی خاتون کا رول بھی تھا۔ اتفاق سے ان دنوں ہماری روسی دوست ایرینا ہندوستان آئی ہوئی تھیں۔ جیلانی بانو کو ایرینا کے بارے میں بتایا تو کہا ایرینا کو فوراً حیدرآباد روانہ کرو۔ چنانچہ ایرینا حیدرآباد گئیں اور سیریل میں اداکاری بھی کی۔ مگر اس سیریل کا کلائمکس اس وقت رونما ہوا جب اسے ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ بخدا ہمارے ایک دوست نے ایرینا والے سین کو دیکھ کر ہم سے نہایت معصومیت سے پوچھا تھا "کیا جیلانی بانو کے خاندان کے کسی فرد نے کسی روسی خاتون سے شادی کرلی ہے؟" خیر یہ تو ایک ایسی بات تھی جو ہمیں اچانک یاد آگئی۔ کیا کریں ہمیں باتیں بھی تو ایسی ہی یاد رہتی ہیں۔ جیلانی بانو کی تحریروں میں ہمیں حیدرآباد جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ ان کا مشہور ناول "ایوان غزل" تو حیدرآباد کے پورے ایک دور کی جیتی جاگتی تصویر کو پیش کرتا ہے۔ جیلانی بانو عوامی سطح پر بھی سرگرم عمل رہی ہیں۔ کچھ برس پہلے جب فرقہ پرستی نے سر اُبھارنا شروع کیا تھا تو انہوں نے ادیبوں اور فنکاروں سے اپیل کی تھی کہ وہ خاموش نہ رہیں اور سڑکوں پر نکل آئیں۔ ہم تو خیر شروع ہی سے سڑکوں پر پائے جاتے رہے ہیں۔ اسی لئے ہمیں سڑک پر آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ دوسروں کا حال ہم نہیں جانتے۔ البتہ دو چار شاعروں کے بارے میں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ انہوں نے جیلانی بانو کی اپیل کی روشنی میں شعر کہنے کی رفتار بڑھا دی تھی۔ پہلے ہفتہ میں ایک غزل کہتے تھے تو اب روزانہ دو چار غزلیں کہنے لگے۔ اس پر ہم نے انہیں سمجھایا کہ بھیا! تمہارے شعری سرمایہ میں جس طرح اضافہ ہو رہا ہے اس سے بہتر تو یہی ہے کہ ملک میں فرقہ پرستی پھیل جائے۔ فرقہ پرستی کا تو ہم کسی طرح مقابلہ

کرلیں گے لیکن تمہاری شاعری کو برداشت کرنا اور اس کا مقابلہ کرنا ہمارے بس کی
بات نہیں ہے ۔ جیلانی بانو نے لگ بھگ پچھلی نصف صدی کو نہایت باشعور
ڈھنگ سے تخلیقی سطح پر برتا اور محسوس کیا ہے اور اس کا بھر پور اظہار اُن کی
کہانیوں میں ہوا ہے ۔ ان کا تخلیقی سرمایہ بلاشبہ ہمارے عصری ادب کا اہم حصّہ
ہے ۔ اس موقع پر ہم نہ صرف جیلانی بانو کو بلکہ خود اہل حیدرآباد کو بھی مبارک
باد دینا چاہتے ہیں کیونکہ یہ اعزاز نہ صرف جیلانی بانو کے حصہ میں آیا ہے بلکہ
حیدرآباد کے حصہ میں بھی آیا ہے ۔ (۲۶/ اپریل ۱۹۹۸ء)

کچھ امجد اسلام امجد کے بارے میں

صاحبو یہ تو ہم کہنا ہی بھول گئے کہ دوبئی کے واپسی کے سفر میں ہم نے کچھ گھنٹے لاہور میں بھی گزارے تھے ۔ وہ لاہور جس کے بارے میں کہاوت ہے کہ " جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا ۔" ہمیں اچانک بتایا گیا کہ دوبئی سے واپسی کے لئے ہماری نشست پی آئی اے کی جس پرواز میں بک کرائی گئی ہے وہ پسینجر ٹرینوں کی سی شان رکھتی ہے ۔ گویا یہاں نکلی وہاں ڈوبی وہاں ڈوبی یہاں نکلی والا معاملہ ہے ۔ پتہ چلا پہلے تو یہ پرواز پشاور جائے گی اور وہاں سے لاہور جائے گی ۔ پھر لاہور میں آٹھ دس گھنٹے آرام کرے گی اور وہاں سے دہلی کے لئے رخت سفر باندھے گی ۔ منتظمین نے سوچا تھا کہ ہم اس پیدل جانے والی پرواز کی بابت جان کر یقیناً ناراض ہونگے لیکن یہ سن کر ہماری باچھیں کھل اٹھیں تو پوچھا " آپ کی اس غیر متوقع خوشی کا راز کیا ہے ؟ " ہم نے کہا " اس خوشی کا راز یہ ہے کہ لاہور میں ہمارا دوست امجد اسلام امجد رہتا ہے ۔ اس بہانے اس سے ملاقات ہوجائے گی ۔ یہ نہ ملے تو احمد ندیم قاسمی ، انتظار حسین ، منیر نیازی ، انور سدید ، اظہر جاوید ، اجمل نیازی کتنے نام گنائیں ۔ کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائیگا " ہمارا طیارہ لاہور پہنچا تو صبح کے سات بج رہے تھے ۔ ہم نے ایمگریشن عہدیدار سے کہا " میاں ہمیں چاہے جس ہوٹل میں بھی ٹھہراؤ لیکن وہاں پہنچانے سے پہلے ہماری ایک خواہش کی تکمیل کرو یعنی ہمارے دوست امجد اسلام امجد سے ذرا ہماری بات کرادو ۔ " پوچھا " آپ امجد صاحب کو جانتے ہیں ؟ " ہم نے اثبات میں جواب دیا تو بولا " جناب ایسی بات ہے تو آپ بھی میری ایک خواہش کی تکمیل کریں ۔ جب آپ امجد صاحب سے بات کریں تو آخر میں میری

بات بھی کرادیں۔ وہ میرے پسندیدہ رائٹر ہیں "۔ ایمگریشن افسر نے امجد کے گھر فون ملایا تو پتہ چلا کہ اس دن لاہور میں ہونے والی کسی سائنسی نمائش کے انتظامات کے سلسلہ میں امجد صبح صبح گھر سے نکلا ہے۔ (امجد ان دنوں اردو سائنس بورڈ پاکستان کا ڈائرکٹر جنرل ہے۔ ہمارا دوست ہے تو کیا ہوا بڑی توپ چیز ہے)۔ ہم نے اس کی بیٹی کو اپنا حال سنایا اور بتایا کہ پی آئی اے والے ہمیں نہ جانے کہاں ٹھہرائیں گے یہ ہم نہیں جانتے۔ امجد سے کہنا وہ پتہ کر لے اور دن میں تین بجے سے پہلے ہم سے مل لے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی ورنہ یہ پنچھی اڑ جائے گا۔ امجد کے گھر فون کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ایمگریشن افسر نے کسی سے کچھ کہا اور ہمیں ہوٹل ایگزیکٹیو کے اس کمرہ میں ٹھہرایا گیا جو خصوصی مہمانوں کیلئے مختص ہوتا ہے۔ یہ انگریزوں کے زمانہ کا ہوٹل لگتا ہے۔ کمرہ کے رکھ رکھاؤ اور فرنیچر وغیرہ سے ایسا لگتا تھا جیسے انگریز ابھی ابھی کمرہ سے باہر گیا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر کہے گا " ویل تم ادھر میں کیسا آگیا۔ چلو بھاگو یہاں سے "۔

امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی لاہور شہر کی دو ایسی کنجیاں ہیں جو ہمیشہ ہمارے پاس رہتی ہیں ورنہ ڈپلیکیٹ چابیاں تو کئی ہیں۔ عطاالحق قاسمی کے بارے میں تو معلوم ہوگیا تھا وہ اب پاکستان کا سفیر بن کر ناروے چلاگیا ہے (یوں بھی وہ پاکستان میں رہتا کب تھا۔ ہمیشہ باہر ہی گھومتا رہتا تھا) یہ اچھا ہی ہوا کہ اس کا تقرر ناروے میں عمل میں آگیا ورنہ اسے مجبوراً باربار پاکستان واپس آنا پڑتا تھا۔ دس برس پہلے ہم لاہور آئے تھے تو ہمارا قیام عطاالحق قاسمی کے پاس ہی تھا۔ عطا سے ہماری ملاقات سترہ اٹھارہ برس پہلے دلی میں ہوئی تھی جب وہ غالباً انبالہ کے مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے ہندوستان آیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد عطا پھر دلی آیا تو امجد اسلام امجد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ قہقہہ بردوش اور خندہ برلب عطا اور امجد کی دوستی بلکہ جوڑی بڑی پرانی ہے۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان کے ایک "کرم فرما" تو یہاں تک کہتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے الزام اور ملزم کا درجہ رکھتے ہیں۔ موسیقی میں جس طرح شنکر جے کشن اور کلیان جی آنند جی وغیرہ کی جوڑیاں مشہور

ہیں اسی طرح اردو ادب میں عطا اور امجد کی جوڑی بھی مشہور ہے۔ دونوں ایسے فقرے باز اور لطیفہ باز ہیں کہ اگر یہ کسی جگہ موجود ہوں تو ان دونوں کے سوائے کسی اور کا سنجیدہ رہنا ناممکن سا ہوجاتا ہے۔ ہمیں دلی اور لاہور کی ایسی بیسیوں محفلیں یاد ہیں جن میں ان دونوں یار ان طرحدار کی رفاقتیں ہمیں میسر آئیں (عطاالحق قاسمی تو حیدرآباد بھی آچکا ہے) ایسی ہی ایک محفل کے بعد ہمارے پیٹ میں پیچ پیچ کچھ اتنے بل پڑگئے کہ انہیں کھلوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ اس پر ڈاکٹر نے کہا تھا "زندگی میں پہلی بار پتہ چل رہا ہے کہ ہنسی صحت کے لیے مضر بھی ہوسکتی ہے"۔ امجد اسلام امجد پاکستانی ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ وہ ایک پرگوشاعر، صاحب طرز نثرنگار، ڈرامہ نگار، سفر نامہ نگار، کالم نگار اور کئی طرح کا نگار ہے۔ اس کا لکھا ہوا ٹی وی سیریل "وارث" اتنا مقبول ہوا کہ اب یہ سیریل اس کی بنیادی شناخت بن گیا ہے۔ بہت برس پہلے دلی میں جب امجد سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو ہم نے کہا تھا "یوں تو اسلام ہر جگہ خطرہ میں اور سخت مشکل میں ہے لیکن تمہارے نام میں تو یہ کچھ زیادہ ہی مشکل میں نظر آتا ہے کیونکہ تم نے اسے دو امجدوں کے بیچ میں پھنسا کر اس کا "سینڈوچ" بنا رکھا ہے۔ ہنس کر بولا "میں نے اسے حفاظت کی خاطر دو ناموں کے بیچ میں رکھا ہے تاکہ جو بھی آنچ آئے تو وہ میرے نام پر آئے اسلام پر نہ آئے"

ہوٹل ایکزیکٹیو پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ہمارے کمرہ کا ٹیلی فون کام کررہا ہے۔ ہم نے مخدومی احمد ندیم قاسمی کو فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ گیارہ بجے کے بعد دفتر آئیں گے۔ انتظار حسین کو فون کیا تو خود انہوں نے فون اٹھالیا۔ جب ہم نے بتایا کہ ہم لاہور سے بول رہے ہیں تو حیرت میں پڑگئے۔ پھر جب یہ پتہ چلا کہ ہم بہ وجوہ ان سے ملنے سے قاصر ہیں تو دکھی بھی ہوئے۔ بار بار کہتے تھے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم لاہور آؤ اور مجھ سے نہ ملو۔ ان سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ ہم نے فون رکھا ہی تھا کہ امجد اسلام امجد کا فون آگیا بولا "یار تمہارا فون کب سے مصروف ہے میں ملا ملا کر تھک گیا۔ پتہ نہیں تم کن غیر ضروری لوگوں

سے باتیں کرنے میں مصروف ہو"۔ جب ہم نے بتایا کہ انتظار حسین صاحب سے باتیں ہورہی تھیں تو خوب ہنسا۔ بولا "ابھی کچھ دیر پہلے میری بیٹی نے سیلولر فون پر تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تو پی آئی اے کے سارے بڑے عہدیداروں کو پریشان کرکے تمہارے ٹھکانے کا پتہ لگایا ہے۔ میں ابھی تمہارے پاس آرہاہوں۔"

پھر دس برس پہلے لاہور میں گزاری ہوئی کتنی ہی محفلیں یاد آگئیں۔ لاہور میں ہماری اکثر شامیں منیر نیازی کے گھر پر گزرتی تھیں جو راوی کے اس پار اور کسی حد تک امرتسر سے قریب واقع ہے۔ پورے چاند کی ایک رات ہم برادر عزیز اجمل نیازی کے اسکوٹر پر منیر نیازی کے گھر سے واپس ہورہے تھے کہ راوی کے کنارے اجمل کا اسکوٹر پھسل کرگرپڑا۔ ہمارے پاؤں میں ہلکی سی چوٹ بھی آئی تھی اور اجمل نیازی اس چوٹ سے اسقدر حواس باختہ ہوگیا تھا کہ لگتا تھا یہ چوٹ ہمارے پاؤں میں نہیں دل میں لگی ہے۔ دس برس پہلے کا یہ واقعہ یاد آیا تو ہمیں ہنسی بھی آگئی۔ اجمل اس رات تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہمارے کمرہ میں آتاتھا اور ہماری چوٹ کا حال پوچھ کرچلا جاتا تھا۔ کیا مجال جو اس رات اس نے ہمیں ذرا بھی سونے دیا ہو۔ ایک مرحلہ پر تو ہمیں کہنا پڑا "یار اجمل چوٹ میں تو ویسے کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن تم جس طرح اس کا حال پوچھ رہے ہوتواس سے اب چوٹ کا درد بڑھنے لگا ہے۔" کہتے ہیں عقلمند کو اشارہ کافی ہوتاہے۔ لیکن اجمل ایسا عقلمند نکلا کہ اشارہ بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ دوسرے دن ہم نے عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد، حسن رضوی اور سعادت سعید کو یہ قصّہ سنایا تو سب کا ہنس ہنس کر براحال ہوگیا۔ ہم کتنے ہی کرم فرماؤں اور دوستوں کو فون ملانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ امجد آندھی کی طرح آگیا۔ اس دن اردو سائنس بورڈ پاکستان کی طرف سے دن میں گیارہ بجے سائنسی کتابوں کی نمائش کا افتتاح ہونے والا تھا۔ کہنے لگا تم فوراً میرے ساتھ چلو۔ نمائش میں بھی شرکت کرلینا، پھر ہم دوستوں کی طرف چلیں گے اور ہاں تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی 145 سائنسی کتابوں کے مسودے بھی اس

نمائش میں رکھے گئے ہیں۔ کم از کم اب تو چلو۔ یوں امجد نے ہماری علاقائی عصبیت کو بھی چھیڑنے کی کوشش کی۔ امجد اپنی تازہ تصانیف کے ساتھ آیا تھا۔ کہنے لگا تمہیں کچھ اور چاہیے تو بتانا۔ ہم نے کہا یار تمہارا نوجوان مزاح نگار یونس بٹ ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں حس مزاح اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ پتہ نہیں وہ خود اپنے آپ میں کس طرح اور کہاں رہ لیتا ہے۔ بس ذرا زبان کے استعمال کے معاملہ میں محتاط اور چابکدست ہوجائے تو کیا کہنے۔ امجد نے ہنس کر کہا "اچھا تو اب تم جیسا حیدرآبادی بھی اہل زبان ہونے کا دعویٰ کرنے لگا" ہم نے کہا "پچیس برس تک دہلی میں رہنے کا یہی ایک نقصان عظیم تو ہوا ہے"۔ پانچ دن پہلے دہلی سے دوبئی جاتے ہوئے ہم نے طیارہ میں "جنگ" کے ایک شمارہ میں پڑھا تھا کہ امجد نے احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنائی ہے۔ ہم نے اس دستاویزی فلم کے بارے میں پوچھا تو اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے بولا "میں تو بھول ہی گیا۔ تمھیں تو یہ فلم ضرور دینی ہے۔ تم کسی طرح اب میرے ساتھ چلو بلکہ کچھ دن لاہور میں رک جاو۔ میں بندوبست کرا دیتا ہوں"۔ ہم نے کہا "میاں امجد تم اردو سائنس بورڈ کے ڈائرکٹر جنرل ہو۔ اب سے کچھ دیر بعد تمہارے دفتر میں سائنسی کتابوں کی نمائش ہورہی ہے وہاں جاو اور اپنے فرائض منصبی کو پورا کرو"۔ ہنس کر بولا "تم یہ بات اسطرح کہہ رہے ہو جیسے بالکل نہیں جانتے کہ برصغیر میں عہدیداران اعلیٰ اپنے فرائض منصبی سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں"۔ ہم نے امجد کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے بھی ہمارے لئے اتنا سارا وقت نکال لیا۔ امجد کے جانے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کرنا چاہا تو دروازہ پر دستک ہوئی۔ یہ امجد کا ڈرائیور تھا جس کے ذریعہ امجد نے احمد ندیم قاسمی سے متعلق دستاویزی فلم روانہ کی تھی۔ وہ گیا تو تھوڑی دیر بعد پھر دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس بار لاہور کے گورا پبلشرز کے منیجنگ ڈائرکٹر افتخار احمد کا آدمی ہاتھوں میں کتابوں کا بھاری بنڈل اٹھائے کھڑا تھا۔ پتہ چلا امجد نے افتخار احمد کو یونس بٹ کی کتابوں میں ہماری دلچسپی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ یہ آدمی بیس پچیس کتابوں کا بھاری بنڈل اٹھائے

گھرا تھا۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یونس بٹ اتنا کثیرالتصانیف ادیب ہے۔ بہرحال چند گھنٹوں میں امجد نے جو محبت ہم پر نچھاور کی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ جی تو بہت چاہا کہ ہم لاہور میں کچھ دن رک جائیں۔ لاہور صحیح معنوں میں پاکستان کا ادبی، ثقافتی اور سماجی مرکز ہے۔ کیسی کیسی نامور ہستیاں اس شہر نے پیدا کی ہیں ان کے تصور ہی سے یہ شہر ہماری ذات میں پھیلنے لگ جاتا ہے۔ ہم نے ان سب کو یاد کیا اور لاہور سے اڑان بھرنے کے پانچ دس منٹ بعد ہی ہندوستان کی فضاؤں میں داخل ہوگئے۔ سوچنے لگے آخر یہ کیسی قربتیں ہیں اور کیسے یہ فاصلے ہیں۔

(۲/ نومبر ۱۹۹۷ء)

قدیر زماں کا رشوت نامہ

قدیر زماں ہمارے لگ بھگ نصف صدی پرانے دوست ہیں ۔ 1953 میں ہمارے دوست وہاب عندلیب نے کچھ احباب کے ساتھ مل کر کاچی گوڑہ میں ایک گلبرگہ کالج قائم کیا تھا جہاں گلبرگہ سے آنے والے طلبہ امداد باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس کالج کو چلایا کرتے تھے ۔ اس امداد باہمی میں ہمارا حصہ " امداد " میں کم اور " باہمی " میں زیادہ ہوا کرتا تھا ۔ اگرچہ اس کالج میں سبھی گلبرگہ کے طلبہ رہتے تھے لیکن قدیر زماں غالباً اکیلے ایسے طالب علم تھے جن کا تعلق کریم نگر سے تھا ۔ گلبرگہ میں کریم نگر کی اس ملاوٹ کے خلاف جب ہم احتجاج کرتے تھے تو وہاب عندلیب اپنی روشن خیالی اور وسیع المشربی کو ثابت کرنے کے لئے اقلیتوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے مسئلہ پر ایک لمبا چوڑا لکچر دیا کرتے تھے ۔ گلبرگہ کے طلبا کی اکثریت کے درمیان وہ قدیر زماں کریم نگری کو اقلیت سمجھتے تھے اور جی جان سے ان کا تحفظ کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ قدیر زماں شروع سے ہم سے بدکتے رہتے ہیں اور ماشاءاللہ اتنی پرانی دوستی کے باوجود آج بھی بدکتے ہیں ۔ چاہے کچھ بھی ہو ان کا شمار ہمارے پرانے دوستوں میں ہوتا ہے جن کی تعداد اب دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے ۔ اسی لئے وہ ہمیں عزیز بھی ہیں ۔ ہمارے دوست حیات لکھنوی کا ایک شعر ہے ۔

وہ برے ہوں کہ بھلے جو بھی ہمیں پیارے ہیں
اب نیا دوست کوئی ہم تو بنانے سے رہے

کسی پتھر پر پانی کے قطروں کے گرنے کا عمل لگاتار جاری رہے تو پتھر بھی گھسنے لگ جاتا ہے ۔ اس مثال میں ہماری حیثیت پتھر کی سی اور قدیر زماں کی

حیثیت پانی کے قطروں کی سی ہے ۔ غرض قدیرزماں سے اپنے دیرینہ مراسم کو بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیے اور اس دفتر کو ہم پھر کبھی کھولیں گے ۔ یوں بھی پنڈورا کے باکس کو کھولنا کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔ آج ان کا ذکر کرنے کی ضرورت ہمیں اس لئے پیش آئی کہ پچھلے دنوں ہمیں ان کی لکھی ہوئی ایک انگریزی کتاب ملی ہے جس کا عنوان " BRIBERY " ہے۔اس کتاب کو پاکر ہمیں سب سے پہلی خوشی تو یہ حاصل ہوئی کہ قدیرزماں اب اردو کے بجائے انگریزی میں لکھنے لگے ہیں ۔ ماشااللہ وہ تو اتنی اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں کہ وہ انگریزی ادب کے " شمس العلما " اور " لسان العصر " وغیرہ کہلائے جاسکتے ہیں ۔ یہ تو ان کا کرم ہے کہ اتنی اچھی انگریزی جاننے کے باوجود اتنے برس تک خواہ مخواہ ہی اردو جیسی پسماندہ زبان میں اپنا وقت برباد کرتے رہے ۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو کب کے اردو سے جاچکے ہوتے اور اردو والے ہمیں صدائیں دیتے رہ جاتے ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ انگریز اپنے آپ ہی اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے ۔ اگر نہ گئے ہوتے تو قدیرزماں کی انگریزی کو پڑھ کر ضرور چلے جاتے کہ میاں اب اس ملک میں ہمارا کیا کام ۔ سنبھالو ہماری زبان اور اپنا راج پاٹھ ۔ غرض قدیرزماں کو چونکہ اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہیے تھی تو وہ انگریزی ادب میں چلے گئے ۔ یوں بھی زبان تو اظہار کا ایک ذریعہ ہی ہوتی ہے ۔ قدیرزماں کی خوبی یہ ہے کہ سماج میں جب بھی کوئی برائی دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف آواز ضرور اٹھاتے ہیں اور اس وقت تک آواز اٹھاتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ خود اس برائی کا حصہ نہ بن جائیں ۔ چنانچہ ان کی زیرِ نظر کتاب اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے ۔ قدیرزماں نے اس کتاب میں " رشوت ستانی " کے خلاف بڑے زور وشور سے آواز اٹھائی ہے اور ان رشوتوں کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف افراد کو دیں بلکہ یہ تک تسلیم کیا ہے کہ آج وہ جو کچھ ہیں رشوت دینے کی وجہ سے ہی ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ 1951 میں ککریم نگر کے دفتر میں ایک عہدیدار کو پچاس روپے کی رشوت دینے کی وجہ سے ہی انکا تقرر بحیثیت ٹائپسٹ عمل میں آیا تھا اور یہی پچاس روپیئے ان کی آنے والی زندگی کی عمارت میں سنگ بنیاد کی حیثیت اختیار کرگئے اور دلچسپ

بات یہ ہے کہ 1991 میں جب وہ کوآپریٹو انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل کے باوقار عہدہ سے ریٹائر ہوئے تو انھیں اپنے وظیفہ کے بھاری بقایاجات کو حاصل کرنے کے لئے پھر موٹی رقم بطور رشوت دینی پڑی ۔ گویا جس رشوت کی مدد سے اپنی سرکاری ملازمت کا آغاز کیا تھا اسی رشوت کے ذریعہ اپنی ملازمت کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونکی ۔ پہلی رشوت اور آخری رشوت کے درمیان بھی انھیں اپنے کئی کاموں کے سلسلہ میں بار بار رشوت دینے پر مجبور ہونا پڑا ۔ انھوں نے ان رشوتوں کا بھی اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔

ہزاروں رشوتیں ایسی کہ ہر رشوت پہ دم نکلے

یوں لگتا ہے جیسے وہ سرکاری فرائض کم انجام دیتے رہے اور رشوت دینے کی " جین ڈائری " زیادہ مرتب کرتے رہے ۔ بہرحال جب وہ باعزت طور پر ریٹائر ہوگئے تو ان کے ضمیر نے جاگنا شروع کر دیا ۔ یوں بھی ہمارے یہاں ضمیر اسی وقت جاگتا ہے جب خود آدمی کو نیند آنے لگتی ہے ۔ ان کے ضمیر نے اب انھیں جھنجھوڑنا شروع کیا تو انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس کتاب کے ذریعہ ساری قوم کو جھنجھوڑا جائے ۔ گویا ضمیر قدیرزماں کو جھنجھوڑ رہا ہے اور جواباً قدیرزماں قوم کو جھنجھوڑ رہے ہیں ۔ کریم نگر کے اس عہدیدار کو جس نے 1951 میں قدیرزماں کو ملازمت دینے کے عوض ان سے پچاس روپیئے کی رشوت لی تھی اگر پتہ چل جاتا کہ وہ بعد میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھیں گے تو بخدا وہ قدیرزماں کو الٹا رشوت دیتا کہ بھیا میں تمھیں اچھی سے اچھی ملازمت دیتا ہوں مگر وعدہ کرو کہ کوئی کتاب نہیں لکھو گے ۔ ہمیں اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک کنجوس مکھی چوس شخص مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہونچا اور جنت کے داروغہ سے ملتمس ہوا کہ اسے جنت میں جانے کی اجازت دی جائے ۔ داروغہ جنت نے پوچھا " اگر تم نے نیچے کی دنیا میں کوئی نیک کام کیا ہو تو بتاؤ تاکہ اس کی بنیاد پر تمھیں جنت میں بھیجا جاسکے " ۔ کنجوس آدمی نے دماغ پر بہت زور دیا مگر اسے کوئی نیک کام یاد نہیں آیا ۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب اسے اپنا ایک نیک کام یاد آیا تو خوشی خوشی بولا " ایک بار ایک بڑھیا بھوک سے تڑپ رہی تھی تو میں نے اسے ایک چونّی دی تھی ۔" اس

پر جنّت کے داروغہ نے جنت کے چوکیداروں سے کہا ۔ میاں اس کی چوٹی واپس کرو اور اسے لے جاکر دوزخ میں ڈال دو " مبادا یہ نہ سمجھیے کہ قدیرزماں نے کوئی نیک کام نہیں کیا ہے ۔ وہ کوئی بڑا کام تو کرہی نہیں سکتے (کتاب لکھنے کے سوائے) ان کا ایک نیک کام یہی کیا کم ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہمارے دوست بنے ہوئے ہیں ۔ جب کہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جسے ہم جیسا دوست مل جائے اسے کسی دشمن کی حاجت نہیں ہوتی ۔ ہزار بات کی ایک بات یہ کہ قدیرزماں اصل میں ایک سادہ لوح اور معصوم آدمی ہیں ۔ وہ تو اتنے سادہ لوح ہیں کہ ایک بار ہم نے مذاق میں اپنی آواز بدل کر انھیں بی بی سی کے انگریزی لہجہ میں فون کیا اور کہا I am John Major from London. I want to talk to Kadir Zaman (ان دنوں جان میجر برطانیہ کے وزیر اعظم تھے) قدیرزماں نے کسی قدر جھجھک کر پوچھا " معاف کیجیے ۔ آپ کون بول رہے ہیں ؟"

ہم نے پھر جان میجر کا حوالہ دیا تو نہایت ادب کے ساتھ اپنی مخصوص انگریزی میں " Good Morning, Your Excellency " وغیرہ کہا ۔ تب ہم نے اپنے اسی لہجہ اور اعتماد کے ساتھ کہا " مسٹر قدیرزماں ہم ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے ۔" اس پر قدیرزماں نے بے ساختہ کہا Your excellency ! My humble services are always at your disposal
ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ دیا ۔

شام میں وہ ہمیں ملے تو حسب معمول ان سے کسی بات پر اختلاف ہوگیا ۔ بگڑ کر بولے آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں ۔ جس آدمی کے پاس جان میجر کے فون آتے ہوں وہاں آپ کی کیا حیثیت ہے ۔ اور ہم اپنی حیثیت پر کفِ افسوس ملتے رہ گئے ۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ۔ بہر حال یہ ان کی سادہ لوحی نہیں تو اور کیا ہے کہ جس ملک میں بوفورس اسکنڈل چل رہا ہو ۔ جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے لیڈروں کو رشوت دینے کا معاملہ درپیش ہو ۔ جہاں چارہ گھوٹالے میں کروڑوں روپیوں کے

وارے نیارے ہوئے ہوں وہاں ان کے پچاس روپیوں اور ہزار ڈیڑھ ہزار روپیوں کی رشوتوں کو کون پوچھے گا۔ بھلا نقار خانہ میں کسی نے طوطی کی آواز سنی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قدیرزماں خود اپنی ذات سے ایک ایسا طوطی ہیں جس میں ہر دم ایک سالم نقارہ خانہ گونجتا رہتا ہے۔ ان کی ابتدائی رشوت کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ ہے۔ 1951 میں ایک دن وہ اپنے چچا کی نئی نویلی سائیکل کو لے کر غفلت میں کاچی گوڑہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تھے جہاں ریلوے پولیس کے ایک داروغہ نے ان کی سائیکل کو ضبط کرلیا اور اس کی رہائی کے لیے دو روپیئے رشوت دینے کا طلب گار ہوا۔ ان کے پاس اس وقت دو روپے بھی نہیں تھے۔ بہت پریشان ہوئے۔ آخر کار انھوں نے ضمانت کے طور پر اپنی شیروانی داروغہ کے پاس رکھوائی اور گھر جاکر دو روپیئے لے آئے۔ تب کہیں جاکر اپنے چچا کی سائیکل اور اپنی شیروانی واپس حاصل کی۔ رشوت کے اس واقعہ کو انھوں نے ایسے کرب اور اذیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ لگتا ہے ان کا قلم اب ٹوٹا کہ تب ٹوٹا۔ تاہم اس ناخوشگوار واقعہ کا ایک خوشگوار اثر یہ ہوا کہ قدیرزماں نے بعد میں شیروانی پہننا ہی ترک کردیا۔ بش شرٹ اور شرٹ جیسے اوچھے لباسوں پر اتر آئے۔ پھر بھی اسے ان کی ہمت ہی کہنا چاہیئے۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو سرے سے لباس پہننا ہی ترک کردیتے۔ اس کتاب میں اور بھی کئی دلچسپ واقعات ہیں جن میں رشوت دینے کے نت نئے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدیرزماں نے ایک عہدہ دار کو رشوت دینے کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ اس عہدہ دار کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف ہوجاتے تھے اور جان بوجھ کر اس وقت تک ہارتے رہتے تھے جب تک کہ رشوت کی مطلوبہ رقم قدیرزماں کی جیب میں سے نکل کر عہدہ دار کی جیب میں منتقل نہیں ہوجاتی تھی۔ ایسی رشوتیں تو ہم نے بھی اپنی سرکاری ملازمت میں بہت سی دی ہیں۔ ہمارے ایک عہدیدار بالا شاعر تھے اور جب بھی وہ ہمیں شعر سناتے تھے تو ہم اس پر کچھ اس طرح داد دیتے تھے کہ لگتا تھا رشوت دے رہے ہیں۔ آخر میں ہمارے عہدہ دار بالا کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ اس دنیا میں ان سے بڑا شاعر اور ہم سے بڑا سخن فہم پیدا ہی نہیں ہوا۔ اگرچہ قدیرزماں کی یہ کتاب رشوت ستانی کے

خلاف ایک احتجاج کے طور پر شائع کی گئی ہے۔ لیکن دیدۂ بینا رکھنے والے اصحاب اس کو بطور "ہدایت نامہ رشوت ستانی" کے طور پر بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ فکرِ ہرکس بقدرِ ہمت اوست۔

آخر میں یہ عرض کرتے چلیں کہ اس کتاب کو لکھتے وقت قدیرزماں کی نیّت بالکل صاف رہی ہے۔ انہوں نے وہی لکھا ہے جو ان کے ضمیر نے لکھوایا ہے۔ مانا کہ انہوں نے جو رشوت دی ہے اس کی رقم بوفورس اسکینڈل وغیرہ کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن قدیرزماں کوئی سیاست داں تو ہیں نہیں کہ بھاری رشوتیں لیتے اور دیتے رہیں۔ فوٹوگرافی میں ایک طریقہ تصویروں کو انلارج (Enlarge) کرنے کا بھی ہوتا ہے۔ آپ اس کتاب کو اپنے ذہن میں انلارج کریں تو آپ پر حقیقت آشکار ہوگی۔

تو حضرات ! ہمارے تھوڑا لکھے کو بہت جانیئے اور آج ہی سے رشوت دینا اور لینا بند کردیجیے۔ یہ بہت بڑی لعنت ہے اتنی بڑی لعنت ہے کہ قدیرزماں جیسے ادیب کو کتاب لکھنے پر مجبور کردیتی ہے اس کالم کے عوض ہم قدیرزماں سے کچھ نہیں چاہتے۔ بس اتنی سی گذارش ہے کہ جب بھی ہم حیدرآباد آئیں تو اپنی موٹر میں ہماری سیر کرادیں۔ یوں بھی ہم ان کی موٹر میں اکثر گھومتے رہتے ہیں۔ نعوذباللہ یہ نہ سمجھیے کہ قدیرزماں ہمیں اپنی موٹر میں گھماکر ہمیں رشوت دے رہے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ تو ہمارے دوست ٹھیرے۔

(۲۳ / نومبر / ۱۹۹۷)

عینی آپا سے ایک ملاقات

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض بیمار ادیبوں نے نہایت صحت مند ادب کی تخلیق کی اور بعض صحت مند ادیبوں نے بیمار اور علیل ادب کو پیدا کیا ۔مثالیں خود آپ کے سامنے ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض نہایت اچھے ادیبوں اور شاعروں نے اچھے بھلے ادب کے علاوہ اپنی بیماریوں کے ذریعہ بھی خاصی شہرت حاصل کی ۔ ہمارے ایک بزرگ کرم فرما نہایت اعلا پا یہ کے شاعر اور صحافی تھے ۔ ادب میں بھی اونچا مقام اور رتبہ رکھتے تھے لیکن کسی کو خط لکھتے تو اسے ادب کی موجودہ صورت حال سے آگاہ کرنے کے علاوہ اپنی رائج الوقت بیماریوں کی تفصیل سے بھی واقف کرادیتے تھے ۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔

مختلف بیماریوں اور ان کے تیر بہدف علاج کے سلسلہ میں آج ہمارے پاس جتنی بھی ضروری اور اہم معلومات ہیں وہ سب ان کے خطوط کی بدولت ہیں ۔ بخدا آج بھی کبھی ہماری صحت خراب ہوجاتی ہے تو ہم ان کے پچھلے خطوط کے ذخیرہ کو کھنگال کراس میں سے اپنے مطلب کی بیماری کا علاج ڈھونڈ لیتے ہیں ۔ حفیظ جالندھری کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر چہ وہ اتنے بیمار نہیں رہتے تھے لیکن پھر بھی متوقع بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں ہر دم مصروف رہتے تھے اور ایلوپیتھی ، ہومیوپیتھی اور یونانی طریقہ ہائے علاج سے وابستہ دواؤں کو اپنے جسم میں پہنچاتے رہتے تھے ۔ اپنا علاج نہ صرف خود کرتے تھے بلکہ دوسروں کا علاج کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے ۔ ادیب اور شاعر حضرات چوں کہ خود کو " قومی ورثہ " تصوّر کرتے ہیں اس لئے اپنی نجی زندگی کے حالات اور کوائف سے

قوم کو بھی وقفہ وقفہ سے واقف کراتے رہتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی ادیب یا شاعر علیل ہوجاتا ہے تو اخباروں میں اس کی علالت کی خبریں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔

یادش بخیر، ہمارے ایک بزرگ شاعر دوست ہوا کرتے تھے جو کسی بیماری کی آڑ میں وقفہ وقفہ سے اسپتال میں شریک ہوجایا کرتے تھے اور نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے چاہنے والوں سے اپنی "مزاج پرسی" کروایا کرتے تھے ۔ کہتے تھے لوگ جب جوق در جوق آکر ان کی مزاج پرسی کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے ۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کا کوئی معصوم اور بے گناہ مداح ان کی مزاج پرسی کو پہنچا ہو اور انھوں نے اسے اپنا تازہ کلام نہ سنایا ہو۔ ایک بار ہم نے ان کی صحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان سے کلام نہ سنانے کی فرمائش کی تو انھوں نے سختی سے پابند کیا کہ ہم مستقبل میں ان کی مزاج پرسی کرنے نہ آئیں ۔ ان کے معالجین کی رائے بھی اس معاملے میں بڑی مشکوک تھی ان کا کہنا تھا کہ ان کے مرض کو دواؤں سے اتنا افاقہ نہیں ہوتا جتنا کہ ان کو شعر خوانی سے ہوتا ہے ۔ جب تک اپنا سارا مطبوعہ کلام اپنے تیمارداروں کو سنا نہیں دیتے تھے تب تک اسپتال سے ڈسچارج نہیں ہوتے تھے ۔ حد ہوگئی کہ ان کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کردہ نازک اندام نرسیں بھی "سبحان اللہ" "مرحبا" اور "مکرّر ارشاد" کی گردان کرتی ہوئی پائی جاتی تھیں بلکہ مرحوم "جوش علالت" میں اپنے بعض شعر بھی ان نرسوں کی نذر کردیتے تھے جنہیں وہ ازراہ علاج شرما شرما کر قبول بھی کرلیتی تھیں ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض ادیب اور شاعر اپنے فن کے بل بوتے پر شہرت کے معاملہ میں "خود کفیل" تو ہوتے ہی ہیں لیکن پھر بھی برا وقت آن پڑے تو اپنی علالت کے ذریعہ بھی شہرت کمانے سے نہیں چوکتے ۔

مندرجہ بالا باتیں ہم نے اس لیے لکھی ہیں کہ پچھلے دنوں ہماری عینی آپا بھی بیمار ہوگئی تھیں ۔ قرۃ العین حیدر بلاشبہ اس وقت پوری اردو دنیا کا سب سے اہم اور معتبر نام ہیں ۔ مانا کہ اردو میں آج تک کوئی چھوٹا ادیب اور شاعر پیدا ہی نہیں ہوا لیکن پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ برصغیر کے موجودہ سارے بڑے اردو ادیبوں

اور فنکاروں کے درمیان قرۃ العین حیدر کا قد سب سے اونچا ہے ۔ اور یہ ان کی بڑائی نہیں تو اور کیا ہے کہ ادب میں اتنا اونچا قد رکھنے کے باوجود وہ ہم جیسے کوتاہ قامت ادیبوں کو بھی عزیز رکھتی ہیں ۔ کچھ عرصہ پہلے وہ لندن میں بیمار ہوگئی تھیں ۔ واپس آئیں تو پچھلے دنوں پھر بیمار ہوگئیں ۔ اخباروں میں ان کی علالت کی خبریں چھپیں اور اردو والوں میں تشویش کی ایک لہر سی دوڑ گئی ۔ بعض جگہ تو ان کی صحت یابی کے لیے دعائیہ جلسے بھی منعقد کیے گئے ۔ ہم مشرقی دہلی میں رہتے ہیں اور عینی آپا بھی کم وبیش مشرقی دہلی میں رہتی ہیں ۔ عینی آپا سے واقفیت کی بناء پر ہمیں اس کا اندازہ تو تھا کہ ان کی صحت کی خرابی کی خبروں کے بارے میں ان کا کیا ردعمل ہوگا ۔ وہ ہمارے ادب کی ان ہستیوں میں سے ہیں جو جائز طور پر ملنے والی شہرت سے بھی حتی الامکان دور رہتی ہیں ۔ انھیں ٹیلی وژن پر بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا ۔ کسی جلسہ میں ٹیلی وژن والوں کے کیمرے کا رخ جب ان کی طرف ہوتا ہے تو وہ کسی رسالہ کی اوٹ میں اپنا چہرہ چھپا لیتی ہیں یا منہ پھیر لیتی ہیں ۔ بہر حال جب ان کی علالت کی خبر ملی تو ہم نے پہلے فون پر ان کی خیریت جاننے کی کوشش کی ۔ دو ایک بار خود عینی آپا سے بھی بات ہوئی ۔ نہ ہم نے ان کے مزاج کے بارے میں کچھ پوچھا اور نہ ہی انھوں نے اپنے مزاج کے بارے میں کہنا مناسب سمجھا ۔ وہی ادب اور ادیبوں کی سرگرمیوں کے بارے میں باتیں ہوئیں ۔ غرض پچھلے ہفتہ ہم اور مشہور شاعر مظہر امام دونوں ان کے گھر گئے ۔ عینی آپا کے اس نئے گھر میں ہمیں پہلی بار جانے کا موقعہ ملا ۔ ان کے دیوان خانہ میں جابجا الماریوں میں نادر و نایاب کتابیں بھی ہوئی ہیں ۔ بعض کتابیں تو ایسی بھی نظر آئیں جنہیں دیکھ کر ہم پر ہیبت سی طاری ہوگئی ۔ کیونکہ ایسی کتابیں پڑھنے کے لئے نہ صرف استطاعت کی بلکہ بڑے حوصلے کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ عینی آپا اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی تھیں ۔ بہت ہشاش بشاش نظر آئیں ۔ اتنی ہشاش بشاش کہ ان کے مزاج کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی ۔ پھر خود ہی کہنے لگیں یہ اخبار والوں کو کیا ہوگیا ہے کہ آئے دن میری صحت کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر چھاپ دیتے ہیں ۔ پتہ نہیں لوگوں کو اس طرح کی خبریں

چھاپ دینے میں کیا مزا آتا ہے۔

مظہر امام نے کہا آپ اردو ادب کی سب سے اہم ہستی ہیں۔ اگر لوگ آپ کی صحت کی خرابی کی اطلاع سے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو یہ ایک فطری بات ہے۔

عینی آپا بولیں۔ لیکن میری علالت کا ادب سے کیا تعلق۔ میری بیماری معاملہ ہے۔ اس میں کسی کو دلچسپی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس بحث میں ہم نے جان بوجھ کر کوئی حصہ نہیں لیا۔ کیونکہ اس وقت تک عینی آپا کی نظر سے وہ خبریں نہیں گزری تھیں جن میں ان کی صحت یابی کے لئے دعائیہ جلسوں کے انعقاد کی تفصیلات درج تھیں۔ ایک دعائیہ جلسہ کی صدارت فلاں صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض فلاں صاحب نے انجام دیئے۔ ایک صاحب اس جلسہ کے مہمان خصوصی بھی تھے۔ پہلی بار ہمیں پتہ چلا کہ ان دنوں دعا مانگنے کے لیے بھی صدارت یا نظامت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بہر حال عینی آپا سے اس دن خوب باتیں ہوئیں۔ ہم سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ حیدر آباد کے حوالے سے فاطمہ آپا (فاطمہ عالم علی خاں) کے بارے میں ضرور پوچھتی ہیں اور انھیں یاد کرتی ہیں۔ پھر انہوں نے موضوع کو بدلتے ہوئے کہا ان دنوں ہندی میں تانا شاہی کا لفظ ڈکٹیٹر شپ کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔ بھئی تمھارا تانا شاہ تو نہایت صوفی مسلک، پاک باز اور بے نیاز بادشاہ تھا۔ اس کا سلسلہ آمریت سے جوڑنا بالکل غلط بات ہے۔ تم حیدر آبادی اس پر احتجاج کیوں نہیں کرتے۔ لوگوں کو بتاتے کیوں نہیں کہ تانا شاہ اور نادر شاہ میں فرق ہے۔ اب ہم عینی آپا کو کیا بتاتے کہ ان دنوں ہندی میں مخالفت کے لئے خلافت کا لفظ بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ پھر ان سے دنیا جہاں کی باتیں ہوئیں۔ بیرونی ممالک میں مقیم حیدر آبادیوں کی خوش حالی کا بھی تذکرہ رہا۔

بہر حال ہمیں تو عینی آپا نہایت ہشاش بشاش نظر آئیں۔ زندگی اور توانائی سے بھر پور۔ عینی آپا کی تلون مزاجی اور سیماب صفتی کے بارے میں کوئی کچھ بھی کہے۔ ہم جب بھی عینی آپا سے ملے انہیں خوش باش اور خوش مذاق ہی پایا۔ اڑیا فلموں کی مشہور اداکارہ و جویا جینا (جنھیں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے) ہمارے ایک عزیز دوست کی بہو ہیں۔ جب بھی دلی آتی ہیں تو ہم سے ضرور ملتی ہیں۔

نہایت ذہین اور پڑھی لکھی اداکارہ ہیں ۔ ایک بار کہنے لگیں کہ وہ عینی آپا کی کہانی "اگلے جنم موہے بٹیانا کیجو" پر اڑیا میں ایک فلم بنانا چاہتی ہیں ۔ ان سے ملاقات کرادیجئے ۔ پھر ڈرتے ڈرتے یہ بھی کہا کہ عینی آپا اتنی بڑی ادیبہ ہیں ۔ پتہ نہیں ملاقات بھی کرنا پسند کریں یا نہ کریں ۔ ہم وجویا کو لے کر عینی آپا کے ہاں گئے ۔ بہت گرم جوشی سے ملیں ۔ عینی آپا کو وجویا کی باتیں اور اس کا رکھ رکھاؤ اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اس پر اپنی شفقتوں کی بارش کردی ۔ وجویا عینی آپا کی زبردست مداح ہیں ۔ اور ان کی شفقتوں کا بڑی احسان مندی کے ساتھ ذکر کرتی ہیں ۔

غرض عینی آپا سے ملاقات کے بعد ہم جانے لگے تو کہنے لگیں ۔ "بھئی ، میری صحت کے بارے میں یہ جو آئے دن تشویش ناک خبریں شائع ہو رہی ہیں ان کا کچھ مداوا کیجئے ۔ اس سے میرے رشتہ داروں کو بڑی پریشانی ہوتی ہے ۔ پاکستان میں میرے کئی رشتہ دار ہیں جنہوں نے ان اطلاعات کی اشاعت کے بعد پریشان ہو کر مجھ سے ربط پیدا کیا ۔ انہیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ ؟"

بہر حال عینی آپا ان دنوں آرام کر رہی ہیں ۔ گھر پر ہی فزیو تھریپی ہو جاتی ہے ۔ ہمیں تو وہ نہایت چاق و چوبند اور چست نظر آئیں ۔ ہماری دعا ہے کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں ۔ ان کی ذات نہ صرف اردو ادب کے لئے بلکہ عالمی ادب کے لئے بھی ایک "قیمتی اثاثہ" ہے ۔ (۱۹۹۷ء)

حیدرآباد ، سیاست اور مشفق خواجہ

برِصغیر کے ممتاز محقق ، دانشور ، ناقد ، ادیب اور سب سے بڑے ، ادبی، کالم نگار مشفق خواجہ ہمارے کرم فرما ہیں ۔ ان کے انداز کرم کے بارے میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یہ کرم فرماتے ہیں تو لگتا ہے ستم فرمارہے ہیں ۔ ان کے مزاح میں سنجیدگی کا پہلو تو ہوتا ہی ہے ۔ بسااوقات ان کی سنجیدگی میں بھی مزاح کا پہلو نکل آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ برِصغیر کے بیشتر ادیب اور شاعر ان سے خوفزدہ رہتے ہیں ۔ پچھلے ہفتہ ہمیں کراچی سے ان کا ایک تفصیلی خط ملا ہے جس میں انھوں نے حیدرآباد اور روزنامہ " سیاست " کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے ۔ اس خط میں ذکر تو ہمارا بھی ہے لیکن اپنے ذکر کو چھوڑ کر ہم ان کے خط کے وہ اقتباسات پیش کررہے ہیں جن میں حیدرآباد اور " سیاست " کا ذکر ہے ۔ ہم نے پچھلے سال ان کے بارے میں ایک کالم لکھا تھا اس کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ۔

آپ اپنے نیازمندوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ۔ اس میں آپ کا اتنا دخل نہیں جتنا حیدرآبادی وضع داری کا ہے ۔ حیدرآبادی وضع داری کا میں پُرانا قتیل ہوں ۔ ابراہیم جلیس ، مرزا ظفرالحسن ، خواجہ حمیدالدین شاہد ، خواجہ معین الدین ، صمدانی نقوی ، حبیب اللہ رشدی اور نہ جانے کون کون تھے اور ہیں جن سے تعلقات کی بناء پر میرے دل میں حیدرآباد کی محبت پیدا ہوئی ۔ بہت جی چاہتا ہے کہ اس دیار رنگ و بو کو دیکھوں ۔ آپ نے تو دس سال پہلے اس کا انتظام کردیا تھا مگر میں مہمان بن کر نہیں جانا چاہتا ۔ گدائے کوچہ گرد کی حیثیت سے ان گلیوں میں گھومنا چاہتا ہوں جہاں کی خاک کبھی میری محبوب ترین ہستیوں کے قدموں سے لپٹی ہے ۔ دیکھئے حیدرآباد دیکھنے کی خواہش کب پوری ہوتی ہے ۔

" سیاست " کبھی کبھی غالب لائبریری کے نام آتا ہے ۔ میں نے ان لوگوں سے کہہ رکھا ہے کہ سب سے پہلے یہ اخبار میں پڑھوں گا ۔ بند پیکٹ میرے پاس آجاتا ہے ۔ آپ کا کالم تو میں سب سے پہلے پڑھتا ہوں اور پھر وہ خبریں بھی پڑھ ڈالتا ہوں جو خالص مقامی ہوتی ہیں اور وہ اشتہار بھی جو ساڑیوں اور جوتوں کی دکانوں کے ہوتے ہیں ۔ حد تو یہ ہے کہ نیشنل ایگ کوآرڈی نیشن کمیٹی کا وہ اشتہار بھی جس میں انڈوں کے نرخ ہوتے ہیں ، بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور اہلِ حیدرآباد پر رشک کرتا ہوں کہ اس گرانی کے زمانہ میں بھی انھیں اتنے سستے انڈے کھانے کو ملتے ہیں ۔ "

پرانے قصوں میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ قصہ گو پہلے تو قصہ بیان کردیتا تھا اور اس کے بعد قصہ سننے والے پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوجاتی تھی کہ پہلے یا تو وہ رودیتا تھا اور بعد میں ہنسنے لگتا تھا یا پھر پہلے ہنس دیتا تھا اور بعد میں رونے لگتا تھا۔ اس پر قصہ بیان کرنے والا سامع سے بیک وقت ہنسنے اور رونے کے اسباب دریافت کرتا تھا اور سامع حسبِ توفیق اس کی توضیح وتشریح کردیتا تھا ۔ مشفق خواجہ کے خط کو پڑھ کر ہم پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہوگئی ہے ۔ پہلے تو ہم اس خط کو پڑھکر خوش ہوئے کہ مشفق خواجہ کو حیدرآباد سے بے پناہ محبت ہے اور وہ حیدرآبادی وضع داری کے قائل اور قتیل ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے دل میں ان کے اس جملہ کو پڑھ کر دکھ کی ایک لہر بھی اٹھی کہ " اس میں آپ کا اتنا دخل نہیں جتنا حیدرآبادی وضع داری کا ہے ۔" گویا انھیں ہم میں جتنی خوبیاں نظر آتی ہیں (بشرطیکہ نظر آتی ہوں) وہ ہماری اپنی نہیں بلکہ حیدرآبادکی ہیں ہم تو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ خوبیاں ہم میں اپنے طور پر موجود ہیں ۔ لیکن اب مشفق خواجہ نے ہماری ان خوبیوں کو بھی " حیدرآباد " کے خانہ میں ڈال دیا ہے ۔ یعنی اگر ہمارے اندر سے حیدرآبادی وضع داری کو نکال دیا جائے تو ہم کچھ بھی نہیں ہیں اور ہم دنیا کے کسی بھی شہر کے باشندے قرار دیے جاسکتے ہیں ۔ خیر مشفق خواجہ ہمارے کرم فرما ہیں اور ہم ان کی تحریر کے حسنِ کرشمہ ساز کے قائل ہیں ۔ اسی لئے تو ہم ان کی کسی بھی بات کا برا نہیں ملتے ۔اس کی وجہ یہ

ہیکہ جو لوگ ان کی بات کا برا نہیں مانتے ہیں ان کا حشر ہم نے خود اپنی آنکھوں سے
دیکھا ہے کہ ہر کس و ناکس کو پکڑ کر مشفق خواجہ کے جملوں کا مطلب پوچھتے پھرتے
ہیں۔ مشفق خواجہ جہاندیدہ آدمی ہیں اور کراچی جیسے ظالم شہر میں رہتے ہیں۔ وہ اس
بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اچھا شہر وہی ہوتا ہے جو باہر آباد نہ ہو بلکہ اس میں
بسنے والوں کے دلوں میں بھی آباد ہو۔ مگر اب شہر دلوں میں کم بسنے لگے ہیں۔ مشفق
خواجہ نے جس حیدرآباد سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہ حیدرآباد اب بھی کچھ
لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہو تو ہو ہمیں تو یہ اب کم ہی نظر آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ
ہم اپنی حیدرآبادی وضع داری کو برقرار رکھنے کیلئے ہی تو پچھلے پچیس برسوں سے دہلی
میں مقیم ہیں۔ حیدرآباد میں رہ رہے ہوتے تو شاید اپنی "حیدرآبادی وضع داری" کو
برقرار نہ رکھ پاتے۔

مشفق خواجہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک گدائے کوچہ گرد کی حیثیت سے
حیدرآباد کی ان گلیوں میں گھومنا چاہتے ہیں جہاں کی خاک کبھی ان کی محبوب ترین
ہستیوں کے قدموں سے لپٹی تھی۔ مشفق خواجہ کی اس معصوم سی خواہش کے
بارے میں بھلا ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ وہ تو ان گلیوں کی زیارت کرنا چاہتے ہیں جہاں
ماضی بعید میں ان کی محبوب ترین ہستیاں گھوما کرتی تھیں۔ ان کی محبوب ترین
ہستیوں کی گلیوں کی بات تو چھوڑیئے۔ ہمیں تو خود وہ گلیاں نہیں دکھائی دیتیں جن
میں ہم ابھی بیس پچیس برس پہلے تک گھوما کرتے تھے۔ رہی ان ہستیوں کے
قدموں سے لپٹی ہوئی خاک کا معاملہ تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہیکہ ہم اکثر حیدرآباد
جاتے رہتے ہیں۔ ہمیں تو وہ خاک بھی دکھائی نہیں دیتی جو ابھی مہینہ بھر پہلے
ہمارے قدموں سے لپٹی تھی۔ مبادا آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس شہر میں صفائی کا انتظام
بہت اچھا ہے بلکہ اس کی وجہ دراصل صفائی کا ناقص انتظام ہے۔ اس شہر میں اب گرد
وغبار اتنا پھیلتا جارہا ہے اور اتنی خاک اڑتی رہتی ہیکہ پچھلے ہفتہ جو خاک آپ کے
قدموں سے لپٹی تھی وہ نئے گرد وغبار کے بہت نیچے دب کر رہ جاتی ہے اب اس خاک
کو کون کہاں تک ڈھونڈتا پھرے۔ ہمیں افسوس تو اس بات کا ہیکہ دس برس پہلے جب
مشفق خواجہ ہندوستان آئے تھے تو تبھی ہمیں حیدرآباد سے ان کی محبت کا اندازہ ہوگیا

تھا اور ہم نے انھیں حیدرآباد چلنے کی دعوت دیدی تھی۔ ہم نے تو ساری تیاریاں کرلی تھیں۔ تیاریوں کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ہم نے حیدرآباد میں اپنے طور پر ان کی میزبانی کے انتظامات مکمل کرلیئے تھے۔ یہاں ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اپنی خالص حیدرآبادی روایت کے مطابق ہم نے حیدرآباد میں ایک ایسی ہستی کو ڈھونڈھ لیا تھا جو ان کی میزبانی کے فرائض انجام دینے کی خواہشمند تھی لیکن مشفق خواجہ اس وقت نہیں گئے اور اب انھیں حیدرآباد کی یاد ستارہی ہے۔

جہاں تک روز نامہ "سیاست" کے بارے میں مشفق خواجہ کی رائے کا تعلق ہے ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ اتنے گہرے انہماک کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یعنی ہمارے کالم کے مطالعہ سے اخبار شروع کرتے ہیں اور انڈوں کے بھاؤ جاننے کے بعد ہی مطالعہ ختم کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہاں بھی انھوں نے طنز کا پہلو تلاش کرلیا ہے ورنہ وہ ہمارے کالم کو پڑھنے کے فوراً بعد انڈوں کا بھاؤ جاننے کی کوشش نہ کرتے کیونکہ دنیا جانتی ہے کے انڈے نہ صرف کھائے جاتے ہیں بلکہ ناپسندیدہ اشخاص پر پھینکے بھی جاسکتے ہیں۔ ان کے خط کے بعد ہم نے بھی پہلی بار اخبار "سیاست" کے ذریعہ حیدرآباد میں انڈوں کا بھاو معلوم کیا اور اس کا تقابل دہلی میں ملنے والے انڈوں سے کیا تو پتہ چلا کہ واقعی دہلی میں انڈے بہت مہنگے ہیں اور ان کی مہنگائی کا ایک سبب ہمیں تو یہی نظر آیا کہ دہلی سیاسی راجدھانی ہے اور یہاں آئے دن جلسے وغیرہ ہوتے رہتے ہیں۔ امن وامان کی برقراری کیلیے انڈوں کی گرانی نہایت ضروری ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ حیدرآباد میں انڈوں کی ارزانی کا تعلق حیدرآبادی مرغیوں کی "حیدرآبادی وضع داری" سے ہے۔ وضع داری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

مشفق خواجہ کی طنزنگاری کو ہم شروع ہی سے رشک کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ آے۔ دن ساقی فاروقی، انیس ناگی، عبدالعزیز خالد، نظیر صدیقی، بشیر بدر، مظہر امام اور عالیہ امام وغیرہ کی تحریریں پڑھتے رہتے ہیں۔ نتیجہ میں ان کی طنزنگاری سے متاثر ہوکر ہم نے بھی ان کی تقلید میں محولہ بالا ادیبوں کی تحریریں پڑھی ہیں لیکن مولوی مدن والی بات ہم میں پیدا نہیں ہوئی۔ اب جاکر

کہیں یہ راز کھلا ہے کہ ان کے طنز میں جو کاٹ ہے اور جو نشتریت وغیرہ ہے وہ اس سبب سے ہے کہ وہ روزنامہ "سیاست" میں نہ صرف جوتوں اور ساڑیوں کے اشتہارات تک پڑھتے ہیں بلکہ انڈوں کے بھاؤ بھی معلوم کرتے رہتے ہیں حیرت ہوتی ہے کے اتنا کچھ پڑھنے کے بعد بھی وہ مندرجہ بالا ادیبوں کی تحریریں پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات ہمیں پہلے سے معلوم ہوتی تو ہم بھی "سیاست" میں چھپنے والے اشتہارات کا بنظر غائر مطالعہ کرتے حالانکہ اس اخبار سے ہمارا ذہنی اور جذباتی رشتہ چالیس برس پرانا ہے۔

بہرحال مشفق خواجہ نے حیدرآباد اور سیاست کے تعلق سے جس تعلق خاطر کا اظہار کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ انھوں نے اپنے خط میں ہماری تعریف میں جو کچھ کہا ہے وہ "حساب دوستاں در دل" والا معاملہ ہے یوں بھی مشفق خواجہ کسی کی تعریف کرتے ہیں تو کچھ اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ لوگوں کی نظریں اس شخص کے محاسن پر کم اور عیوب پر زیادہ جاتی ہیں۔ (۳۱ / مارچ ۱۹۹۶ء)

نجم الحسن رضوی ! تم کہاں ہو ؟

نجم الحسن رضوی سے 18/ ستمبر 1997ء کو دوبئی کی ایک ایسی محفل میں ملاقات ہوئی تھی جہاں دوبئی کی کئی ادب دوست اور اردو نواز ہستیاں موجود تھیں ۔ ڈاکٹر اظہر زیدی ڈائرکٹر آرٹس پرموشن بیورو نے یہ محفل اصل میں اس مقصد سے منعقد کی تھی کہ دوسرے دن ہونے والے بین الاقوامی مشاعرہ اور ہمارے ہی جشن کی تفصیلات کو قطعیت دی جاسکے ۔ محفل میں خاصے لوگ تھے جن میں سے اکثر کو ہم نہیں جانتے تھے ۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے اور ہم ان سے کہیں زیادہ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے ۔ ایسے میں ایک صاحب نے ہم سے کہا" جناب! مجھے نجم الحسن رضوی کہتے ہیں"

ہم نے کہا " اچھا تو آپ نجم الحسن رضوی ہیں ۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" ہم نے یہ جملہ یوں ادا کیا جیسے وہ ٹونی بلیر ہوں ، یاسر عرفات ہوں یا بل کلنٹن ہوں یا کوئی ایسی مشہور شخصیت ہوں جنہیں پہلے سے جاننا ہم پر فرض بنتا ہو ۔ لوگوں کی بھیڑ میں جب لوگ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو ایسے ہی رسمی اور مصنوعی جملوں سے نمٹاتے ہیں ۔ اس وقت ہمارا ذہن اس طرف بالکل نہیں گیا کہ نجم الحسن رضوی پاکستان کے ایک طرحدار افسانہ نگار کا بھی نام ہے ۔ جس کے افسانے پچھلی ڈھائی تین دہائیوں میں پاکستانی رسائل میں کبھی کبھار ہماری نظر سے گزرتے اور ہم سے خاموش داد بھی وصول کرتے رہے ہیں ۔ ایسی صورتحال سے بچنے کیلئے ہی اکثر شاعر اور ادیب اپنے والدین کے رکھے ہوئے ناموں سے کنارہ کش ہو کر اپنے قلمی نام اختیار کرلیتے ہیں ۔ آج کون جانتا ہے کہ ساحر لدھیانوی کا اصلی نام عبدالحی تھا ۔ ندا فاضلی اپنے گھر میں مقتدا حسین کے نام سے جانے جاتے ہیں ۔ظ ۔ انصاری اپنے والدین کی نظر میں صرف ظل حسنین تھے ۔

یوں بھی ماں باپ جو نام رکھ دیتے ہیں انہیں ادب کی دنیا میں مشہور کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ خود ہماری مثال لیجئے کہ والدین نے ہمارا نام "مجتبیٰ حسین" رکھ کر کہہ دیا کہ بیٹا جاؤ اور اس نام کو دنیا میں روشن کرو۔ چنانچہ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ہم غفلت میں اپنے اصلی نام کے ساتھ ہی ادب میں چلے آئے۔ اب جو ہم نے اس نام کو مشہور کرنے کی کوشش شروع کی تو پتہ چلا کہ عوام الناس ہمارے نام کا صحیح تلفظ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ بیشتر عوام الناس آج بھی ہمیں "مجتبیٰ حسین" کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ والدین سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کوئی مشکل کام سونپ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں داد دیجئے کہ ہم نے اپنے اس مشکل نام کو اتنا مشہور کر دیا کہ کچھ برس پہلے جب پاکستان کے مشہور نقاد مجتبیٰ حسین کے انتقال کی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی تو ہماری اہلیہ کے نام سینکڑوں تعزیتی خطوط وصول ہوئے جن میں خدا سے دعا مانگی گئی تھی کہ وہ ہماری اہلیہ کو صبر جمیل کا مادہ (قبل از وقت) عطا کرے۔ (حالانکہ ادیبوں اور شاعروں کے گزر جانے کے بعد ان کی بیواؤں کو اپنی زندگی گزارنے کیلئے کسی صبر جمیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ صبرِ جمیل کی ضرورت تو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب ادیب اور شاعر زندہ ہوں)

بہر حال اس محفل میں یہ احساس ہی نہ ہوا کہ نجم الحسن رضوی بھی اپنے والدین کے رکھے ہوئے نام کے ساتھ ہی ادب میں چلے آئے ہیں۔ نجم الحسن رضوی تو کسی کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ہمارا نام ہے۔ پھر پاکستان کے افسانہ نگار نجم الحسن رضوی کا بھلا دبئی میں کیا کام۔ کچھ دیر بعد محفل میں پھر آمنا سامنا ہوا تو نجم الحسن رضوی بولے "میں خلیج ٹائمس کا اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوں۔" اس پر ہم نے مزید گرم جوشی سے کہا "اچھا تو آپ خلیج ٹائمس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔" اس بار ہم نے خلیج ٹائمس پر زور دے کر اپنا جملہ یوں ادا کیا جیسے ہم خلیج ٹائمس کے سب سے پرانے قاری ہوں بلکہ اس وقت کے قاری ہوں جب یہ اخبار نکلنا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ہماری اس غیر ضروری گرمجوشی کو بھانپ کر نجم الحسن رضوی نے کہا "جناب میرا تعلق بھی آپ ہی کے قبیلہ سے ہے"۔

ہم نے کہا "اچھا تو آپ کا تعلق بھی وسط ایشیا کے اس قبیلہ سے ہے جس سے

ہمارے آباواجداد کا تعلق رہا ہے ۔ سنا ہے کہ اس قبیلہ نے تیرہویں یا چودھویں صدی میں وسط ایشیا میں بڑا قہر مچا رکھا تھا ۔ لوگ اس قبیلہ سے پناہ مانگتے تھے بلکہ خود ہمارے جدِ اعلیٰ اس قبیلہ کی بدنامی سے بچنے کیلئے سولھویں صدی میں درۂ خیبر کے راستہ سے ہندوستان آگئے تھے اور یہاں آتے ہی اپنا لبادہ اتار کر اچانک نیک اور پاکباز بن گئے تھے ۔ آدمی کو بگڑتے دیر تھوڑی لگتی ہے ۔" نجم الحسن بولے " نعوذ باللہ! بھلا میرا تعلق اس قبیلہ سے کیوں ہونے چلا ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق بھی " قلم قبیلہ " سے ہے ۔ کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں ۔" ہم نے ہنس کر کہا " یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے ۔ جب آپ ایک اخبار کے اور وہ بھی انگریزی اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں تو قلم تو چلائیں گے ہی ۔ اگر آپ کسی اردو اخبار کے صحافی ہوتے تو بات مختلف ہوتی کیونکہ اردو کے اکثر صحافی قلم کا کم اور قینچی کا زیادہ استعمال کرتے ہیں ۔ ویسے آپ نے جس " قلم قبیلہ " سے میرا اور اپنا تعلق پیدا کر رکھا ہے وہ بھی کچھ کم قہر انگیز نہیں ہے ۔" نجم الحسن ہماری بات پر ہنسنا ہی چاہتے تھے کہ ایک صاحب انہیں کسی ضروری کام سے بلا کر اپنے ساتھ لے گئے ۔ پھر محفل برخاست ہوگئی ۔

الغرض دوسرے دن ہمارے جشن کی تقریب شروع ہوئی تو ڈاکٹر اطہر زیدی کے اعلان سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہی قلم قبیلہ جناب نجم الحسن رضوی ہمارے بارے میں ایک مضمون پڑھیں گے ۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نجم الحسن اردو میں بھی لکھ لیتے ہیں ۔ اب جو نجم الحسن رضوی ہماری تعریف میں رطب اللسان ہوئے تو اس بیش بہا تعریف سے سامعین کا متفق ہونا تو بہت دور کی بات ہے خود ہمارا متفق ہونا بھی مشکل نظر آنے لگا ۔ پھر بھی ہم نے ان کا مضمون محض اس لئے نہایت اشتیاق سے سنا کہ بہت خوبصورت اردو میں لکھا ہوا تھا ۔ ہم نے سوچا بھئی یہ ہمارے ہم قبیلہ تو قبیلہ کے سردار نکلے ۔ انگریزی کے صحافی ہیں لیکن ذرا دیکھئے تو سہی کہ کتنی خوبصورت اردو لکھتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ دوبئی میں بیٹھ کر اپنی خوبصورت اردو کو ہم جیسے بدصورتوں پر ضائع کر رہے ہیں ۔ بہر حال جب ہم میں ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ اپنا مضمون سنانے کے بعد وہ اگلے دن کا خلیج ٹائمس نکالنے

کے لیے چلے گئے ہیں۔ جس رات ہمیں دوبئی سے دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا وہ دن ہم نے حیدرآبادی عزیزوں کے درمیان گزارا۔ ہوائی اڈہ جانے سے عین آدھا گھنٹہ پہلے ہوٹل پر سامان اٹھانے کے لیے بھاگم بھاگ آئے تو دیکھا کہ نجم الحسن رضوی ہوٹل کی لابی میں ہمارا انتظار کررہے ہیں۔ ہم قبیلہ ہونے کے ناتے ہم تو ان سے ایسی گرم جوشی کے ساتھ بغلگیر ہوئے جیسے انہیں کبھی اپنی بغل سے آزاد نہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ لیکن کیا کریں۔ آدھا گھنٹہ بعد ہمیں وہاں سے روانہ ہونا تھا اور اپنا سامان سفر بھی باندھنا تھا۔ معلوم ہوا کہ نجم الحسن رضوی بڑی دیر سے ہمارا انتظار کررہے ہیں۔ یہ جان کر اور بھی شرمندگی ہوئی۔ نجم الحسن رضوی نے ہمیں اپنے افسانوں کے دو مجموعے "ہاتھ بیچنے والے" اور "پُرسے کا موسم" اور مزاحیہ مضامین کا ایک مسودہ بھی دیا جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ہم نے عجلت میں نجم الحسن رضوی سے کہا "اچھا تو آپ افسانہ نگار بھی ہیں۔ یہ تو ہمیں معلوم نہ تھا۔" پھر عجلت میں ان کا شکریہ ادا کیا اور اس سے کہیں زیادہ عجلت کے ساتھ ان کتابوں کو اپنے سامان سفر میں رکھ لیا۔ جب ہمارا طیارہ تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تو ہم نے اپنا حفاظتی بند کھولا اور اپنے سامان میں سے نجم الحسن رضوی کے مجموعے نکالے۔ ہماری نظر "لوڈشیڈنگ" والے افسانے پر پڑی تو معاً خیال آیا کہ یہ افسانہ تو ہم نے کہیں پڑھ رکھا ہے۔ پھر اس افسانہ کا ایک جملہ بھی ہمیں یاد آگیا "جس شہر میں لوگوں کو زندہ سلامت گھر پہنچنے کی ضمانت نہ دی جاسکے وہاں عورتیں بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔" ہم نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ان افسانوں کو پڑھنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ ان میں سے بعض افسانے نہ صرف ہماری نظر سے گزر چکے ہیں بلکہ ہم ان افسانوں کے سحر میں بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔ ہم اپنا ہاتھا پیٹ کر رہ گئے کہ یہ تو وہ نجم الحسن رضوی ہیں جن کے افسانوں کے ہم قتیل رہ چکے ہیں۔ اور ہم انہیں خواہ مخواہ "خلیج ٹائمس" کا اسسٹنٹ ایڈیٹر سمجھ کر دوبئی میں ٹال آئے۔ ان سے تو ہمیں ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں۔ مگر اب پچھتائے کیا ہووت۔ کیونکہ وہ تو ہماری پہنچ سے سینکڑوں میل پیچھے رہ گئے تھے۔ ہماری ذہنی کیفیت ان والدین کی سی ہوگئی جن کے بچے بعض اوقات کسی بات پر روٹھ کر گھر سے چلے جاتے ہیں تو والدین اخباروں میں اشتہار چھپواتے پھرتے ہیں کہ بیٹا تم کہاں ہو۔ تم بلا وجہ ہم سے روٹھ کر چلے گئے۔ فوراً واپس چلے آؤ۔ تم سے کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔ جب سے تم گئے ہو تمہاری والدہ کی حالت تشویشناک ہوگئی۔ کھانا پینا بند کر

رکھا ہے ۔ آئسکریم تک نہیں کھا رہی ہیں ۔ " غرض اس ذہنی کیفیت سے نکلنے کے لئے ہم نے نجم الحسن رضوی کی دونوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔

نجم الحسن رضوی کا افسانہ سچ مچ کا افسانہ ہوتا ہے ۔ لکھتے تو وہ بھی دل بیقرار کا افسانہ ہی ہیں لیکن کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ دل کو خود بخود قرار آجاتا ہے ۔ ہمارے بیشتر جدید افسانہ نگاروں کے افسانوں میں اور تو سب کچھ ہوتا ہے لیکن افسانہ نہیں ہوتا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو وہ کچھ ایسی چابکدستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ افسانہ کتاب سے نکل کر آپ کی فکر کا حصہ بن جاتا ہے ۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں نہیں ہیں جن کے افسانے کتابوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں ۔ کیونکہ یہ افسانے بعد میں پڑھنے والے کے زاویہ نگاہ کو متعین کرتے ہیں ۔ علامتیں ان کے افسانوں میں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ علامتیں ایسی نہیں ہوتیں کہ علامتی افسانہ ملامتی افسانہ بن جائے ۔ نجم الحسن رضوی کو طنز و مزاح سے بھی خاصا شغف ہے اور جلد ہی ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ چھپ کر آنے والا ہے ۔ اس میدان میں ان کا خصوصی رجحان " پیروڈی " کی طرف ہے ۔ نثر میں ہمارے ہاں پیروڈیاں بہت کم لکھی گئی ہیں ۔اس سلسلہ میں شفیق الرحمن ،کنہیا لال کپور اور احمد جمال پاشا کے نام لئے جاسکتے ہیں ۔ نجم الحسن رضوی کے بیشتر مضامین جیسے "اردو ادب کا جغرافیہ "" موسیقی کا پلاؤ "" پرچہ بے حساب " وغیرہ پیروڈی کے زمرہ میں آتے ہیں ۔ انہوں نے ایک ٹیلی ویژن مذاکرہ کی ایک خوبصورت پیروڈی بھی لکھی ہے ۔ یہ مذاکرہ اصل میں " معاشی نظام " کے بارے میں ہے جس کا عنوان نجم الحسن رضوی نے ہمارا " بدمعاشی نظام " رکھا ہے ۔ یہ ماننا پڑے گا کہ برصغیر کا معاشی نظام دراصل " بدمعاشی " کے اطراف ہی گھومتا ہے ۔ بظاہر یہ بالکل سامنے کی بات ہے لیکن جب تک نجم الحسن رضوی اس " معاشی نظام " کا نام ہی " بدمعاشی نظام " نہیں رکھ دیتے تب تک یہ کھلی بات واضح نہیں ہو پاتی ۔ نجم الحسن رضوی لفظوں کے نباض ہیں اور ان سے کھیلنے کا فن خوب جانتے ہیں ۔ ہمیں اب رہ رہ کے یہ افسوس ہو رہا ہے کہ دوبئی میں نجم الحسن رضوی سے تفصیلی ملاقاتیں کیوں نہ ہو پائیں ۔ محفلوں سے اب جی اس لئے گھبراتا ہے کہ ہجوم سے تو ملاقات ہو جاتی ہے لیکن فرد سے ملاقات نہیں ہو پاتی ۔

(۱۴/ نومبر ۱۹۹۷ء)

نامی انصاری اور اردو طنز و مزاح نگاری

ایک ہیں نامی انصاری ۔ رہتے تو کانپور میں ہیں لیکن وہاں بیٹھے بیٹھے بڑی خاموشی کے ساتھ پورے اردو ادب کا جائزہ لیتے رہتے ہیں ۔ پان پان سے آدمی ہیں ۔ ہم نے انھیں دھان پان سا آدمی اس لئے نہیں لکھا کہ ہمارے حساب سے دھان کا وزن پان سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہوگا ۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ لفظوں کی اس ترکیب کا وزن کہیں نامی انصاری کے شخصی وزن سے بڑھ نہ جائے ۔ غرض اتنے دبلے ہیں کہ ان میں مزید دبلے ہونے کی اب دور دور تک کوئی گنجائش نظر نہیں آتی ۔ گویا اپنے جسمانی وجود سے ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے والی کیفیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں ۔ اردو کے کلاسیکی ادب پر چونکہ ان کی نظر بہت گہری ہے اسی لیے وہ " معاصر ادب " کا ہمیشہ ٹیڑھی نظر سے جائزہ لینے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کام کیا کرتے ہیں ۔ کوئی کام تو ضرور کرتے ہوں گے ۔ کبھی ہم نے ان سے پوچھا نہیں ۔ لیکن انھیں جب بھی دیکھا اور پڑھا یہی محسوس کیا کہ وہ یہی کام کرتے رہتے ہیں ۔ ایک نوجوان سے کسی نے پوچھا " میاں تمہارے کتنے بھائی اور کتنی بہنیں ہیں ؟" ۔ نوجوان نے نظریں جھکا کر جواب دیا " جی میرے نو بھائی اور چھ بہنیں ہیں " ۔ سوال کرنے والے کا منہ بڑی دیر تک کھلا کا کھلا رہ گیا ۔ بند ہوا تو آہستہ سے پوچھا " میاں تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں؟ " نوجوان نے کہا " جی بس یہی کام کرتے رہتے ہیں " ۔ نامی انصاری بھی بس اسی طرح لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے ہیں ۔ شاعر ہیں ۔ نقاد ہیں اور محقق وغیرہ بھی ہیں ۔ ان کی جسمانی ساخت جیسی بھی ہو وہ ادب کے معاملہ میں بڑے بڑوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں ۔ پانچ چھ برس پہلے ایک بار دہلی آئے تو ہم

سے بھی ملے ۔ باتوں باتوں میں ہم سے پوچھا " جناب یہ طنز ومزاح نگاری کو دوسرے درجہ کا ادب کیوں سمجھا جاتا ہے ؟" ۔ بہت عرصہ پہلے ہوبہو ایسا ہی سوال کسی نے یوسف ناظم سے پوچھ لیا تھا اور اس کے جواب میں یوسف ناظم نے کہا تھا " ہمارے ہاں چونکہ پہلے درجہ کا ادب لکھا ہی نہیں جاتا اس لیے طنز و مزاح کو دوسرے درجہ کا ادب کہا جاتا ہے "۔ ہم نے بھی یہی جواب نامی انصاری کو دیا تو خفا ہوگئے ۔ بولے " آپ جیسے مزاح نگاروں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ کسی بات کو سنجیدہ نہیں لیتے ۔ جہاں آپ کو مشتعل ہونا چاہیے وہاں ہنس دیتے ہیں " ہم نے کہا " نامی صاحب ! ہمیں تو آج کے آدمی کی ہنسی اور اس کے اشتعال میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں کیفیتیں ایک ہی جذبہ کے اظہار کے دو مختلف پیرائے ہیں ۔ پھر ہم طنز و مزاح نگاروں کا معاملہ یہ ہے کہ ادب میں ہمارا شمار اقلیتوں میں ہوتا ہے اور اقلیتوں کے مسائل اور دشواریوں سے آپ بخوبی واقف ہیں ۔ ہماری آواز کو کون سنے گا ۔ اردو ہی نہیں دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے زندہ طنز ومزاح نگاروں کی گنتی کیجیے تو پتہ چلے گا کہ ان کی گنتی کرنے کے لئے ایک پاؤں کی پانچ انگلیاں بھی کافی ہیں (ہم نے گنتی کے معاملہ میں ہاتھ کی انگلیوں کو اس لئے زحمت نہیں دی کہ یہ انگلیاں عموماً سنجیدہ ادب کے لکھنے والوں کی گنتی کے لئے استعمال کی جاتی ہیں) ہمارے اس جواب سے مطمئن ہونے کی بجائے کچھ اور مشتعل ہوگئے ۔ بولے " سوچتا ہوں کیوں نہ آزادی کے بعد اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب کا ایک سنجیدہ جائزہ لیا جائے "۔

ہم نے کہا " ہمارے ہاں شاعری ، افسانہ اور ناول وغیرہ کے ناقد تو بہت سے ہیں لیکن طنز ومزاح کا کوئی ناقد نہیں ہے ۔ بہت عرصہ پہلے ڈاکٹر وزیر آغا نے طنز و مزاح پر ایک وقیع اور مبسوط کتاب تو ضرور لکھی تھی جس میں بڑی حد تک آزادی سے پہلے کے طنزیہ ومزاحیہ ادب کا جائزہ لیا گیا تھا ۔ بعد میں ڈاکٹر ایس ۔ جے ۔ صادق اس کام کو آگے بڑھا کر 1975. تک لے آئے تھے ۔ اسی عرصہ میں یونس فہمی نے بھی اردو شاعری میں طنز ومزاح کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔ ماشاء اللہ اب تو اکیسویں صدی آرہی ہے " ۔

پوچھا۔ کیا آپ کی مزاح نگاری پر کسی یونیورسٹی میں کام ہو رہا ہے ؟"
عرض کیا۔ کام تو تین یونیورسٹیوں میں ہو رہا ہے لیکن اس کام کے سلسلہ میں چونکہ ہم خود کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتے اسی لئے یہ معاملہ کھٹائی میں نہیں بلکہ مٹھائی میں پڑا ہوا ہے۔ یوں بھی زندہ ادیبوں کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی کام کے ہم قائل نہیں ہیں۔ تحقیق تو ادیب کے مرنے کے بعد ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ پھر یوں بھی ہوا کہ بعض ادیبوں کے جیتے جی جب ان کے بارے میں کوئی تحقیقی کام شائع ہوا تو وہ اپنی موت آپ مرگئے۔ ہم مرنے سے نہیں ڈرتے لیکن تحقیق اور تنقید کے ہاتھوں مارے جائیں یہ بھی ہمیں منظور نہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک ریسرچ اسکالر ہم پر کام کر رہے تھے۔ چونکہ ہم اکثر حیدرآباد آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے ایک بار ہم سے ملنے آگئے۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے ہم سے جو پہلا سوال پوچھا وہ یہ تھا "حضور آپ نے اپنی ابتدائی تین کتابوں میں مخدوم محی الدین کا یہ شعر نہایت نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

تو جناب یہ بتلایئے کہ ان تینوں کتابوں میں جس "پیکرِ ناز" کا حوالہ ہے وہ ایک ہی ہے یا ہر کتاب کا "پیکرِ ناز" الگ الگ ہے۔ اگر یہ ایک نہیں ہے تو ذرا ان پیکرانِ ناز کے محل وقوع اور حدود اربعہ پر روشنی ڈالیے۔ اور ہاں ان پیکران ناز کو تو آپ نے یہ معلوم ہونے نہیں دیا کہ آپ نے ان کی متعلقہ بزم میں ہنس ہنس کر کتنی آہوں کو چھپایا ہے۔ لیکن بحیثیت ریسرچ اسکالر مجھے تو یہ معلوم کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ آپ نے اس طرح منجملہ کتنی آہیں چھپائی ہیں۔ پانچ دس آہوں کی کمی بیشی رہ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن تحقیق کو بہر حال معتبر اور مستند ہونا چاہیے۔"۔ ہم اس سوال کو سُن کر بھونچکے رہ گئے۔ انھیں یہ کہہ کر کسی نہ کسی طرح ٹالا کہ آہوں کا یہ حساب کتاب چونکہ خاصا پُرانا ہے اس لئے ہمیں کچھ وقت دیجئے کہ ہم پھر سے اپنی نیکیوں کی گنتی کر سکیں۔ چند دن بعد وہ پھر آئے۔ اب کی بار ان کا رویہ سود خوار پٹھانوں کا سا تھا۔ بہر حال نہ انھوں

نے ہماری مزاح نگاری کے بارے میں کچھ پوچھا اور نہ ہی ہم نے انھیں اپنی آہوں کا حساب بتایا اور یوں معاملہ بحسن وخوبی رفع دفع ہوگیا۔ دوسرے دو ریسرچ اسکالر چونکہ دور دراز کی یونیورسٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کا حال معلوم نہ ہوسکا۔ نامی انصاری ہماری ان باتوں کو سن کر اتنا ہی ہنستے رہے جتنا کہ وہ عموماً ہنستے ہیں۔ پھر وہ کانپور واپس چلے گئے۔ بعد میں ایک بار اور دہلی آئے تو ہماری کچھ کتابیں جو انھیں نہیں مل رہی تھیں مانگ کر لے گئے۔ تین برس پہلے "سوغات" میں مشتاق احمد یوسفی پر ان کا ایک بھرپور اور عالمانہ مضمون نظر سے گزرا تو احساس ہوا کہ یہ اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب کا جائزہ لینے سے باز نہیں آئیں گے۔ پھر اطلاع آئی کہ چار سال کی لگاتار محنت کے بعد انھوں نے بالآخر یہ جائزہ مکمل کرلیا ہے اور جلد ہی ان کی کتاب "آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح" کی رسم اجراء منعقد ہونے والی ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں دہلی میں ان کی اس کتاب کی رسم اجراء پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں انجام پائی۔ ہم نے تو اسی تقریب میں اس کتاب کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے دیکھنے کے فوراً بعد ہمیں یہ جاننے کے لئے آئینہ میں اپنی شکل دیکھنی پڑی کہ کیا واقعی وہ ہم ہی ہیں جس کے ذکر سے اس کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے جائزہ کا تعلق ہے یہ ایک اہم، مستند اور مبسوط کتاب ہے لیکن اس میں ہمارا ذکر جس انداز سے ہوا ہے اور جتنا ہوا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو کتاب کی ضخامت اور اس کی قیمت دونوں میں خاصی کمی واقع ہوسکتی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کی قدر وقیمت تو اپنی جگہ برقرار رہتی۔ اب ہم نامی انصاری کو کیسے بتائیں کہ ہم اصل میں مزاح نگاری کے آدمی ہی نہیں ہیں۔ ہم تو بس ایک لمبے عرصہ تک پیکرانِ نازکی بزم میں آہوں کو چھپانے کا کام ہی انجام دیتے آئے ہیں۔ اب اگر لوگوں نے اسے مزاح نگاری سمجھ لیا تو اس میں قصور ہمارا نہیں بلکہ پیکرانِ ناز کا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نامی انصاری کے اس ادبی کارنامہ کی تعریف شروع کی تو کرتے ہی چلے گئے۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ اس کتاب میں کنہیالال کپور، مشفق خواجہ، فکر تونسوی اور یوسف ناظم کا ذکر تفصیل کا طلبگار تھا۔

ہم نے بھی ہو بہو یہی بات نامی انصاری سے کہی ہے اور انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اگلے ایڈیشن میں وہ اس کی تلافی کردیں گے (ڈر ہے کہ اس تلافی کی کوشش میں وہ ہمارا ذکر کہیں سچ مچ کم نہ کردیں) ہماری کوشش تو یہی ہوگی کہ اس کتاب کا کوئی اگلا ایڈیشن نہ آئے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کا اگلا ایڈیشن جلد از جلد آئے گا کیونکہ موضوع کے اعتبار سے یہ ایک ایسی کتاب ہے جو ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی ۔ پروفیسر نارنگ نے اپنی تقریر میں پہلے تو ہندوستان اور پاکستان کے طنزیہ ومزاحیہ ادب کو اپنی تنقید کے ترازو میں تولا ۔ پھر ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ترازو کے ہندوستانی پلڑے میں ہماری موجودگی کی وجہ سے یہ ہم پلّہ قرار پاتا ہے ۔ جی چاہا ہم پلڑے سے اتر کر بھاگ جائیں ۔ یوں بھی نارنگ ہمیں ادب میں کم اور ترازو کے پلڑے میں بیٹھا ہوا دیکھنا ہی زیادہ پسند کرتے ہیں ۔

تفنن برطرف ! نامی انصاری (جنھیں اب ہم نامی گرامی انصاری کہنے لگے ہیں) نے بڑی لگن ، محنت اور عرق ریزی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے ۔ اس کتاب کے خد و خال تدریسی نہیں بلکہ تخلیقی ہیں کیونکہ نامی انصاری نے یہ کام یونیورسٹیوں میں ہونے والے ریسرچ کے مروجہ اصولوں کو سامنے رکھ کر نہیں کیا ہے جہاں ریسرچ اسکالر کے ساتھ ایک گائیڈ بھی ہوتا ہے جو عموماً Misguide کرنے کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتا ہے ۔

نامی انصاری نے طنز و مزاح کے معاملہ میں جہاں حیدرآباد کی مرکزیت کو تسلیم کیا ہے وہیں زندہ دلان حیدرآباد اور رسالہ " شگوفہ " کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ نامی انصاری نے اس کتاب کو اردو نثر میں طنز و مزاح کے جائزہ تک ہی محدود رکھا ہے ۔ اگر وہ لگے ہاتھوں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا جائزہ بھی لے لیتے تو اس کتاب کی وسعت اور وقعت میں مزید اضافہ ہوجاتا ۔ امید ہے کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں وہ اس کی بھی تلافی کردیں گے ۔

(جولائی / ۱۹۹۸ ء)

کشور ناہید نے حیدر آباد میں کیا دیکھا

پچھلے ہفتہ ہم اپنا کالم نہیں لکھ سکے ۔اسکی دو وجوہات تھیں ۔پہلی وجہ تو یہ کہ جس دن ہم یہ کالم لکھتے ہیں بقرعید آگئی تھی ۔ دوسری وجہ یہ کہ اس دن صبح کی فلائیٹ سے کشور ناہید حیدرآباد سے دہلی آگئی تھیں ۔ اگر چہ وہ ہمارے ہاں مقیم نہیں تھیں لیکن کشور کسی بھی شہر کے کسی بھی مکان میں مقیم رہیں یوں لگتا ہے جیسے سارے شہر میں آباد ہو گئی ہیں ۔ سارا شہر بلا وجہ مصروف سا ہوجاتا ہے ۔ کشور نے آتے ہی فون کیا ۔" میں حیدرآباد سے بہت خوش خوش لوٹی ہوں " ۔ہم نے کہا " آپ کسی شہر سے خوش ہوکر آئیں تواس کا مطلب یہ بھی تو ہوتا ہے کہ اس شہر کے باسی آپ سے خوش نہیں رہے "

بولیں " ایک بات سن لو ۔ حیدرآباد میں ایک صاحب نے تمہارے بارے میں کہا کہ تم ان کے سرپرست ہو ۔ اس پر میں نے انہیں آگاہ کیا کہ آپ جسے " سرپرست " سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں " شرپرست " ہے ۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ تم شرپرست تو ہو ہی "

ہم نے کہا " شرپرستی کی باتیں پھر کبھی ۔ یہ بتائیے حیدرآباد آپ کو کیسا لگا؟ آل احمد سرور نے ایک بار کہا تھا کہ برِ صغیر میں صرف تین شہر ہیں ۔ لاہور، حیدرآباد اور لکھنؤ ۔ باقی کے سب گاؤں ہیں ۔ آپ کو حیدرآباد شہر لگا یا گاؤں کی طرح دکھائی دیا "

بولیں "بچپن سے میرا جی چاہتا تھا کہ میں حیدرآباد کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں ۔یوں بھی برِصغیر کے کچھ شہر ایسے ہیں جو مجھ میں پہلے سے بسے ہوئے ہیں جیسے حیدرآباد کے علاوہ بنارس اور کلکتہ ۔ ان شہروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر

محسوس کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ میں جرمنی میں ہائیڈل برگ گئی اور دریائے نیکر کے کنارے سیر پر نکلی تو مجھے علامہ اقبالؔ بہت یاد آئے ۔ وہاں سے واپس آکر میں نے علامہ اقبالؔ کی وہ نظم پڑھی جو انہوں نے دریائے نیکر کے کنارے کہی تھی ۔ اسی طرح جب مسجد قرطبہ گئی تو واپس آکر میں نے علامہ اقبالؔ کی مسجد قرطبہ والی نظم پڑھی ۔ میں نے حیدرآباد کو چار طریقوں سے جانا تھا ۔ مرزا ظفرالحسن کی تحریروں سے ۔ سبط حسن کے " شہرِ نگاراں " سے ۔ حیدرآبادی ادیبوں کی تحریروں سے اور پولیس ایکشن کے بعد نظام حیدرآباد سے متعلق قصے اور داستانیں سن کر "

ہم نے پوچھا " حیدرآباد کو دیکھ کر کہیں آپ کو مایوسی تو نہیں ہوئی ؟ "
بولیں " مایوس ہونا تو تم حیدرآبادیوں کا کام ہے کیونکہ تم اس شہر کو پچھلے کئی برسوں سے دیکھ رہے ہو ۔ اس میں پہلے کیا تھا اور اب کیا نہیں ہے اس کا اندازہ تو تم ہی لگا سکتے ہو ۔ اس پر اظہارِ افسوس بھی کر سکتے ہو ۔ میں تو اس شہر میں پہلی بار گئی تھی ۔ لہٰذا اس سے مایوس ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ مجھے تو یہ اچھا لگا "

کشور ناہید پاکستان کی ممتاز شاعرہ ، دانشور ، اعلیٰ پایہ کی نثر نگار اور پاکستان آرٹس کونسل کی ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ پاکستان میں تحریک نسواں یا آزادیِ نسواں کی زبردست علمبردار ہیں ۔ تحریک نسواں پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا ۔ کشور ناہید پچھلی بار ہمارے اور ان کے ایک مشترک دوست کے گھر مہمان رہی تھیں ۔ جب وہ واپس گئیں تو ہم نے اپنے دوست کا حال پوچھا ۔ بولے " ویسے تو سب خیریت ہے لیکن تم جانتے ہو کہ پچھلے دنوں کشور ہمارے گھر مہمان بن کر رہی تھیں " ۔ ہم نے پوچھا " تو پھر کیا ہوا ؟ "

بڑی معصومیت سے بولے " تم تو جانتے ہو کہ میں ویسے بھی بڑا فرماں بردار شوہر ہوں ۔ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا تو میں تحریک نسواں سے متاثر ہوئے بغیر بھی بہ رضا و رغبت پہلے ہی سے بناتا رہا ہوں ۔ اب گھر میں جھاڑو لگانے اور صفائی کے کام کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی گئی ہے " ۔ غرض کشور اپنی سرگرمیوں اپنے شعروں اور اپنی ذہین باتوں کی وجہ سے ہمیشہ " خبروں "

میں رہتی ہیں ۔ اس بار یہ حیدرآباد میں جیلانی بانو کے ہاں مقیم رہیں اور ڈاکٹر انور معظم کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں کہ وہ خود تحریک نسواں کے کتنے بڑے علمبردار ہیں ۔

پندرہ دن پہلے کشور ناہید تحریک نسواں کے سلسلہ میں ہونے والی کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے دہلی آئی تھیں ۔ فون پر بات ہوئی تو کہنے لگیں " کانفرنس کے بعد میں نے اورنگ آباد اور حیدرآباد جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ "

ہم نے کہا " بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ حیدرآباد جارہی ہیں ۔ حیدرآباد کے سلسلہ میں اگر کوئی کام ہوتو بتادیجئے "

بولیں " جیلانی بانو کو اطلاع کرانی ہے کہ میں حیدرآباد پہنچ رہی ہوں "

ہم نے کہا " ڈاکٹر انور معظم ان دنوں دہلی میں ہی ہیں ۔ کل ہی شام میں ان سے بات ہوئی تھی ۔ ہم انہیں بتائے دیتے ہیں "

بولیں " اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیلانی بانو بھی دہلی میں ہونگیں کیونکہ پچھلے مہینے کراچی میں جب ان سے ملاقات ہوئی تھی تو کہہ رہی تھیں کہ انور معظم جب دہلی میں ہوتے ہیں تو وہ بھی دہلی میں رہتی ہیں " ۔ ہم نے ہنس کر کہا " ہمیں اس کا تو پتا نہیں ہے البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ڈاکٹر انور معظم اور جیلانی بانو جب پاکستان جاتے ہیں تو تبھی ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں ۔ ہندوستان واپس آتے ہیں تو انور معظم دہلی میں رہنے لگتے ہیں ۔ اور جیلانی بانو حیدرآباد میں "

زور دار قہقہہ لگا کر بولیں " تم اپنی " شر پرستی " سے باز نہیں آوگے "

بہر حال ہم نے اس دن نہ صرف ڈاکٹر انور معظم کو کشور ناہید کی آمد کے بارے میں بتایا بلکہ حیدرآباد میں جیلانی بانو کے ہاں بھی اطلاع کرادی ۔

حیدرآباد میں کشور ناہید کے اعزاز میں جو جلسہ ہوا اس کے بارے میں کشور ناہید نے ایک دلچسپ بات بتائی کہ جلسہ میں سامعین خاصی تعداد میں موجود تھے لیکن شرکا کی اوسط عمر 71 برس سے کم نہیں تھی اور وہ بھی اس لئے کہ اس اوسط عمر میں میری عمر بھی شامل تھی ورنہ عمروں کا یہ اوسط 80 برس سے کم نہ ہوتا ۔ اس پر ہم نے بھی اپنی غیر موجودگی پر اظہار افسوس کیا کہ اگر ہم اس جلسہ

میں ہوتے تو عمروں کا یہ اوسط کچھ اور بھی کم ہو سکتا تھا۔

جہاں تک حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں شرکاء کی اوسط عمر کے 71 برس ہونے کی بات ہے اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہم نے بھی کچھ عرصہ پہلے ایک ادبی محفل کے بارے میں شکایت کی تھی کہ اس میں ایسے ہی لوگ شریک تھے جن کی عمریں ساٹھ برس سے اوپر تھیں۔ اس پر ایک صاحب نے ہمارے اس بیان پر سخت اعتراض کیا تھا اور اپنی عمر کا صداقت نامہ روانہ کرتے ہوئے ہم پر غلط بیانی کا الزام عائد کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بھی اس دن ادبی محفل میں شریک تھے اور اس دن ان کی عمر انسٹھ برس ایک مہینہ تھی۔ پورے ساٹھ برس کی نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال یہ معاملہ حیدرآباد میں اردو کی صورتحال سے متعلق ہے جس کا کشور ناہید سے کوئی تعلق نہیں۔

کشور ناہید نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے پورے ایک گھنٹے تک جلسہ میں feminism فیمنیزم کے بارے میں تقریر کی۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ ان کے فیمنیزم کو لوگ کمیونیزم سمجھتے رہے

ہم نے کہا "کچھ لوگوں کی نظر میں دونوں تحریکیں چونکہ خطرناک رہی ہیں اس لئے اگر لوگوں نے فیمنیزم کو کمیونزم سمجھ لیا تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے"

روزنامہ "سیاست" کے بارے میں کشور ناہید نے کہا کہ مجھے "سیاست" کے دفتر جاکر خوشی ہوئی۔ صاف ستھرا عصری مشینوں اور ضرورتوں سے لیس ماڈرن دفتر ہے۔ اخبار بھی بہت پسند آیا لیکن اس کے پہلے صفحہ پر سب سے آخر میں آنے والی صرف آٹھ دس خبروں کو ہی نمایاں کیا جاتا ہے جب کہ پاکستانی اخبارات میں بیس پچیس اہم خبروں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ کشور ناہید طباعت و اشاعت کی بھی ماہر ہیں۔ ہم انہیں کیسے سمجھاتے کہ پاکستانی اخبارات کو پڑھتے ہوئے ہمیں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک ہی خبر کے سلسلے تین تین صفحات پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اخبار کا مطالعہ کم ہوتا ہے ورزش زیادہ ہوجاتی ہے۔ کشور ناہید حیدرآباد کے آثار قدیمہ کو دیکھ کر بھی بہت متاثر نظر آئیں۔ کہنے

لگیں کہ برِصغیر کے آثار قدیمہ کی یہ بد قسمتی ہے کہ دونوں ممالک کی حکومتیں ان کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں اور انہیں محفوظ رکھنے کے کوئی جتن نہیں کرتیں ۔ وہ تو اچھا ہے کہ کچھ شاعروں اور ادیبوں نے ان آثار قدیمہ کے بارے میں نظمیں کہی ہیں ۔ اور مضامین لکھے ہیں ۔ اس طرح کم از کم ادب میں ان کے محفوظ رہنے کی گنجائش نکل آئی ہے۔

کشور ناہید واپسی میں تین دن دہلی میں رہیں اور یوں خوب محفلیں آراستہ ہوئیں ۔ انہوں نے حیدرآباد کے بعض احباب کے بارے میں بھی حسب معمول اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے ۔ چونکہ کشور ناہید کی رائے بہت بے لاگ ہوتی ہے اس لئے احباب سے گزارش ہے کہ جب ہم حیدرآباد آئیں تو آواز دے کر ہم سے اپنے بارے میں کشور ناہید کی رائے طلب کرلیں ۔ (مغنی تبسم ، راشد آزر اور ذکی بلگرامی خاص طور پر نوٹ فرمالیں) ۔

آخر میں ایک بات اور عرض کردیں کہ کشور کی خودنوشت سوانح عمری " بری عورت کی کتھا " ابھی حال میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہے ۔ پاکستان میں اس کے ابھی تک شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی ۔ اس کتاب کے بارے میں بھی ہم فی الحال کوئی رائے ظاہر نہیں کریں گے ۔ اس لئے کہ بعض شدت پسندوں کا خیال ہے کہ اس کتاب کو کھولنا پنڈورا کی صندوقچی (Pandora.s Box) کو کھولنے کے مترادف ہے ۔

(۱۹۹۶ ء)

رشید حسن خاں دہلی سے چلے گئے

اردو کے مایہ ناز محقق، ناقد اور دانشور رشید حسن خاں اپنی زندگی کے پورے ۳۷ برس دہلی میں گزارنے کے بعد ۳ فروری کو اپنے آبائی قصبہ شاہ جہاں پور کو واپس چلے گئے اور لوگوں کو یہ سوچتا ہوا چھوڑ گئے کہ اس فیصلہ میں غلطی ان کی ہے یا دہلی شہر کی۔ دہلی شہر میں لوگوں کے آکر بس جانے کے بارے میں کسی منچلے نے کہا تھا کہ دہلی میں اکثر لوگ باہر سے آتے ہیں اور یہاں اس لیے بس جاتے ہیں کہ ان کے پاس واپسی کا کرایہ نہیں ہوتا۔ رشید حسن خاں کے سامنے یہ مسئلہ بھی نہیں تھا کیونکہ وہ سال میں دو چار مرتبہ شاہ جہاں پور ضرور جایا کرتے تھے۔ یعنی ان کے پاس شاہ جہاں پور واپس جانے کا کرایہ تھا۔ پھر یہ اپنی زندگی کے ۳۷ بھرپور برس دہلی شہر کو دینے کے بعد واپس کیوں چلے گئے۔ بہت عرصہ پہلے استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق نے دکن میں شعرا کی سرپرستی کا حال جاننے کے باوجود کہا تھا۔

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

سچ تو یہ ہے کہ ان کے اس مصرع پر ہم اب بھی حیرت کرتے ہیں کہ ذوق نے دہلی کی جن گلیوں کو چھوڑ کر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا وہ آخر دہلی میں کہاں واقع ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں نئی دہلی کا شہر تو تھا نہیں۔ جو کچھ بھی شہر تھا وہ جامع مسجد کے اطراف کی گلیوں میں ہی آباد تھا۔ ان گلیوں میں ہمیں بھی کبھی کبھار جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم جب بھی ان گلیوں میں گئے وہاں سے واپس آنے میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس لیے نہیں کہ یہ گلیاں ہمیں بہت پسند ہیں اور ہم یہاں سے جلدی نکلنا نہیں چاہتے بلکہ اس لئے کہ آدمی یہاں چیونٹی کی رفتار سے چلتا ہے۔ چلتا کیا ہے دھینگا مشتی کرتے ہوئے اپنا راستہ بناتا ہے۔ وہاں

سے واپس آکر تو ہمیں اپنا وزن بھی کم محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ذوق کے زمانہ میں یہ گلیاں اس قابل رہی ہوں کہ انھیں چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ مگر اب تو یہ گلیاں نہ صرف کاٹنے کو دوڑتی ہیں بلکہ اکثر اوقات تو کاٹ بھی لیتی ہیں۔

چاہے کچھ بھی ہو رشید حسن خاں نے جب دہلی کو چھوڑ کر شاہ جہاں پور واپس جانے کا فیصلہ کیا تو ان کے دوستوں (جن کی تعداد بہت کم ہے) اور دشمنوں دونوں کو تشویش ہوئی لیکن اس کے باوجود کسی نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بس اتنا کیا کہ ۲ فروری کو انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک وداعی جلسہ رکھا گیا جس میں ادب دوستوں سے خواہش کی گئی کہ وہ آئیں اور رشید حسن خاں کو وداع کریں۔ اردو گھر میں منعقدہ اس جلسہ میں ہم نے پہلی بار اتنا بڑا اجتماع دیکھا۔ کیا شاعر، کیا ادیب، کیا صحافی، کیا دانشور، کیا طالب علم، کیا دوست کیا دشمن، سب کے سب وہاں موجود تھے۔ وہ بھی تھے جن سے رشید حسن خاں کے زبردست معرکے چلے۔ اس جلسہ میں ایسی زبردست حاضری اس بات کا ثبوت تھی کہ اب جب کہ ادب اور بالخصوص اردو ادب میں "تجارت" کا عمل دخل بڑھتا جارہا ہے اور لوگ ادب کو بھی ایک کاروبار کے طور پر چلا رہے ہیں۔ اب بھی لوگ موقع آنے پر سچے اور خالص علم کی قدر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمیم حنفی، شاہد علی خاں، اسلم پرویز، خلیق انجم، شارب ردولوی، شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی، رفعت سروش، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور نہ جانے کتنوں نے رشید حسن خاں کے بارے میں اظہار خیال کیا اور یوں اظہار خیال کیا کہ لگتا تھا واقعی سچ بول رہے ہیں۔

رشید حسن خاں سے اگرچہ ہماری شخصی ملاقات بائیس تیئس برس پہلے دہلی میں ہوئی تھی لیکن ہم عرصہ سے ان کے نیاز مندوں میں رہے ہیں۔ ہم نے انھیں جب بھی دیکھا ایک قلندر صفت عالم کے روپ میں ہی پایا۔ ہمیشہ مطالعہ میں غرق یا کسی سوچ میں غلطاں یا کسی نکتہ پر کسی سے بحث میں مصروف۔ قلندری، ثابت قدمی، اور علم سے ان کے گہرے شغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ

رشید حسن خاں دہلی سے چلے گئے

آج سے لگ بھگ ۳۰ برس پہلے وہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر وابستہ ہوئے تھے اور آخر وقت تک وہ اسی عہدے پر ڈٹے رہے۔ نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ نہ ستائش کی تمنا۔ نہ صلہ کی پروا۔ سیکڑوں طالب علموں نے ان کی رہنمائی میں ڈاکٹریٹ کے مقالے لکھے اور بعد کو پروفیسر بھی بنے۔ سچ تو یہ ہے کہ رشید حسن خاں کی علمیت خود ایک ایسا عہدہ ہے جس کے آگے بڑے بڑے بھی پانی بھرتے ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ خاں صاحب نے خود کہاں تک رسمی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کے نام کے ساتھ کبھی بڑی بڑی ڈگریاں نہیں دیکھیں۔ انھوں نے محض اپنے بل بوتے پر عربی، فارسی اور اردو کا اتنا علم حاصل کرلیا ہے کہ اب خود ایک "دانش گاہ" بن گئے ہیں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق کے میدان میں برصغیر کی کئی نامور ہستیوں سے ٹکر لی اور بیشتر اوقات کامیاب و کامران ہی رہے۔ شاہ جہاں پور کے خالص پٹھان ہونے کے ناتے علمی معاملات میں وہ موقع آنے پر ٹوٹ جانے کو ترجیح دیتے ہیں بہ نسبت لچک جانے کے۔ انھوں نے جب بھی ٹکر لی اپنے سے بڑے آدمی سے ہی ٹکر لی۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ہمارے شخصی مراسم ہمیشہ خوشگوار ہی رہے۔ ہم سے ٹکر لیتے بھی تو کس بات پر۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ میرا من کی "باغ و بہار" رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" اور دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" کو ہم نے پہلے بھی پڑھا ہے (صرف پڑھا ہے۔ سمجھا کم ہے) لیکن جب رشید حسن خاں نے ان کلاسیکی کتابوں کے متنوں کو مرتب کیا اور ان کے تنقیدی اڈیشن شائع کیے تو تب ہی یہ ہماری سمجھ میں آسکے۔ اردو کے ادب کو ہم جیسے طالب علموں اور عام آدمی تک پہنچانے کا جو کام رشید حسن خاں نے انجام دیا ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک ایک نکتہ اور ایک ایک پہلو پر انھوں نے برسوں چھان پھٹک اور تحقیق کی ہے۔

اردو قواعد پر بھی ان کے عبور اور بالغ نظری کو برصغیر کے ہر دانشور اور عالم نے سراہا ہے۔ رشید حسن خاں نے اردو املا کو آسان بنانے کے لیے کچھ اصول بھی مقرر

کیے ہیں جنھیں اب اُردو کے کئی اشاعتی اداروں نے اپنا لیا ہے۔ ہم جب نیشنل
کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اردو کے سربراہ تھے تو ہم نے بھی
ایک دن غفلت میں ان اصولوں کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ نتیجہ میں آج ہم
بہت سے لفظوں کے املا بھول چکے ہیں۔ گاؤں اور پاؤں جیسے لفظوں کو وہ گانو اور
پانو لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ کبھی ہم گانو تو صحیح لکھ لیتے تھے لیکن پانو لکھتے
وقت نہ جانے کیوں ہمارے پاؤں لڑکھڑا جاتے تھے۔ خیر یہ موقعہ نہیں ہے کہ ان
کے املا کے اصولوں پر بحث کی جائے۔ "تماشہ" کو وہ "تماشا" لکھنے کے قائل
ہیں لیکن ہم نے جب بھی ان کے کہنے کے مطابق "تماشا" لکھنے کی کوشش کی تو
خود "تماشہ" بن گئے۔ ان کی تو یہ بھی سفارش ہے کہ "گنگنانا" کو "گن گنانا"
لکھنا چاہیے۔ ہم سے تو خیر لکھا نہیں گیا لیکن باتھ روم میں گنگنانے کا جو شوق ہمیں
برسوں سے تھا وہ یکسر موقوف ہوگیا۔ "گنگنانے" میں جو موسیقی ہے وہ "گن
گنانے" میں کہاں۔ ایک بار ہم نے انھیں خط لکھا۔ جواب میں کسی لفظ کے املا
پر انھوں نے ہمیں ٹوکا تو ہم نے انھیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا "قبلہ! جہاں تک
ہمارے املا کا سوال ہے اس کے لکھنے والے تو مرزا غالب، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی
وغیرہ ہیں۔ ہمارا سلسلہ تو ان لوگوں سے ہے۔ آپ جیسے پڑھے لکھوں سے نہیں"

بہر حال اردو گھر کے وداعی جلسہ میں لوگوں نے ان کے بارے میں بڑی
خوبصورت باتیں کیں اور سچے دل سے کیں۔ اس کے جواب میں رشید حسن خاں
نے اپنی تقریر میں صرف دو جملے کہے کہ "علم اور تحقیق کے معاملے میں میں نے
نہ تو کبھی مصلحت پسندی کو روا رکھا اور نہ ہی آیندہ رکھوں گا" جلسے کے دوسرے
دن وہ شاہ جہاں پور جانے والے تھے۔ ہم نے کچھ احباب سے کہا بھی کہ وہ صرف
اس جلسہ میں انھیں وداع کرنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ دوسرے دن اسٹیشن پر جاکر
بھی انھیں وداع کر آئیں۔ نادر شاہ بھی جب دلّی سے ایران واپس جارہا تھا تو بادشاہ
وقت محمد شاہ انھیں وداع کرنے کے لیے شہر کی فصیل سے باہر تک گیا تھا کہ
موصوف کہیں واپس نہ آجائیں۔ ہم تو خیر انھیں وداع کرنے کے لیے اسٹیشن نہیں
گئے لیکن بعد میں پتا چلا کہ کچھ اصحاب حفظ ما تقدم کے طور پر انھیں وداع کرنے

کے لیے بچ بچ اسٹیشن گئے تھے ۔

رشید حسن خاں کے دلی سے چلے جانے پر لوگ اب دکھی ہیں لیکن جب وہ یہاں تھے تو تب بھی دکھی ہی تھے (وجوہات دوسری تھیں) ۔ مانا کہ وہ دلی میں ۳۷ برس رہے ۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان برسوں میں وہ دلی کے معمولات کا حصہ کہاں بنے ۔ نہ کبھی کسی سازش میں شریک ہوئے نہ کسی جوڑ توڑ میں حصہ لیا ۔ وہ تو سدا اپنی گوشہ نشینی میں مگن رہے ۔ ہمیشہ لائبریریوں اور کتابوں کی خاک چھانتے رہے ۔ دلی کی ادبی محفلوں میں بھی وہ کم ہی آتے رہے. اور اپنا زیادہ تر وقت پڑھنے میں گزارا ۔ ایسے لوگ دلی میں رہیں یا شاہ جہاں پور میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ وہ شاہ جہاں پور جاکر بھی کتابوں میں کمر کمر ڈوبے رہیں گے ۔

آخر میں ایک بات اور عرض کردیں کہ جلسہ کے بعد ہم جانے لگے تو ایک صاحب نے ہمارا راستہ روک کر پوچھا " قبلہ ! آپ کو بھی تو حیدرآباد سے دلی آئے ہوئے لگ بھگ پچیس برس بیت گئے ۔ کیا آپ بھی ۳۷ برس سے پہلے دلی کی جان نہیں چھوڑیں گے ۔ ؟ " اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ ہمیں بھی وداع کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہیں ۔ (اپریل ۹۶ء)

ایک کتاب کی رسم اجراء پر

مجھے یاد ہے اور آپ میں سے بہت سے حضرات کو بھی یاد ہوگا کہ چار سال پہلے میں نے اسی غالب اکیڈمی میں نصرت ظہیر کی پہلی کتاب " تحت اللفظ " کی رسم اجرا انجام دی تھی اور آج ان کی تیسری کتاب " بقلم خود " کی رسم اجراء انجام پارہی ہے ۔ میں اس ادبی سانحہ پر بقلم خود دم بخود ہوں ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے آج تک جس کسی ادیب کی کتاب کی رسم اجراء انجام دی اس بچارے ادیب کی کوئی اور کتاب بعد میں شائع نہیں ہوئی ۔ کتنے ہی ادیب ہیں جنکی پہلی کتابوں کی رسم اجراء میں نے انجام دی اور آج وہ خدا کے فضل و کرم سے نہایت آرام سے گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں ۔ اس راز کو میں نے مفاد عامہ کے پیشِ نظر آج تک فاش ہونے نہیں دیا کہ میرے ہاتھوں کسی کتاب کی رسم اجراء اصل میں مصنف کی ادبی زندگی کے تابوت میں آخری کیل کا درجہ رکھتی ہے ۔ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر میں کسی ادیب کی کتاب کی رسم اجراء انجام دوں تو سمجھئے کہ اس ادیب کی " نس بندی " عمل میں آگئی ۔ میں خود بھی اپنی اس تاثیر پر اکثر خوش ہولیتا تھا کہ اس طرح اردو ادب میں نئی کتابوں کے چھپ کر آنے کا سلسلہ کم ہو جائے گا کیونکہ ہمارے دوست باقر مہدی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل محض اس لئے تاریک نظر آتا ہے کہ یہاں کثرت سے اردو کتابیں شائع ہونے لگی ہیں ۔ کتابوں کو بھلے ہی کوئی پڑھے یا نہ پڑھے لیکن بلا وجہ اس کا انبار لگتا چلا جائے تو یہ بھی اچھی بات نہیں ہے لیکن نصرت ظہیر کی اب جو یہ تیسری کتاب شائع ہوئی ہے تو اس سے میرا بھرم ٹوٹ گیا ہے ۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب میں بھی " فیملی پلاننگ " کے طریقے ناکام ہونے لگے ہیں ۔

پھر یہ کتاب اس قدر خوبصورت ڈھنگ سے شائع ہوئی ہے کہ کسی گوشہ سے اردو کی کتاب نہیں لگتی ۔ بلا مبالغہ یہ اتنی دیدہ زیب ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود میں اب

تک اسے پوری طرح نہیں پڑھ پایا! جب جب کتاب کو کھولتا ہوں تو میں اس کے ظاہری حسن میں کھو سا جاتا ہوں اور کتاب کا متن کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست اکثر کہا کرتے تھے کہ اردو کتابوں کی گھٹیا طباعت اور کتابت کی وجہ سے ہی انہیں ان کتابوں کو نہایت توجہ اور غور سے پڑھنا پڑتا ہے۔ علم کتنی مشکل سے حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ اردو کتابوں کو پڑھنے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔ زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کے بعد اگر کسی کتاب میں کتابت کی غلطیاں نہ ہوں، صفحات کی جزبندی میں گھپلا نہ ہو اور طباعت اچھی ہو تو وہ اسے اردو کی کتاب ماننے سے انکار کردیتے تھے۔ اردو میں خوبصورت اور دیدہ زیب کتابیں چھاپنے کے بھی کئی نقصانات ہیں۔ یادش بخیر! بہت عرصہ پہلے ممبئی میں ایک صنعت کار ہوا کرتے تھے جو اردو میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ ایک بار ان کا ایک ضخیم شعری مجموعہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ ایسا حسین و جمیل اور دیدہ زیب مجموعہ تھا کہ ننگے ہاتھوں اسے چھونے کی ہمت نہیں پڑتی تھی بلکہ جی چاہتا تھا کہ اس مجموعہ کو ریحل پر رکھ کر پڑھیں۔ ہمارے وہی مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ کتاب کے ظاہری حسن اور آب و تاب کو دیکھ کر ان کی ہمت نہیں پڑی کہ بنا وضو اس کتاب کو ہاتھ لگائیں لہذا وضو کر کے ہی کتاب ہاتھ میں لی اور پھر کھولی۔ یہ اور بات ہے کہ دو چار غزلوں کے بعد ہی ان کا وضو اپنے آپ ٹوٹ گیا۔ کہتے تھے توبہ شکن کتابیں تو بہت سی دیکھیں لیکن وضو شکن کتاب پہلی بار دیکھی۔ بعد میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس صنعت کار شاعر کا مذکورہ مجموعہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگیا۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کا ہم نے کسی سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے زیادہ تر نسخے تو وہ لوگ لے گئے جو اردو پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے کیونکہ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ایسی دیدہ زیب کتاب ان کی لائبریری میں ضرور موجود رہے۔ اس سے علم میں اضافہ ہو یا نہ ہو لائبریری کی زینت میں ضرور اضافہ ہوجاتا ہے۔ ایک صاحب تو اس مجموعے کے دو نسخے صرف اس بنا پر لے گئے کہ اس کی جلد کا رنگ ان کے دیوان خانے میں لٹکنے والے پردوں کے رنگ سے "میچ" کرتا ہے۔

میں نہیں کہتا کہ نصرت ظہیر کی کتاب کو پڑھنے سے پہلے آپ کو وضو کرنا چاہئے لیکن جی تو ضرور یہی چاہتا ہے۔ یوں بھی ہمارے پاس ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے اس طرح کے اہتمام کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ میں سب سے پہلے نصرت ظہیر کے

میرا کالم

پبلیشر "اسکائی گروپ" کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ انھوں نے ایک ادبی کتاب کو آسمانی کتاب کی طرح چھاپا ہے۔ مجھے پتا نہیں کہ اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کے معاملے میں وہ کتنا تجربہ رکھتے ہیں لیکن جس طرح انھوں نے یہ کتاب شائع کی ہے اس سے تو یہ لگتا ہے کہ Sky group کے سامنے Sky is the limit۔ ایسے اشاعتی اداروں کو اردو والوں کی طرف سے بھرپور تعاون ملنا چاہیے۔ ہمارے ہاں عموماً تعاون کو تین خانوں میں باٹا جاتا ہے۔ دامے، درمے، سخنے۔ اگر وہ چاہیں تو سخنے والا تعاون مجھ سے لے لیں اور اپنے دامے، درمے والے تعاون سے میری کتاب بھی چھاپ دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

مجھے اس وقت ایک اور بات کی بھی خوشی ہو رہی ہے اور وہ یہ کہ میں نے ایک لمبے عرصے بعد اردو کی ایک کتاب دیکھی ہے جس کے اندرونی صفحہ پر یہ عبارت درج نہیں ہے "یہ کتاب فلاں ادارے کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے"۔ یقین مانیں میں جس کتاب پر بھی یہ عبارت دیکھتا ہوں اسے پڑھنے سے حتی الامکان گریز کرتا ہوں۔ اردو معاشرہ کو کرپٹ کرنے کے لئے آج ایسے کئی ادارے منظر عام پر آچکے ہیں جو اپنے "جزوی" مالی تعاون کے ذریعہ اردو زبان اور اس کے ادب کو "کلی" نقصان پہنچانے کے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ نصرت ظہیر نے یہ کتاب نہ صرف "بقلم خود" لکھی ہے بلکہ اسے "بزعم خود" بھی چھپوایا ہے۔ کسی کا جزوی مالی تعاون حاصل کر کے اپنی انا کا سودا نہیں کیا ہے۔ میں انھیں اس بات پر بھی مبارک باد دیتا ہوں۔

اب رہی بات نصرت ظہیر کی مزاح نگاری کی تو اس وقت مجھے مشتاق احمد یوسفی کی ایک بات یاد آگئی۔ یوسفی نے اپنی پہلی کتاب "چراغ تلے" کے دیباچہ میں لکھا ہے "اگر آپ اس کتاب کو پڑھ کر نہ مسکرائیں تو یہ فال نیک ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بھی مزاح نگار ہیں"۔ یوسفی کے اس بلیغ قول کی روشنی میں مجھے اصولاً اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مسکرانا نہیں چاہیے تھا لیکن میری مجبوری ملاحظہ کیجئے کہ مجھے اس کتاب کو پڑھتے ہوئے بار بار مسکرانا پڑا۔

نصرت ظہیر کو میں اس لئے بھی پسند کرتا ہوں کہ مجھ میں اور نصرت ظہیر میں بعض مماثلتیں ہیں۔ ایک مماثلت تو یہ ہے کہ وہ بھی "کالم نگاری" کے راستہ سے "مزاح

نگاری" کے میدان میں آئے ہیں۔ میں نے بھی کم و بیش سترہ برسوں تک حیدرآباد کے روزنامہ "سیاست" میں کالم نگاری کی ہے۔ اس پورے عرصے میں ہفتے کے چھے دنوں میں میرا کالم نہایت پابندی سے چھپتا تھا۔ روزانہ کالم نگاری کتنا جان لیوا کام ہے اس کا مجھے اندازہ ہے۔ کیسی کیسی حالتوں میں بہر حال میں یہ کالم لکھ لیتا تھا۔ ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ میری چھے سالہ بیٹی دنیا سے رخصت ہوگئی۔ قبرستان سے واپس ہوا تو قبر کی مٹی ہاتھوں سے جھاڑے بغیر ہی مزاحیہ کالم لکھنے بیٹھ گیا۔ اس دن مجھے پہلی بار ادراک ہوا کہ سچے مزاح کی سرحد اپنے شخصی غموں کو پی لینے اور انھیں اپنے اندر انگیز کرلینے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد سے میں نے یہ معمول سا بنالیا ہے کہ جب بھی سماج کے روبرو ہوتا ہوں تو اپنی خوش دلی اور خندہ پیشانی کو برقرار رکھتا ہوں اور زمانہ کو اپنے شخصی غموں کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ظرافت نگاری کے لیے آدمی کا ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ جس آدمی میں ظرف نہیں ہوتا وہ سچا ظریف ہو ہی نہیں سکتا۔

۱۹۸۸ء میں نصرت ظہیر کے کالم جب "قومی آواز" میں چھپنے لگے تو کالم نگاری سے اپنی دیرینہ وابستگی کے باعث میں نے انھیں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا۔ اتنے ذوق و شوق کے ساتھ کہ ان کا کالم پہلے پڑھتا تھا اور موہن چراغی کا اداریہ بعد میں۔ نصرت ظہیر مزاح نگاری کی نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ روزمرہ کے چھوٹے موٹے واقعات کے اطراف طنز کا تانا بانا بننا اور انھیں لطیف پیرایہ میں اس طرح بیان کرنا کہ قاری کو اس میں اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے مزاح نگار اور کالم نگار کا بنیادی منصب ہوتا ہے۔ بہ ظاہر روز مرہ کے واقعات اور موضوعات اتنے اہم نہیں ہوتے لیکن ایسے ہی واقعات کے تسلسل اور اجتماع سے تاریخ بنتی ہے۔ "بقلم خود" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آپ کو عصر حاضر کی وہ شکل نظر آئے گی جس میں آپ ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔ روز مرہ کی ضرورتوں اور مسائل میں الجھے ہوے حیران، پریشان، بے بس آدمی کی شکل آپ کو اس میں نظر آئے گی اور یوں لگے گا جیسے آپ خود اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوں اور یہی نصرت ظہیر کی تحریر کا کمال ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ طنزیہ کالم نگاری اس وقت تک ممکن نہیں

جب تک کالم نگار کو زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل نہ ہو اور وہ ادب کی کلاسیکی قدروں سے واقف نہ ہو۔ نصرت ظہیر سیدھی سادی، شگفتہ، دلنشین اور رواں دواں زبان کے سہارے اپنے اچھوتے موضوعات کی آڑ میں بات میں سے بات پیدا کرنے اور ضرورت پیش آئے تو بات کا بتنگڑ بنانے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں اپنے نوجوان دوست نصرت ظہیر کو "بقلم خود" کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔ (فروری ۱۹۹۰)

ذکر پروفیسر بشیر الدین احمد کا

پچھلے مہینے ہمارے چار دوست اس دنیا سے رخصت ہوگئے ۔ جس رفتار سے ہم اپنے دوستوں کے جنازوں کو کندھا دیتے چلے جا رہے ہیں اس کے بارے میں ہمارے ایک دوست نے پچھلے ہفتے کہا تھا ۔ " اگر تم اسی رفتار سے اپنے دوستوں کے جنازوں کو کندھا دیتے رہے تو اندیشہ ہے کہ خود تمہارے جنازہ کو کندھا دینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا " ہمارے دوست نے یہ بات مذاق میں کہی تھی اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ چار دن بعد ہم اسی دوست کے جنازہ کو بادیدہ نم کندھا دیتے ہوئے پائے گئے ۔ بلا مبالغہ پچھلے ڈیڑھ دو برسوں میں اتنے قبرستانوں اور شمشان گھاٹوں میں جا چکے ہیں کہ شاید ہی ایسا کوئی بد قسمت قبرستان بچا ہوگا جسے ہم نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے نہ نوازا ہو بلکہ ایک قبرستان تو شہر سے اتنی دور واقع تھا کہ یہاں پہنچتے پہنچتے ہم ادھ موئے سے ہوگئے تھے اور اس پر ایک عمر رسیدہ دوست نے کہا تھا ۔ " یار ہم اتنی دور نکل آئے ہیں کہ اب یہاں سے گھر واپس جانا بیکار سا معلوم ہو رہا ہے ۔ " گویا اب ہم عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں کسی بھی وقت ہماری بھی گھنٹی بج سکتی ہے ۔ جنازوں میں شرکت کرنا ، پرسہ دینا اور مزاج پرسی کرنا جیسے کام ہماری زندگی کی سب سے اہم مصروفیت بن گئے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست نے ریٹائرمنٹ کے بعد اس طرح کی مصروفیت کو اپنی باقی ماندہ زندگی کا واحد نصب العین بنالیا ہے ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہفتے وار ترجمان " ہماری زبان " میں ایک کالم شائع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے ۔ " ایک دیا اور بجھا " ۔ اس کالم میں اردو کے ان ادیبوں اور شاعروں کی تفصیلات شائع ہوتی ہیں جن کا انتقال ہوجاتا ہے ۔ ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی اردو

ادیب اور شاعر تو مرتا ہی ہے ۔ (زبان جب مرنے لگے تو اس کے ادیب زندہ رہ کر کیا کریں گے ؟) یہ کالم نہایت پابندی سے شائع ہوتا ہے ۔ ایک بار یہ کالم شائع نہیں ہوا تو ہمارے ان ہی دوست نے انجمن کے اعلیٰ عہدیدار سے شکایت کی "حضور ۔ آپ کے رسالہ میں بعض مستقل کالموں کا اچانک ناغہ ہوجاتا ہے جو اچھی بات نہیں ہے ۔ مثال کے طور پر ایک ہفتے کے شمارے میں "ایک دیا اور بجھا" والا کالم شائع نہیں ہوا ۔ صحافت کا اصول ہے کہ مستقل کالموں کو پابندی سے شائع ہونا چاہئے ۔ اس میں ناغہ ہوجائے تو رسالہ کی ساکھ میں کمی واقع ہوجاتی ہے ۔

بہر حال ۔ ہمارے دوست جوں جوں اس دنیا سے رخصت ہوتے جارہے ہیں کم از کم ہمارے لئے یہ دنیا چھوٹی ہوتی نظر آنے لگی ہے ۔ پچھلے مہینے جو چار دوست ہم سے بچھڑ گئے ان میں سے ایک دوست تو ہماری نوجوانی کے دوست تھے ۔ ہماری مراد ہے پروفیسر بشیر الدین احمد سے جو انتقال کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے ۔ بشیر الدین احمد نے اپنی زندگی کے ابتدائی 32 برس حیدرآباد میں اور بقیہ 32 برس دہلی میں گزارے ۔ لیکن وہ آخری وقت تک ٹھیٹ حیدرآبادی ہی رہے ۔ ان سے ہماری پہلی ملاقات 1953ء میں ہوئی تھی جب ہم بی ۔ اے کے طالب علم تھے ۔ اور وہ ایم اے کررہے تھے ۔ اگرچہ وہ ہمارے ہم جماعت نہیں تھے لیکن طلباء کی انجمن آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین کی سرگرمیوں کے وسیلے سے ان سے روز ہی ملاقات ہوجاتی تھی ۔ ترپ بازار کے کوٹھی کی جانب والے نکڑ پر ایک عمارت تھی جس کی دوسرے منزل پر یونین کا دفتر تھا ۔ بشیر ان دنوں یونین کے صدر تھے اور ہم یونین کے ایک سرگرم کارکن ۔ بسا اوقات ہم دونوں اس دفتر کی صفائی کا کام بھی انجام دے دیا کرتے تھے ۔

بی رام کشن راؤ کی چیف منسٹری کا زمانہ تھا اور ان کے بھتیجہ بی نرسنگ راؤ (جو بہت بعد میں انوار العلوم کالج کے لکچرار بنے ۔ لندن گئے ۔ صحافی بنے اور اب رہتے تو بنجارہ ہلز میں ہیں لیکن زیادہ وقت اپنے گاؤں میں گزارتے ہیں) آل انڈیا

اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر تھے (یونین کے اس زمانہ کے ساتھیوں میں سی ایچ ہنمنت راؤ بھی تھے جو بعد میں حکومت ہند کے پلاننگ کمیشن کے رکن بنے ۔ اور حیدرآباد میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں ۔ تقی تنویر ۔ جگدیش چندرا ۔ پوہان مورتی ۔ ڈاکٹر یوسف کمال (یہ سب ملک سے باہر ہیں) پریم آنند ۔ اسد اللہ ۔ صبغتہ اللہ ۔ اور نہ جانے کتنے دوست تھے جنکا زیادہ تر وقت احتجاجی مظاہروں اور جلسوں میں گزرتا تھا ۔ ہر شام کو ہم سب یونین کے دفتر میں جمع ہو جاتے تھے ۔ بشیر کے والد اکبر یار جنگ کی کوٹھی ترپ بازار میں ہی تھی ۔ جہاں سے بشیر پیدل چلتے ہوئے دفتر آجاتے تھے ۔ ہم کاچی گوڑہ کے "گلبرگہ کالج" سے آتے تھے ۔ پھر حیدرآباد میں کئی سیاسی تبدیلیاں رونما ہو گئیں اور کئی تحریکیں دب گئیں ۔ طلباء کی انجمن کا دفتر بند ہوا تو ہم نے "اورینٹ ہوٹل" میں بیٹھک جمالی ۔ بشیر کا مرید رفیع (جنہیں مرحوم ہوئے عرصہ بیت گیا) تقی تنویر ۔ علی باقر ۔ معین مرحوم ۔ بشیر کے چھوٹے بھائی وحید الدین اور نہ جانے کتنے ہی احباب تھے جو یہاں پابندی سے آیا کرتے تھے ۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بشیر کچھ عرصہ تک ورنگل کالج میں بھی سیاسیات کے لکچرار رہے ۔ بشیر نوجوانی کے زمانہ میں بھی بے حد متین اور سنجیدہ تھے ۔ اور آخر وقت تک سنجیدگی کا دامن تھامے رہے ۔ بہت مشکل سے ہنستے تھے ۔ ہمارے دیگر احباب کی طرح نہیں کہ جو بات بات پر قہقہہ لگاتے ہیں ۔ البتہ صرف ہماری باتوں پر اس زمانہ میں بھی ہنستے تھے اور آخر وقت تک اس معمول پر قائم رہے ۔ لوگ بشیر کے قہقہہ کو سننے کے متمنی رہتے تھے ۔ کیونکہ ان کا قہقہہ سب سے الگ اور منفرد ہوتا تھا کوئی دلچسپ بات یا واقعہ انہیں پسند آجائے تو پہلے ان کا آدھا قہقہہ تو حلق سے اچانک ابل پڑتا تھا اور بقیہ آدھا ان کے سینے میں ہی گونجنے لگتا تھا ۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بلا شرکت غیرے ۔ اس قہقہہ سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ۔ لہذا ان کے مجموعی قہقہہ سے ایسی آوازیں پیدا ہوتی تھیں جو عام قہقہوں میں پیدا نہیں ہوتیں ۔ بشیر اوّل تو بھرپور قہقہہ نہیں لگاتے تھے ۔ لیکن جب لگاتے تھے تو دیکھنے سے کہیں زیادہ سننے کی چیز بن جاتے

تھے ۔ جب یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر بنے اور ہم ان سے ملنے ان کے دفتر گئے تو بشیر نے جاتے ہی اپنا وہ یادگار قہقہہ لگایا جو ان کا اپنا تھا ۔ چونکہ ان کا پرائیوٹ سکریٹری اپنے نئے وائس چانسلر کے قہقہہ سے ناواقف تھا اس لئے ان کے کمرہ سے جب ان کی مخصوص آوازیں بلند ہونے لگیں تو خوف زدہ ہو کر ان کے کمرہ میں بھاگا بھاگا چلا آیا کہ پتہ نہیں " شیخ الجامعہ " کے ساتھ کیا ہو رہا ہے ۔

بشیر ہم سے جب بھی ملتے خالص حیدرآبادی لہجہ میں بات کرتے تھے ۔ وہ بے حد اعلیٰ پایہ کے دانشور اور معلم تھے ۔ بے حد ایماندار اور بے حد غیر جانب دار اور بے حد محنتی ۔ ایک سیاسی مبصر کی حیثیت سے دہلی کے سیاسی حلقوں میں ان کی بڑی عزت تھی ۔ جب یہ دہلی کے سنٹر فار ڈیولپنگ سوسائٹز Center for developing societies کے ڈائرکٹر تھے تو انہوں نے جنتا پارٹی کی حکومت کے ٹوٹ جانیکے بعد منعقدہ عام انتخابات کے بارے میں ایک سروے کیا تھا اور رائے دہی سے پندرہ دن پہلے مسز اندرا گاندھی کی پارٹی کو پارلیمنٹ میں ملنے والی نشستوں کی تعداد کی پیش گوئی کردی تھی ۔ جب کہ قومی اخبارات کا سروے بالکل مختلف اور برعکس تھا ۔ آپ حیرت کریں گے کہ مسز اندرا گاندھی جب دوبارہ برسر اقتدار آئیں تو انہیں اتنی ہی نشستیں ملیں جن کی پیش گوئی بشیر نے پندرہ دن پہلے کردی تھی ۔ جامعہ کے وائس چانسلر بن جانے کے بعد بشیر بے حد مصروف ہوگئے تھے ۔ ہم مذاق میں بشیر سے کہا کرتے تھے میاں ! آپ نہ صرف وائس چانسلر ہیں بلکہ " شیخ الجامعہ " بھی ہیں ۔ اس پر ہم سے کہتے " یار ! یہاں مجھے سب شیخ الجامعہ کہتے ہیں ۔ کم از کم تم تو مجھے وائس چانسلر کہہ کر مخاطب کرو " ۔ کام کو ایمان بنانا بشیر کا ہی حصہ تھا ۔ ساڑھے چار سال پہلے وہ جب وائس چانسلر بنے تو جامعہ کے حالات خاصے خراب تھے لیکن بشیر نے ہر بحران کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور رفتہ رفتہ جامعہ برادری کو اپنے وائس چانسلر کی دیانتداری اور سچائی کا قائل ہونا پڑا ۔

ان سے ہماری آخری ملاقات ان کے انتقال سے دو مہینے پہلے ان کے گھر پر ہوئی تھی ۔ وہ عام طور پر لوگوں سے گھر پر نہیں ملتے تھے لیکن چالیس برس سے

ذکر پروفیسر بشیرالدین احمد کا

اوپر کی دوستی کے ناتے ہم بلا تکلف ان کے گھر چلے جایا کرتے تھے ۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بشیر ایک دری پر چادر بچھائے لیٹے تھے اور ٹیلی ویژن پر کوئی پرانی انگریزی فلم چل رہی تھی ۔ ہمیں دیکھ کر بے پناہ خوش ہوئے ۔ بولے ۔ "تم یقین نہیں کرو گے میں اس وقت تمہیں اور اپنے چالیس برس پہلے کے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔ ذرا اس فلم کو دیکھو۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم لوگوں نے یہ فلم حمایت نگر کے ایمبسی سینما میں دیکھی تھی یہ مشہور اداکارہ ایواگارڈنر کی فلم تھی جو بشیر کی پسندیدہ اداکارہ تھی ۔ پھر دنیا بھر کی باتیں ہوئیں ۔ ہم سے جب بھی ملاقات ہوتی تو کسی نہ کسی عنوان سے حیدرآباد کا ذکر ضرور کرتے تھے ۔ حیدرآباد سے متعلق نریندر لوتھر کی کتاب اس وقت ان کے زیر مطالعہ تھی ۔ انہیں یہ کتاب بہت پسند آئی تھی ۔ کہنے لگے حیدرآباد کے بارے میں بعض معلومات مجھے اس کتاب کے ذریعہ حاصل ہوئیں ۔ پھر اٹھ کر اچانک اپنی ڈائری لے آئے جس میں کچھ اردو اشعار ان کی اپنی ہینڈرائیٹنگ میں لکھے ہوئے تھے ۔ کہنے لگے "رشید بھائی (پروفیسر رشید الدین خان) کے تعزیتی جلسہ میں بعض اصحاب نے یہ شعر سنائے تھے ۔ میں نے عجلت میں یہ شعر لکھے تھے ۔ کوئی غلطی ہو تو ٹھیک کردیں ۔" عرصہ سے انکا زیادہ تر سروکار انگریزی زبان سے ہی تھا اور وہ لکھتے بھی اسی زبان میں تھے ۔ لیکن جب سے جامعہ کے وائس چانسلر بنے تھے اردو میں دلچسپی لینے لگے تھے ۔ جامعہ ملیہ کے رسالہ "جامعہ" کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے انہوں نے کئی اقدامات کئے تھے ۔ اور اکثر اس رسالے کے بارے میں ہماری رائے پوچھا کرتے تھے ۔

بشیر سے اس کے بعد پھر ملاقات نہیں ہوئی ۔ کیونکہ جامعہ میں داخلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا ۔ داخلوں کے معاملہ میں وہ نہایت ایمانداری سے کام لیتے تھے ۔ اور اس معاملہ میں کسی سیاسی دباؤ اور اثرات کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔ نتیجہ میں پریشان بھی ہو جاتے تھے ۔ ان سے اس عرصہ میں ٹیلی فون پر ہی باتیں ہوتی رہیں ۔ ان کے انتقال سے ایک دن پہلے فون کیا تو پتہ چلا کہ ملیریا بخار میں مبتلا ہیں اور آرام کررہے ہیں ۔ دوسرے دن صبح کو پروفیسر اختر الواسع کے فون کے ذریعے ان کے انتقال کی خبر ملی تو یقین نہیں آیا کہ 43 برس کی دوستی یوں

اچانک ختم ہو جائے گی۔ ایک اعلیٰ درجہ کے دانشور، معلم اور انسان کی حیثیت سے پروفیسر بشیر الدین احمد ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ وہ پکے حیدرآبادی تھے۔ اور ان کی شخصیت حیدرآبادی تہذیب کی بہترین روایات کی آئینہ دار تھی۔

(۲۲ / ستمبر ۱۹۹۶ء)

حسامی بک ڈپو کی چند معیاری کتابیں ایک نظر میں

شاعری

کتاب	مصنف
دیوان غالب	مرزا غالب
انتخاب کلام داغ	مرتبہ عرشی بدایونی
دیوان شجیع	ناصر کاظمی
جذبات شجیع	پرنس معظم جاہ شجیع
رقص مے	خمار بارہ بنکوی
غزل	مجروح سلطانپوری
○ کلیات ساحر	ساحر لدھیانوی
تلخیاں	ساحر لدھیانوی
رشک قمر	قمر جلالوی
اوج قمر	قمر جلالوی
روشنی اے روشنی	شکیب جلالی
دست فرہاد و ورق انتخاب	شاذ تمکنت
خدا جھوٹ نہ بلوائے	داد اورنگ آبادی
مطرب	قتیل شفائی
آموختہ	قتیل شفائی
جاناں جاناں	احمد فراز
بے آواز گلی کوچوں میں	احمد فراز
تنہا تنہا	احمد فراز
نابینا شہر میں آئینہ	احمد فراز
پس انداز موسم	احمد فراز
خواب گل پریشاں ہے	احمد فراز
چارہ درد	عبدالحمید عدم
زخم آہو	عبدالحمید عدم
سرو سمن	عبدالحمید عدم
نگارخانہ	عبدالحمید عدم
امیج	بشیر بدر
آمد	بشیر بدر
آسمان	بشیر بدر
آس	بشیر بدر
خوشبو	عباس دانا
○ خود کلامی	پروین شاکر
○ انکار	پروین شاکر
خوشبو	پروین شاکر
صد برگ	پروین شاکر
ماہ تمام (کلیات)	پروین شاکر
عشق	سعید شہیدی
چشم غزال	خواجہ شوق
گلزار صفی	صفی اورنگ آبادی
کوزے کا بن	سلیمان خطیب
انگور کھٹے ہیں	فاضل عادل آبادی
○ سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری
لوح محفوظ	سیماب اکبرآبادی
شب تاب	خمار بارہ بنکوی

طنز و مزاح

کتاب	مصنف
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین
سو ہے وہ بھی آدمی	مجتبیٰ حسین
الغرض	مجتبیٰ حسین
بہر حال	مجتبیٰ حسین
بالآخر	مجتبیٰ حسین
تکلف بر طرف	مجتبیٰ حسین
جاپان چلو جاپان چلو	مجتبیٰ حسین
قطع کلام	مجتبیٰ حسین
قصہ مختصر	مجتبیٰ حسین
○ سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسین
پتے کی بات	ابراہیم جلیس
اپنی تیجم	ابراہیم جلیس
پہلی بیگم	شوکت تھانوی
ہم زلف	شوکت تھانوی
بیوی بچہ	شوکت تھانوی
جھٹکے	شوکت تھانوی
تحریر ارشاد	شوکت تھانوی
کسی	شوکت تھانوی
چراغ تلے	مشتاق احمد یوسفی
خاکم بدہن	مشتاق احمد یوسفی
زرگزشت	مشتاق احمد یوسفی
آب گم	مشتاق احمد یوسفی
بجنگ آمد	کرنل محمد خاں
○ بزم آرائیاں	کرنل محمد خاں
○ بسلامت روی	کرنل محمد خاں
ذرا مسکرا دو	ڈاکٹر آر۔ قریشی
ہوائی کو تھیس	نریندر لوتھر
سارے جہاں کا درد	دلیپ سنگھ
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	ابن انشاء

تاریخ، تذکرہ و سوانح

کتاب	مصنف
ذکر یار چلے	مرزا ظفر الحسن
عمر گزشتہ کی کتاب	مرزا ظفر الحسن
حیدرآباد جو کبھی تھا (ترجمہ)	رئیس احمد جعفری
دکن اداس ہے یارو	رئیس احمد جعفری
وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے	رئیس احمد جعفری
دربار در بار	صدق جائسی
آسمان جاہ کا حیدرآباد	رحمن راز
مضامین اقبال	تصدق حسین تاج
لبیک	ممتاز مفتی
آواز دوست	مختار مسعود
○ سفر نصیب	مختار مسعود
○ شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب
○ شہر نگاراں	سبط حسن
رموز خطابت	نذیر الدین احمد
شب گردی خسرو محمد	عبدالقادر خاں خسرو

ناول

کتاب	مصنف
عالم پناہ	رفیعہ منظور الامین
پے انگ گیسٹ	بشریٰ رحمن